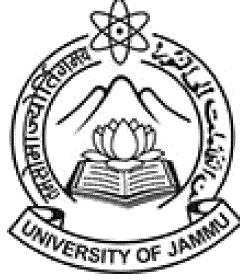


مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، یونیورسٹی آف جموں، جموں



کلاس ایم۔ اے
سمسٹر اول

یونٹ : I-IV

سبق : 1-20

مضمون : اُردو غزل

کورس نمبر : 103

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ اسٹنٹ پروفیسر
انچارج ٹیچر، اردو
سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک
کورس کوآرڈینیٹر، ایم اے اردو، سی، ڈی، او، ای
صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

زیر اہتمام مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، یونیورسٹی آف جموں، جموں

مضمون نگار:

1- ڈاکٹر فرحت شمیم

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی

2- ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ اسٹنٹ پروفیسر

اسٹنٹ پروفیسر سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔

اڈٹنگ / پروف ریڈنگ:-

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

انچارج ٹیچر، اردو، سی، ڈی، او، ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔

نظر ثانی:

ڈاکٹر فرحت شمیم

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جموں یونیورسٹی

Course Contributors and Content Editing:**1. Dr. Farhat Shamim**

Associate Professor,
Department of Urdu, University of Jammu

2. Dr. Parshotam Paul Singh

Assistant Professor in Urdu.
CDOE, Jammu

Content Editing:**Dr. Parshotam Paul Singh**

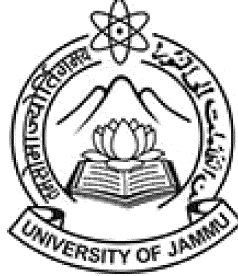
Assistant Professor in Urdu. CDOE, Jammu
CDOE, University of Jammu, Jammu 2025

© Centre for Distance & online Education, University of Jammu, 2026

- * All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the CDOE, University of Jammu.
- * The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the CDOE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By : Classic Printers/ 2026/50

**CENTRE FOR DISTANCE & ONLINE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU**



**SELF LEARNING MATERIAL
FOR
M.A. URDU
SEMESTER - I
SESSION - 2025 ON WARDS**

SUBJECT: URDU GHAZAL
COURSE CODE URD - 103

UNIT I-IV
LESSON: 20

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK
COORDINATOR P.G. URDU

DR. PARSHOTAM PAUL SINGH
TEACHER INCHARGE

<http://www.distanceeducationju.in>

*Printed and published on behalf of the centre for Distance & Online Education, University of Jammu
by the Director, CDOE, University of Jammu.*

M.A. URDU SEMESTER - I COURSE NO. 103

استقبالیہ پیغام



عزیز متعلم!

سمسٹر اول کے کورس "اردو غزل" میں آپ کا خیر مقدم ہے۔

یہ کورس اردو شاعری کی مقبول ترین اور مؤثر ترین صنف غزل کے مطالعے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے آپ غزل کی تعریف، آغاز و ارتقاء، فنی و فکری خصوصیات، ہیئت، اسلوب، موضوعات اور مختلف ادوار میں اس کی ترقی سے واقف ہوں گے۔ اس کے علاوہ آپ میر تقی میر، مرزا غالب، مومن، ذوق، اقبال، فراق، فیض، ناصر کاظمی، احمد فراز اور دیگر اہم غزل گو شعرا کے منتخب کلام اور ان کے فنی و فکری امتیازات کا بھی مطالعہ کریں گے۔ یہ کورس نہ صرف غزل کی ادبی روایت اور جمالیاتی قدروں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا بلکہ آپ میں تنقیدی شعور، ادبی ذوق اور شعری متن کے تجزیے کی صلاحیت بھی پیدا کرے گا۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا بغور مطالعہ کر کے آپ اردو غزل کی روایت، فنی نزاکتوں اور عصری معنویت کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔ مزید معلومات اور بہتر تفہیم کے لیے متعلقہ حوالہ جاتی کتب کے ساتھ ساتھ کتب خانے میں موجود متعلقہ کتب سے بھی استفادہ کریں۔

آپ کی علمی ترقی اور کامیابی کے لیے نیک خواہشات۔

ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

جموں یونیورسٹی، جموں

**Syllabus and Courses of Study in the Subject of Urdu under
NON-CBCS Scheme (CDOE)**

SEMESTER- I

COURSE CODE URD-103

Examination to be held in December 2025, 2026 and 2027

Title : Urdu Ghazal

اردو غزل

Credits:4

Duration of Examination: 2:30 hours

Maximum Marks : 100

a) Semester Exam: 70

(b) Internal Assessment 30

Objectives:

The course envisages to enable the students to have a full programme of the rise and development of Urdu Ghazal. Since it is a gigantic genre and has in its fold a rich hierarchy of literacy giants, therefore, efforts shall be made to acquaint the students with whole process of its emanation and development. The unit-wise details of the syllabus as under:-

Unit-I

- ۱۔ غزل کی تعریف اور فن
- ۲۔ اردو غزل پر فارسی کے اثرات
- ۳۔ اردو غزل۔ آغاز و ارتقاء

Unit-II

- ۱۔ غزل کا ابتدائی دور
- ۲۔ شمالی ہند میں اردو غزل کی ابتداء
- ۳۔ جدید اردو غزل۔ حالی سے حسرت موہانی تک
- ۴۔ ترقی پسند تحریک اور جدید اردو غزل

Unit-III

غزلیات

قلی قطب شاہ

- ۱۔ پیابانج پیالہ پیاجائے نا
- ۲۔ صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا
- ۳۔ تمہارے مکھ کے گہرتے سو نور پایا بہشت
- ۴۔ پیاری بھنواں ہیں تیریاں جوں کہ چند

ولی دکنی

- ۱۔ کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
- ۲۔ جسے عشق کا تیرکاری لگے
- ۳۔ عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
- ۴۔ تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا

میر درد

- ۱۔ ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے۔
- ۲۔ جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہو گا۔
- ۳۔ تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے۔
- ۴۔ اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں

میر تقی میر

- ۱۔ ہستی اپنی حباب کی سی ہے
- ۲۔ غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا۔
- ۳۔ عشق میں، بے خوف و خطر چاہیئے
- ۴۔ اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا

سودا

- ۱۔ مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا

۲۔ ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

۳۔ دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا

۴۔ قاصدا شک آ کے خبر کر گیا

آتش

۱۔ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟

۲۔ تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں۔

۳۔ یہ آرزو تھی تجھے گل کے رُوبہ رُو کرتے

۴۔ حباب آسائیں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا

ناخ

۱۔ مرا سینہ ہے مشرقِ آفتاب داغِ ہجراں کا

۲۔ کوئی غارت گر نہیں، دیوانوں کے اسباب کا

۳۔ جب سے کہ بُتوں سے آشنا ہوں

۴۔ دل میں پوشیدہ تپِ عشق بُناں رکھتے ہیں

غالب

۱۔ نقشِ فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا۔

۲۔ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک۔

۳۔ بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔

۴۔ ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا

حکیم مومن خان مومن

۱۔ اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا۔

۲۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا۔

۳۔ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

۴۔ اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ

Unit-IV

حسرت موہانی

- ۱۔ دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا۔
- ۲۔ حُسن بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کر دیا
- ۳۔ نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
- ۴۔ چُپکے چُپکے رات دن آنسو بہا نایا دہے

جگر مراد آبادی

- ۱۔ دل کو سکون، روح کو آرام کر گیا
- ۲۔ کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ گل و خار پر
- ۳۔ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
- ۴۔ محبت کی محبت تک ہی جو دُنیا سمجھتے ہیں

فراق گورکھپوری

- ۱۔ نگاہ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا۔
- ۲۔ کسی کایوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی۔
- ۳۔ سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
- ۴۔ رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی

شہریار

- ۱۔ ماحول میرے شہر کا ہاں پُر سکون نہ تھا
- ۲۔ کیسا ماضی تھا کیا ہے حال اپنا
- ۳۔ نہیں ہے مجھ سے تعلق کوئی تو ایسا کیوں

ندا فاضلی

- ۱۔ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
- ۲۔ سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو

۳۔ جب سے قریب ہو کے چلے زندگی سے ہم
۴۔ گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاو گے

Internal Assessment carry 30% marks in each course. The format of the Internal Assessment Assignments is given below: ASSIGNMENT 1: Long Answer Questions

Two questions: one each from Unit I and Unit II shall be given. And the learner has to attempt any one question in 800-1000 words.

(15 marks)

Assignment 2: Short Answer Questions

Three questions: one each from Unit III, Unit IV and unit V shall be given. And the learner has to attempt any two questions one from unit III, Unit IV and one from unit V in 350-450 words.

(7.5x2=15)

Mode Of Examination:-

There are four units in the course No:-103

Mode of the examination:-The term end examination shall carry 70% marks in each course the format of the question paper is given below.

Term End Examination would be of 70 marks. Two short type questions from Unit I and II having 7 marks each be asked. Two descriptive type questions from Unit III and IV of 14 marks each be asked. Two short type questions from Unit III and IV having 7 marks each be asked. 14 objectives type questions of 14 marks carrying 1 mark each be also asked from Unit III and IV.

امدادی کتب Books Prescribed

- ۱۔ منتخب غزلیں۔ پانچواں ایڈیشن ۲۰۰۲ء۔ مرتبہ اترپردیش اکیڈمی لکھنؤ
- ۲۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ (تیسری طباعت۔ ۲۰۱۳ء۔ مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔
- ۳۔ کلاسیکی اور جدید شعراء کی منتخب غزلیں۔ ڈاکٹر فرحت شمیم۔ قاسمی کتب خانہ جموں
- ۴۔ انتخاب کلیات میر۔ میر تقی میر۔ ایڈیشن ۲۰۱۱ء۔ ناشر۔ الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ۔ دریا گنج نئی دہلی۔

- ۵۔ دیوانِ درد۔ مرتبہ فاروق ارگلی، ناشر فرید بکڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی
- ۶۔ کلیاتِ سودا۔ جلد اول۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ ناشر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
- ۷۔ دیوانِ غالب۔ اسد اللہ خان غالب۔ فروری ۱۹۸۶ء۔ ناشر غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی
- ۸۔ انتخابِ سخن۔ مرتبہ ڈاکٹر ابن کنول۔ کتب دُنیا دہلی
- ۹۔ کلیاتِ حسرت موہانی۔ مرتبہ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی
- ۱۰۔ نسخہ ہائے وفا۔ کلیاتِ فیض۔ سن اشاعت ۲۰۱۲ء۔ ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
- ۱۱۔ کلیاتِ مخدوم محی الدین، ایڈیشن ۲۰۰۷ء۔ مرتبہ فاروق ارگلی، ناشر فریدیہ بکڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دہلی
- ۱۲۔ کلیاتِ ناصر۔ ناصر کاظمی۔ اشاعتِ خاص۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء۔ جہانگیر بکڈپو، اردو بازار لاہور
- ۱۳۔ کلیاتِ نذافت علی

- ۱۴۔ اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خان
- ۱۵۔ اردو کی عشقیہ شاعری فراق گور کھپوری
- ۱۶۔ نقدِ میر ڈاکٹر سید عبداللہ
- ۱۷۔ غالب نامہ شیخ اکرام
- ۱۸۔ محاسن کلام غالب۔ عبدالرحمن بجنوری
- ۱۹۔ فراق گھور کھپوری مرتبہ کامل قریشی
- ۲۰۔ جدید غزل رشید احمد صدیقی
- ۲۱۔ فن اور شخصیت۔ غزل نمبر۔ نند کشور وکرم
- ۲۲۔ اکیسویں صدی میں اردو شعریات۔ پروفیسر قدوس جاوید
- ۲۳۔ اردو غزل، فن اور فنکار۔ (اردو غزل کا نیا انتخاب)۔ ڈاکٹر فرحت شمیم

فہرست

- سبق نمبر ۱۔ غزل کی تعریف اور فن
سبق نمبر ۲۔ اُردو غزل پر فارسی کے اثرات
سبق نمبر ۳۔ اُردو غزل۔ آغاز و ارتقاء
سبق نمبر ۴۔ غزل کا ابتدائی دور
سبق نمبر ۵۔ شمالی ہند میں اُردو غزل کی ابتداء
سبق نمبر ۶۔ جدید اُردو غزل۔ حالی سے حسرت موہانی تک
سبق نمبر ۷۔ ترقی پسند تحریک اور جدید اُردو غزل
سبق نمبر ۸۔ قلی قطب شاہ
سبق نمبر ۹۔ ولی محمد دکنی
سبق نمبر ۱۰۔ میر تقی میر
سبق نمبر ۱۱۔ میر درد
سبق نمبر ۱۲۔ مرزا محمد رفیع سودا
سبق نمبر ۱۳۔ مرزا اسد اللہ خان غالب
سبق نمبر ۱۴۔ حکیم مومن خان مومن
سبق نمبر ۱۵۔ خواجہ حیدر علی آتش
سبق نمبر ۱۶۔ امام بخش ناسخ
سبق نمبر ۱۷۔ حسرت موہانی
سبق نمبر ۱۸۔ جگر مراد آبادی
سبق نمبر ۱۹۔ فراق گور کھپوری
سبق نمبر ۲۰۔ شہر یار

سبق نمبر ۱۔ غزل: تعریف اور فن

ساخت

1.0 اغراض و مقاصد

1.1 تعارف

1.2 غزل کی تعریف اور فن

1.2.0 غزل کی ہیئت

1.2.1 غزل کے بنیادی فنی اجزاء

1.2.2 غزل کی علامت نگاری اور استعاراتی نظام

1.2.3 غزل اور موسیقیت

1.2.4 سرگرمی (آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں)

1.3 عمومی جائزہ

1.4 آپ نے کیا سیکھا؟

1.5 فرہنگ

1.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1.7 مشقی سوالات

1.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1.8 جوابات سرگرمی

1.9 امدادی کتب

1.0 اغراض و مقاصد

غزل کے فن اور اس کے تاریخی و فکری پس منظر کے مطالعے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو غزل کی ماہیت، اس کی فنی ساخت اور اسالیب اظہار سے گہری آگہی حاصل ہو۔ اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ غزل محض عشقیہ شاعری کی صنف نہیں بلکہ انسانی تجربے، احساس، فکر اور جمالیاتی شعور کا ایک جامع اور لطیف اظہار ہے۔ غزل کی تعریف اور اس کے بنیادی اجزاء جیسے مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف، بحر اور زمین کو سمجھنا اس سبق کا اولین ہدف ہے تاکہ طلبہ صنفِ غزل کی فنی شناخت سے باخبر ہو سکیں۔

اس سبق کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو اردو غزل پر فارسی شاعری کے اثرات سے روشناس کرایا جائے۔ اس ضمن میں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ فارسی روایت نے اردو غزل کے موضوعات، علامات، استعارات، طرزِ بیان اور فکری جہات کو کس طرح متاثر کیا۔ اس مطالعے سے طلبہ زبانوں اور ادبی روایتوں کے باہمی ربط کو سمجھتے ہیں اور یہ ادراک حاصل کرتے ہیں کہ اردو غزل کی تشکیل ایک وسیع تہذیبی و لسانی تعامل کا نتیجہ ہے۔ اردو غزل کے آغاز و ارتقا کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ غزل کے تاریخی سفر، مختلف ادوار اور نمائندہ شعراء کے فنی و فکری امتیازات کو سمجھ سکیں۔ اس سے ان میں ادبی تاریخ کا شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ مختلف ادوار کی غزل کے موضوعاتی اور اسلوبی فرق کو پہچاننے کے قابل ہوتے ہیں۔ مزید برآں اس سبق کا مقصد طلبہ میں شعری ذوق، تنقیدی بصیرت اور فنی تجربے کی صلاحیت کو فروغ دینا ہے تاکہ وہ غزل کے اشعار کی تشریح، فنی محاسن کی نشاندہی اور اسلوبی خوبیوں کا ادراک کر سکیں۔ عملی مثالوں کے ذریعے ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ غزل کو صرف پڑھیں ہی نہیں بلکہ سمجھیں، پرکھیں اور اس کے جمالیاتی لطف کو شعوری طور پر محسوس کریں۔ مجموعی طور پر اس سبق کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ طلبہ غزل کی فنی و تاریخی بنیادوں سے واقف ہوں، اس کے تہذیبی پس منظر کو سمجھیں، اور عملی طور پر غزل کے مطالعے، تشریح اور تنقیدی جائزے کی مہارت حاصل کریں۔

1.1 تعارف

اردو شاعری کی مقبول اور مؤثر ترین اصناف میں غزل کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ غزل اپنی لطافتِ بیان، موسیقیت، علامتی نظام اور فکری گہرائی کے باعث صدیوں سے اہل ذوق کو متاثر کرتی آئی ہے۔ یہ صنف نہ صرف عشق و محبت کے جذبات کی ترجمان ہے بلکہ انسانی تجربے، داخلی کرب، سماجی شعور اور روحانی احساسات کو بھی نہایت خوبصورتی سے اپنے دامن میں سمو لیتی ہے۔ اس سبق میں غزل کی تعریف، اس کی فنی ساخت اور بنیادی اجزاء کو واضح کیا جائے گا، ساتھ ہی اردو غزل پر فارسی روایت کے اثرات اور اس کے تاریخی آغاز و ارتقا کا جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔ اس مطالعے کے ذریعے طلبہ کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ غزل ایک زندہ اور متحرک ادبی روایت ہے جو مختلف ادوار میں نئے معانی اور نئے اسالیب کے ساتھ ترقی کرتی رہی ہے۔

یہ سبق غزل کے فنی شعور کو بیدار کرنے، ادبی ذوق کو جلا دینے اور تنقیدی مطالعے کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے تاکہ طلبہ غزل کو محض پڑھیں نہیں بلکہ اس کے حسن فن کو سمجھ کر محسوس بھی کر سکیں۔

1.2 غزل کی تعریف اور فن

اردو شاعری کی مختلف اصناف میں غزل کو جو مقبولیت، وسعت اور دوام حاصل ہوا ہے، وہ کسی اور صنف کے حصے میں کم ہی آیا ہے۔ ادبی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کئی شعری ہیئتیں وقت کے ساتھ کمزور پڑ گئیں یا عملی طور پر متروک ہو گئیں، لیکن غزل نے ہر دور میں نہ صرف اپنی موجودگی برقرار رکھی بلکہ نئے فکری اور فنی امکانات کو بھی اپنے اندر جذب کیا۔ یہی سبب ہے کہ غزل کو اردو شاعری کی نمائندہ صنف کہا جاتا ہے۔ غزل انسانی دل کی آواز ہے۔ اس میں جذبہ، فکر، تجربہ اور جمالیات اس طرح یکجا ہوتے ہیں کہ شعر محض لفظوں کا مجموعہ نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ احساس بن جاتا ہے۔ غزل کا رشتہ ہماری تہذیب، معاشرت، نفسیات اور روحانی مزاج سے گہرا ہے۔ اسی لیے متعدد ناقدین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو تہذیب اور غزل ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔

لفظ ”غزل“ عربی زبان سے ماخوذ ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی محبوب یا عورت سے گفتگو کرنے کے ہیں۔ قدیم عربی روایت میں یہ لفظ عاشقانہ مکالمے اور نرم جذباتی اظہار کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جب یہ لفظ فارسی اور پھر اردو میں منتقل ہوا تو اس کا مفہوم وسیع ہوتا گیا۔ اصطلاحی طور پر غزل ایسی منظوم صنف ہے جس میں انسانی دل کی کیفیات، عشق و محبت کے جذبات، ہجر و وصال کے تجربات، داخلی اضطراب، روحانی تڑپ، جمالیاتی مشاہدہ اور فکری واردات کو مخصوص شعری ہیئت میں بیان کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں غزل کا موضوع زیادہ تر عشق و معاشقہ تک محدود سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد کے ادوار میں اس نے زندگی کے تقریباً تمام اہم موضوعات کو اپنے دائرے میں شامل کر لیا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ آج غزل صرف رومان کی صنف نہیں بلکہ انسانی تجربے کی شاعری ہے۔

غزل اپنے ابتدائی دور میں زیادہ تر عشقیہ مضامین کی حامل تھی۔ محبوب کی تعریف، جدائی کا غم، وصل کی آرزو، بے وفائی کا شکوہ اور عاشق کی بے بسی اس کے مرکزی موضوعات شمار ہوتے تھے۔ اس دور کی غزل میں جذبے کی شدت، تخیل کی رنگینی اور حسن و عشق کی کیفیات کو علامتی اور استعاراتی پیرائے میں بیان کیا جاتا تھا۔ عشق مجازی کے پردے میں انسانی جذبات کی لطافت اور داخلی واردات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔

تاہم وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی، تہذیبی اور فکری تبدیلیوں نے غزل کے مزاج اور موضوعات کو بھی وسعت عطا کی۔ بعد کے ادوار میں غزل محض رومانوی اظہار تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں تصوف اور روحانی تجربہ، اخلاقی اقدار، انسانی باطن کی جستجو اور حقیقت کائنات پر غور و فکر جیسے مضامین بھی شامل ہو گئے۔ صوفی شعرا نے عشق کو ایک اعلیٰ روحانی تجربے کے طور پر پیش کیا، جہاں محبوب کا تصور مابعد الطبیعیاتی معنوں اختیار کر گیا۔

جدید دور میں غزل نے مزید وسعت اختیار کی اور سماجی ناہمواری، سیاسی جبر، تہذیبی زوال، اقداری بحران، شہری زندگی کی تنہائی، وجودی کرب، شناخت کا مسئلہ، ہجرت کا تجربہ اور جدید انسان کی داخلی شکست و ریخت بھی اس کے موضوعات بن گئے۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے اثرات نے غزل کو عصری شعور سے جوڑا اور شاعر نے اپنے عہد کے مسائل، اضطراب اور سوالات کو غزل کے پیکر میں ڈھالنا شروع کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ زبان و بیان، علامتوں اور اسالیب میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ روایتی استعاروں کے ساتھ نئے استعارے، نئی علامتیں اور نئے لہجے شامل ہوئے، جس سے غزل کی فنی اور معنوی دنیا مزید وسیع ہو گئی۔ یوں غزل نے اپنے آپ کو ایک محدود عشقیہ صنف سے نکال کر ایک ہمہ جہت، پکدار اور عہد شناس صنفِ سخن کے طور پر منوالیا جو ہر دور کے انسانی تجربے کو اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

غزل بنیادی طور پر داخلی شاعری کی صنف ہے۔ اس میں خارجی واقعات اور ظاہری منظر ناموں کے بجائے باطنی کیفیات، جذباتی واردات اور نفسیاتی تجربات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ شاعر اپنے دل، اپنے احساس، اپنی وارداتِ قلبی اور اپنے ذاتی تجربے کو محور بنا کر اظہار کرتا ہے۔ مگر غزل کا کمال یہ ہے کہ یہ شخصی اظہار اپنی صداقت اور شدت کے باعث اجتماعی تجربہ بن جاتا ہے۔ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اس کے اپنے دل کی بات کہہ رہا ہے۔ اسی اشتراکِ احساس کی وجہ سے غزل مختلف زمانوں اور طبقات کے لوگوں پر یکساں اثر ڈالتی ہے۔

غزل کی دنیا دراصل باطن کی دنیا ہے۔ جہاں جذبہ، خیال، یاد، خواب، حسرت، اضطراب اور امید مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس میں داخلی کشمکش، محبت کی پیچیدگیاں، روحانی جستجو، وجودی سوالات اور ذات کی تلاش کو نہایت لطیف اور جمالیاتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہی باطنی رنگ غزل کو دوسری شعری اصناف سے ممتاز بناتا ہے۔

غزل کی ایک نمایاں اور بنیادی خصوصیت کثافتِ معنی ہے، یعنی کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مفہوم ادا کرنا۔ غزل کا ہر شعر حجم کے اعتبار سے مختصر مگر معنی کے لحاظ سے وسیع اور تہہ دار ہوتا ہے۔ ایک کامیاب شعر اپنے اندر کئی سطحوں کے معنی رکھتا ہے ظاہری مفہوم، باطنی اشارہ، علامتی جہت اور فکری پہلو۔ اسی لیے اچھا شعر بار بار پڑھنے پر نئے مفہیم اور نئے زاویے آشکار کرتا ہے اور قاری ہر مطالعے میں ایک تازہ لطف محسوس کرتا ہے۔

اسی خصوصیت کے سبب غزل میں اشاریت، رمزیت اور ایجاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شاعر براہِ راست بیان کے بجائے اشارے، علامت، استعارے اور کنایے کے ذریعے بات کہتا ہے۔ اس طرزِ اظہار سے شعر میں معنوی گہرائی اور جمالیاتی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ ایجاز یعنی اختصار کے ساتھ جامعیت، غزل کے حسن کو دوچند کر دیتا ہے۔ چند لفظ پورا جہانِ معنی سمیٹ لیتے ہیں۔

مزید یہ کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اکائی بھی ہوتا ہے۔ یہ خود کفیل وحدت غزل کو فنی اعتبار سے منفرد بناتی ہے۔ ہر شعر الگ مفہوم اور کیفیت رکھ سکتا ہے، مگر پھر بھی پوری غزل ایک داخلی فضا اور جذباتی آہنگ کے ذریعے مربوط محسوس ہوتی ہے۔ یوں غزل اختصار، معنوی گہرائی، رمزیت اور داخلی سچائی کا حسین امتزاج بن کر سامنے آتی ہے۔

1.2.0 غزل کی ہیئت

ہیئتی اعتبار سے غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اور خود مختار معنوی اکائی کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے لازماً وابستہ ہو یہ ضروری نہیں۔ شاعر ایک ہی غزل میں مختلف تجربات، کیفیات اور خیالات کو جدا جدا اشعار میں سمو سکتا ہے۔ یہی خود مختاری شعر غزل کی فنی ساخت کا بنیادی وصف ہے اور اسی بنا پر غزل مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ جیسی اصناف سے ممتاز ہوتی ہے جہاں تسلسل خیال اور موضوعی ربط لازمی ہوتا ہے۔

غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل تاثر، ایک جداگانہ کیفیت اور ایک مستقل مفہوم رکھتا ہے۔ قاری کسی بھی شعر کو باقی اشعار سے الگ کر کے بھی سمجھ سکتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے غزل کے اشعار ضرب المثل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور گفتگو، تنقید اور روزمرہ اظہار میں بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ انفرادی قوت شعر غزل کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

غزل میں موضوعاتی آزادی بھی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ ایک ہی غزل میں عشق، تصوف، فلسفہ، سماجی شعور، طنز، داخلی کرب اور جمالیاتی احساس سب مختلف اشعار میں بیان ہو سکتے ہیں۔ اس تنوع سے غزل میں رنگارنگی اور وسعت پیدا ہوتی ہے اور شاعر کو اظہار کے متعدد زاویے میسر آتے ہیں۔ یوں غزل ایک محدود موضوع کی پابند نہیں رہتی بلکہ جذبے اور خیال کی آزاد پرواز کا میدان بن جاتی ہے۔

البتہ بعض شعرا نے مربوط یا مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں جن میں ایک مرکزی خیال، ایک کیفیت یا ایک علامتی فضا پوری غزل میں جاری رہتی ہے۔ ایسی غزلوں میں اشعار کے درمیان معنوی ربط نسبتاً مضبوط ہوتا ہے اور پوری غزل ایک وحدتِ تاثر پیدا کرتی ہے۔ جدید دور میں اس رجحان میں اضافہ بھی ہوا ہے، جہاں شاعر غزل کی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے نظم جیسا ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم یہ غزل کی لازمی شرط نہیں بلکہ ایک فنی اختیار (creative choice) ہے۔

مزید یہ کہ غزل کی ہیئت میں ردیف، قافیہ، بحر اور زمین کی پابندیاں بھی اسے ایک منضبط فنی ڈھانچہ عطا کرتی ہیں۔ اس منضبط ہیئت کے اندر معنوی آزادی اور موضوعاتی تنوع کا امتزاج غزل کو ایک ایسی صنف بناتا ہے جس میں نظم و ضبط اور آزادی اظہار دونوں بیک وقت جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی توازن غزل کے فنی حسن اور پائیداری کی بنیاد ہے۔

1.2.1 غزل کے بنیادی فنی اجزاء

مطلع

غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور عموماً ہم ردیف بھی ہوتے ہیں۔ مطلع ہی سے غزل کے قافیہ و ردیف اور صوتی آہنگ کا تعین ہو جاتا ہے، اسی لیے اسے غزل کے فنی نظام کی بنیاد کہا جاتا ہے۔ بعض غزلوں میں ایک سے زیادہ مطلع بھی ہوتے ہیں جنہیں مطلعِ ثانی کہا جاتا ہے۔ مطلع قاری یا سامع کو غزل کے آہنگ اور فضا میں داخل کرتا ہے اور آغاز ہی میں فنی ڈھانچے کو واضح کر دیتا ہے۔

قافیہ

قافیہ وہ ہم آواز الفاظ ہوتے ہیں جو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں ردیف سے پہلے آتے ہیں، یا اگر ردیف نہ ہو تو آخر ہی میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر: دل، محفل، ساحل یہ صوتی ہم آہنگی قافیہ کہلاتی ہے۔ قافیہ غزل میں صوتی ربط، نغمگی اور تکراری حسن پیدا کرتا ہے۔ یہ غزل کا لازمی جز ہے؛ قافیہ کے بغیر غزل کی ہیئت قائم نہیں رہتی۔ قافیہ کی درست ادائیگی فنی مہارت کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ معمولی صوتی فرق بھی قافیہ کو توڑ دیتا ہے۔

ردیف

ردیف وہ لفظ یا فقرہ ہے جو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں بعینہ دہرایا جاتا ہے۔ ردیف غزل میں نغمگی، زور بیان، یادگیری (memorability) اور جمالیاتی تاثر کو بڑھاتی ہے۔ غزل میں ردیف ہو وہ عموماً زیادہ موسیقیت اور تاثیر کی حامل ہوتی ہے۔ ردیف شاعر کے لیے فنی چیلنج بھی ہوتی ہے کیونکہ ہر شعر میں اسی لفظی تکرار کے ساتھ نیا مفہوم پیدا کرنا ہوتا ہے۔

مقطع

غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔ اس میں عموماً شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ تخلص کے استعمال سے شعر میں شخصی شناخت، خود کلامی یا خطابہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مقطع اکثر فنی چابک دستی کا مظہر ہوتا ہے جہاں شاعر اپنے نام کو معنی خیز انداز میں شعر کا حصہ بناتا ہے۔ بعض اوقات مقطع پورے کلام کا نچوڑ یا یادگار تاثر بھی پیش کرتا ہے، اسی لیے اسے تکمیلی حسن حاصل ہوتا ہے۔

بحر

بحر شعری وزن اور آہنگ کا نظام ہے۔ ہر غزل کسی مخصوص بحر میں کہی جاتی ہے اور غزل کے تمام اشعار اسی بحر کے مطابق ہوتے ہیں۔ بحر دراصل ارکان (وزنی ٹکڑوں) پر مشتمل ہوتی ہے جن کی ترتیب سے وزن قائم رہتا ہے۔ بحر غزل کی موسیقیت، روانی اور ترنم کی بنیاد ہے۔ مختلف بحریں مختلف آہنگ اور تاثر رکھتی ہیں۔ کچھ بحریں نرم اور مترنم ہوتی ہیں، کچھ پُر جلال اور پُر زور۔ ماہر شاعر بحر کے انتخاب سے ہی شعر کی کیفیت اور تاثر کو مضبوط بنا دیتا ہے۔

ان تمام فنی اجزاء مطلع، قافیہ، ردیف، مقطع اور بحر کے باہمی امتزاج سے غزل کا ہیئت اور صوتی حسن تشکیل پاتا ہے۔ یہی منضبط فنی ڈھانچہ غزل کو ایک باقاعدہ، مربوط اور پہچان رکھنے والی صنفِ سخن بناتا ہے، جس میں اظہار کی آزادی بھی ہے اور فنی نظم و ضبط بھی۔

1.2.2 غزل کی علامت نگاری اور استعاراتی نظام

غزل کی شعری روایت میں علامت نگاری اور استعاراتی نظام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ غزل براہِ راست اور سادہ بیانیہ اظہار کی بجائے اشاروں، کنایوں، علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اپنے معنی قاری تک منتقل کرتی ہے۔ یہی بالواسطہ طرزِ اظہار غزل کے حسن، گہرائی اور اثر آفرینی کا

سرچشمہ ہے۔ غزل کا شاعر چند لفظوں میں ایک وسیع تجربہ، پیچیدہ جذبہ اور تہہ دار مفہوم سمودیتا ہے، اور یہ کام زیادہ تر علامتی اور استعاراتی نظام کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

غزل میں علامت دراصل ایک ایسا لفظ، پیکر یا شبیہ ہوتی ہے جو اپنے ظاہری معنی سے آگے بڑھ کر وسیع تر مفہوم کی نمائندگی کرتی ہے۔ مثلاً شمع محض روشنی کا ذریعہ نہیں رہتی بلکہ عشق، قربانی اور فنا کی علامت بن جاتی ہے؛ پروانہ صرف ایک کیڑا نہیں بلکہ عاشق صادق کا استعارہ بن جاتا ہے؛ صحرانہائی، جستجو اور روحانی سفر کی علامت بنتا ہے؛ زنجیر پابندی، جبر یا اسارت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس طرح غزل کی زبان ایک علامتی زبان بن جاتی ہے جس میں ہر شے اپنے ظاہر سے زیادہ اپنے باطن میں معنی رکھتی ہے۔

استعارہ غزل کے اظہار کا نہایت طاقتور وسیلہ ہے۔ استعارے میں ایک شے کو دوسری شے قرار دے کر معنی میں شدت اور جمال پیدا کیا جاتا ہے۔ غزل میں محبوب کو چاند، گل، آفتاب، بت، صنم، جادوگر کہنا محض تعریف نہیں بلکہ ایک مکمل جمالیاتی تصور قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح عاشق کو خاک، دیوانہ، اسیر، مجروح، مسافر کہنا اس کی کیفیت عشق کو تصویری صورت میں پیش کرتا ہے۔ استعارہ جذبے کو تصور اور تصور کو پیکر عطا کرتا ہے۔

غزل کے استعاراتی نظام کی ایک بڑی خصوصیت اس کی روایتی علامتی کائنات ہے۔ کلاسیکی اردو غزل نے فارسی شعریات سے ایک وسیع علامتی ذخیرہ ورثے میں پایا جیسے گل و بلبل، شمع و پروانہ، میخانہ، ساقی، شراب، بت، خانقاہ، صحراء، قفس، صیاد وغیرہ۔ ان علامتوں کا ایک تہذیبی اور ادبی پس منظر ہے، جسے جانے بغیر غزل کے مکمل مفہوم تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا مطالعہ علامتی شعور کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ تصوف نے بھی غزل کی علامت نگاری کو گہرا اثر دیا ہے۔ صوفیانہ غزل میں شراب معرفت بن جاتی ہے، ساقی مرشد یا حق کا فیض دینے والی ہستی کا استعارہ بن جاتا ہے، میخانہ روحانی مرکز کی علامت ہوتا ہے، اور مستی وجدانی کیفیت کا نام بن جاتی ہے۔ اسی طرح وصال حق سے اتحاد اور ہجر روحانی دوری کا استعارہ بن جاتا ہے۔ یوں ایک ہی علامت مجازی اور حقیقی دونوں سطحوں پر معنی دے سکتی ہے اور knowing reader دونوں جہتوں کو بیک وقت سمجھتا ہے۔

غزل کی علامت نگاری کی ایک اور اہم خوبی اس کی کثیر المعنویت ہے۔ ایک ہی علامت مختلف شعرا کے ہاں مختلف مفاہیم اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر شہر کبھی تہذیب کی علامت ہے، کبھی بے حسی کی، کبھی ہجوم میں تنہائی کی۔ آئینہ کبھی خود آگہی ہے، کبھی احتساب، کبھی محبوب کا چہرہ، کبھی باطن کی سچائی۔ اس کثیر المعنوی نظام کی وجہ سے غزل ہر عہد میں نئے معنی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جدید غزل میں علامتوں اور استعاروں کا دائرہ مزید وسیع ہوا ہے۔ صنعتی اور شہری زندگی، سیاسی حالات، نفسیاتی الجھنوں اور وجودی سوالات نے نئی علامتوں کو جنم دیا جیسے دیوار، مشین، دھواں، ہجوم، آکسولیشن، کھڑکی، سایہ، چہرہ، ماسک وغیرہ۔ ترقی پسند اور جدید شعرا نے روایتی علامتوں کو نئے معنی بھی دیے اور نئی علامتیں بھی وضع کیں۔ اس طرح غزل کا استعاراتی نظام جامد نہیں بلکہ ارتقا پذیر رہا ہے۔

علامت نگاری کا ایک اہم فنی فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ شعر کو آفاقی بنادیتی ہے۔ براہ راست بیان کسی خاص واقعے یا حالت تک محدود رہ سکتا ہے، مگر علامتی بیان مختلف حالات پر منطبق ہو سکتا ہے۔ قاری اپنی کیفیت کے مطابق معنی اخذ کرتا ہے، یوں شعر شخصی ہونے کے باوجود اجتماعی تجربہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے شعرا کے اشعار زمان و مکان کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں۔

غزل میں اشاریت اور استعاراتی نظام قاری کی تخلیقی شرکت کو بھی متحرک کرتا ہے۔ شعر مکمل معنی کھول کر نہیں دیتا بلکہ قاری کو دعوت دیتا ہے کہ وہ معنی کی تشکیل میں حصہ لے۔ یہ فنی حکمت عملی غزل کو محض بیان نہیں بلکہ مکالمہ بنادیتی ہے۔ شاعر اور قاری کے درمیان ایک خاموش مگر بامعنی مکالمہ۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ غزل کی علامت نگاری اور استعاراتی نظام اس کی فنی روح ہیں۔ یہی عناصر غزل کو گہرائی، تہہ داری، جمالیاتی حسن اور معنوی وسعت عطا کرتے ہیں۔ غزل کی اصل تاثیر اسی وقت پوری طرح سامنے آتی ہے جب اسے علامتی شعور اور استعاراتی فہم کے ساتھ پڑھا جائے، کیونکہ غزل اکثر وہی کچھ کہتی ہے جو بظاہر کہتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

1.2.3 غزل اور موسیقیت

غزل کا تعلق موسیقیت سے نہایت گہرا اور فطری ہے۔ اس صنف کی ہیئت ہی اس طرح مرتب ہوئی ہے کہ اس میں صوتی آہنگ، ردھم اور ترنم خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ بحر، قافیہ اور ردیف مل کر ایک ایسا منظم صوتی نظام تشکیل دیتے ہیں جو کلام کو محض پڑھنے کے بجائے گنگنانے کے قریب لے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل ابتدا ہی سے سماعتی لطف کی حامل رہی ہے اور سننے والے پر فوری اثر ڈالتی ہے۔

بحر غزل کے وزنی ڈھانچے کو قائم رکھتی ہے اور اشعار میں ردھم پیدا کرتی ہے۔ قافیہ ہم صوت الفاظ کی تکرار کے ذریعے ایک صوتی ربط پیدا کرتا ہے، جبکہ ردیف لفظی تکرار کے ذریعے نغمگی، زور بیان اور یاد گیری کو بڑھاتی ہے۔ جب یہ تینوں عناصر باہم ملتے ہیں تو شعر میں ایک باقاعدہ صوتی لہر (sound pattern) پیدا ہوتی ہے جو سامع کے ذہن پر دیر پا نقش چھوڑتی ہے۔ یوں غزل صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی حسن کی بھی حامل ہوتی ہے۔

غزل کی موسیقیت کا تعلق صرف وزن اور قافیہ تک محدود نہیں بلکہ لفظوں کے انتخاب، صوتی آہنگ، حروف کی ترتیب اور داخلی ترنم سے بھی ہے۔ اچھا شاعر ایسے الفاظ اور تراکیب کا انتخاب کرتا ہے جن میں صوتی نرمی، بہاؤ اور ہم آہنگی ہو۔ نرم حروف، متوازن جملے اور صوتی تکرار شعر میں ایک اندرونی لہر پیدا کرتے ہیں جسے داخلی موسیقیت کہا جاتا ہے۔ اس داخلی آہنگ کے بغیر شعر فنی طور پر درست ہونے کے باوجود خشک محسوس ہو سکتا ہے۔

اسی صوتی اور ترنمی خصوصیت کے باعث غزل گانگنی ایک مستقل فن کے طور پر فروغ پائی۔ برصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں غزل کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ جب شعر آواز، لے اور ساز کے ساتھ پیش ہوتا ہے تو اس کی جذباتی تاثیر کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، وقفہ، کھنچاؤ اور تکرار شعر کے معنی کو نمایاں کرتے ہیں اور سامع پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ یوں لفظ اور نغمہ مل کر ایک مشترکہ جمالیاتی تجربہ پیدا کرتے ہیں۔

غزل کی موسیقیت اسے مجلس، مشاعرہ اور محفل کی صنف بھی بناتی ہے۔ مشاعروں میں غزل کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہی صوتی حسن ہے۔ ترنم سے پڑھا گیا شعر فوری طور پر سامعین کے دل میں اتر جاتا ہے۔ بعض اشعار صرف اپنی نغمگی اور صوتی حسن کے باعث زبان زد عام ہو جاتے ہیں، چاہے سامع ان کے تمام معنوی پہلوؤں سے پوری طرح واقف نہ بھی ہو۔ مزید یہ کہ غزل کی نغمگی اسے عوامی سطح پر بھی مقبول بناتی ہے۔ موسیقی کے ذریعے غزل خواص سے نکل کر عوام تک پہنچتی ہے۔ ریڈیو، اسٹیج، فلم اور جدید میڈیا نے بھی غزل کی ترسیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس عوامی قبولیت نے غزل کو دوام اور وسعت عطا کی ہے اور اسے بدلتے زمانوں میں بھی زندہ رکھا ہے۔

مجموعی طور پر غزل کی موسیقیت اس کی فنی شناخت کا بنیادی جز ہے۔ معنی اور آہنگ، فکر اور ترنم، لفظ اور نغمہ ان سب کا حسین امتزاج غزل کو ایک ایسی صنفِ سخن بناتا ہے جو نہ صرف پڑھی جاتی ہے بلکہ سنی اور محسوس بھی کی جاتی ہے۔ یہی صوتی جمال غزل کے اثر اور مقبولیت کا ایک بڑا راز ہے۔

1.2.4 سرگرمی (آپنی معلومات کو جانچیں)

عزیر طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے غزل کے فن کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 1.8 سے رجوع کریں۔

- 1- غزل اردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ہر شعر معنوی طور پر _____ ہوتا ہے۔
- 2- غزل کا پہلا شعر _____ کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔
- 3- غزل کے آخری شعر کو _____ کہتے ہیں، جس میں عموماً شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔
- 4- وہ ہم آواز الفاظ جو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں آتے ہیں _____ کہلاتے ہیں۔
- 5- ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں دہرایا جانے والا لفظ یا فقرہ _____ کہلاتا ہے۔

1.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں غزل کو اردو شاعری کی ایک اہم اور مقبول صنف کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ ابتدا میں غزل کی تعریف، اس کی فنی ماہیت اور بنیادی خصوصیات کو واضح کیا گیا، تاکہ طلبہ غزل کو محض عشقیہ شاعری نہیں بلکہ ایک وسیع اور ہمہ گیر صنفِ سخن کے طور پر سمجھ سکیں۔ اس امر پر زور دیا گیا کہ غزل بنیادی طور پر داخلی اظہار کی شاعری ہے جس میں باطنی کیفیات، جذباتی واردات اور فکری تجربات کو علامتی اور استعاراتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

سبق میں غزل کی ہیئت اور ساخت پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور بحر جیسے فنی اجزاء کی وضاحت کی گئی اور بتایا گیا کہ یہ عناصر مل کر غزل کا صوتی اور فنی نظام قائم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی واضح کیا گیا کہ غزل کا ہر شعر معنوی طور پر خود مختار ہوتا ہے اور یہی وصف اسے دوسری شعری اصناف سے ممتاز بناتا ہے، اگرچہ مربوط غزل کی روایت بھی موجود ہے۔

اس سبق میں اردو غزل پر فارسی کے اثرات اور غزل کے تاریخی آغاز و ارتقا کا بھی جائزہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ طلبہ کو اس صنف کے تہذیبی اور ادبی پس منظر کا شعور حاصل ہو۔ مزید برآں غزل کی علامت نگاری، استعاراتی نظام اور کثافت معنی پر گفتگو کی گئی، جس سے غزل کی معنوی گہرائی اور تہہ داری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ غزل اور موسیقیت کے تعلق کو بھی واضح کیا گیا اور بتایا گیا کہ بحر، قافیہ اور ردیف کی ترتیب غزل میں نغمگی اور ترنم پیدا کرتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ سبق غزل کے فنی ڈھانچے، فکری وسعت، علامتی نظام اور جمالیاتی خصوصیات کا جامع تعارف فراہم کرتا ہے اور طلبہ میں غزل فہمی، تنقیدی شعور اور ادبی ذوق کو فروغ دینے کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔

1.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے آپ کو یہ سمجھنے کا موقع ملا کہ غزل اردو شاعری کی ایک نہایت اہم، لطیف اور ہمہ گیر صنفِ سخن ہے جو صرف عشقیہ اظہار تک محدود نہیں بلکہ انسانی باطن، فکری تجربے اور جمالیاتی شعور کی بھرپور ترجمان بھی ہے۔ اس سبق نے واضح کیا کہ غزل بنیادی طور پر داخلی کیفیات کی شاعری ہے جس میں کم لفظوں میں گہرے اور تہہ دار معانی ادا کیے جاتے ہیں اور اشاریت، رمزیت اور ایجاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

آپ نے غزل کی تعریف، اس کے فنی ڈھانچے اور بنیادی اجزاء جیسے مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور بحر کو سمجھا اور یہ جاننا کہ یہ عناصر مل کر غزل کا ہیئت اور صوتی نظام قائم کرتے ہیں۔ آپ کو یہ ادراک بھی حاصل ہوا کہ غزل کا ہر شعر معنوی طور پر خود مختار ہوتا ہے اور یہی خصوصیت اسے دوسری شعری اصناف سے ممتاز بناتی ہے، اگرچہ مربوط غزل کی صورت بھی موجود ہے۔

اس سبق کے ذریعے آپ نے غزل کے موضوعاتی دائرے اور اس کی وسعت کو بھی جاننا کہ کس طرح غزل میں عشق، باطنی واردات، روحانی تجربہ، اخلاقی احساس، سماجی شعور اور وجودی کیفیتیں مختلف انداز سے بیان کی جاتی ہیں۔ مزید یہ کہ آپ نے غزل کی علامت نگاری، استعاراتی نظام اور موسیقیت کی اہمیت کو بھی سمجھا کہ کس طرح علامت اور استعارہ معنی میں گہرائی پیدا کرتے ہیں اور بحر، قافیہ اور ردیف غزل میں نغمگی اور ترنم پیدا کرتے ہیں۔ یوں اس سبق کے مطالعے سے آپ میں غزل فہمی، شعری ذوق اور تنقیدی مطالعے کی بنیادی صلاحیت پیدا ہوئی اور آپ غزل کو زیادہ شعوری اور فنی انداز میں سمجھنے کے قابل ہوئے۔

- ۱۔ شعور آگہی، ادراک، فہم، سمجھ
- ۲۔ صنفِ سخن شاعری یا ادب کی مخصوص ہیئت یا قسم۔
- ۳۔ داخلی شاعری وہ شاعری جس میں باطنی احساسات اور کیفیات کا اظہار ہو۔
- ۴۔ باطنی کیفیات دل اور ذہن سے وابستہ جذباتی و نفسیاتی حالتیں۔
- ۵۔ ایجاز کم لفظوں میں زیادہ معنی ادا کرنے کا ہنر۔
- ۶۔ کثافتِ معنی مختصر بیان میں گہرے اور متعدد مفہیم کا ہونا۔
- ۷۔ اشاریت اشاروں کے ذریعے معنی ادا کرنے کا انداز۔
- ۸۔ رمزیت پوشیدہ یا علامتی انداز میں بات کہنا۔
- ۹۔ علامت کوئی لفظ جو اپنے ظاہری معنی سے بڑھ کر وسیع مفہوم رکھتی ہو۔
- ۱۰۔ استعارہ ایک شے کو دوسری شے قرار دے کر معنی کو مؤثر بنانا۔
- ۱۱۔ علامت نگاری شاعری میں علامتوں کے باقاعدہ استعمال کا نظام۔
- ۱۲۔ استعاراتی نظام استعاروں کے منظم اور با معنی استعمال کی روایت۔
- ۱۳۔ مطلع غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ (اور عموماً ہم ردیف) ہوتے ہیں۔
- ۱۴۔ مطلعِ ثانی غزل میں دوسرا مطلع، جس میں بھی دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔
- ۱۵۔ مقطع غزل کا آخری شعر جس میں عموماً شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔
- ۱۶۔ تخلص شاعر کا قلمی نام جو عموماً مقطع میں استعمال ہوتا ہے۔
- ۱۷۔ قافیہ ہم آواز الفاظ جو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں آتے ہیں۔
- ۱۸۔ ردیف وہ لفظ یا فقرہ جو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔
- ۱۹۔ بحر شعری وزن اور آہنگ کا نظام۔
- ۲۰۔ ارکانِ بحر وزن بنانے والے صوتی اجزاء یا ٹکڑے۔
- ۲۱۔ زمین قافیہ، ردیف اور بحر کا مجموعی سانچہ جس میں غزل کہی جاتی ہے۔
- ۲۲۔ مصرع شعر کا ایک جز (آدھی سطر)۔
- ۲۳۔ شعر دو مصرعوں پر مشتمل مکمل اکائی۔

۲۴۔ ہیئت	فنی ساخت اور بناوٹ۔
۲۵۔ موسیقیت	کلام میں صوتی آہنگ اور نغمگی کی کیفیت۔
۲۶۔ ترنم	لے اور آہنگ کے ساتھ پڑھنے یا گانے کا انداز۔
۲۷۔ آہنگ	آواز کی باقاعدہ لے
۲۸۔ نغمگی	سریلایپن
۲۹۔ ترسیل	مؤثر انداز میں پہنچانا
۳۰۔ تاثر	اثر یا کیفیت جو دل پر پڑے

1.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

- 1۔ غزل کی تعریف بیان کیجیے اور بتائیے کہ یہ دوسری شعری اصناف سے کس طرح مختلف ہے؟
- 2۔ غزل کے بنیادی فنی اجزاء کی مختصر وضاحت کیجیے۔
- 3۔ غزل کو داخلی شاعری کی صنف کیوں کہا جاتا ہے؟ مثال کے ساتھ واضح کیجیے۔
- 4۔ غزل میں علامت نگاری اور استعاراتی نظام کی کیا اہمیت ہے؟
- 5۔ غزل کی موسیقیت کن عناصر سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا کلام کی تاثیر پر کیا اثر پڑتا ہے؟

1.7 مشقی سوالات

- 1۔ غزل کی تعریف کیجئے؟

2۔ مطلع اور مقطع کیا ہوتے ہیں؟

3۔ قافیہ اور ردیف میں کیا فرق ہے؟

4۔ غزل کو داخلی شاعری کیوں کہا جاتا ہے؟

5۔ غزل میں موسیقیت کن عناصر سے پیدا ہوتی ہے؟

1.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1- غزل کی تعریف کیجئے؟

غزل اردو شاعری کی ایک معروف صنف ہے جو اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں ہر شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے خود مختار ہوتا ہے۔ غزل میں عموماً عشق، باطنی کیفیات، فکری تجربات اور انسانی جذبات کو ایجاز اور علامتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔

2- مطلع اور مقطع کیا ہوتے ہیں؟

مطلع غزل کا پہلا شعر ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور عموماً ہم ردیف ہوتے ہیں، اور اسی سے غزل کے قافیہ وردیف کا نظام قائم ہوتا ہے۔ مقطع غزل کا آخری شعر ہوتا ہے جس میں شاعر عموماً اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، جس سے شعر میں شخصی رنگ پیدا ہوتا ہے۔

3- قافیہ اور ردیف میں کیا فرق ہے؟

قافیہ ہم آواز الفاظ کو کہتے ہیں جو ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں آتے ہیں اور صوتی ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، جبکہ ردیف وہ لفظ یا فقرہ ہے جو قافیہ کے بعد ہر شعر میں اسی صورت سے دہرایا جاتا ہے۔ قافیہ لازمی جز ہے جبکہ ردیف اختیاری ہوتی ہے۔

4- غزل کو داخلی شاعری کیوں کہا جاتا ہے؟

غزل کو داخلی شاعری اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں خارجی واقعات کے بجائے دل کی کیفیات، ذاتی احساسات، نفسیاتی تجربات اور باطنی واردات کو مرکز بنایا جاتا ہے۔ شاعر اپنی داخلی دنیا کو علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔

5- غزل میں موسیقیت کن عناصر سے پیدا ہوتی ہے؟

غزل میں موسیقیت بحر، قافیہ اور ردیف کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ شعری وزن، ہم آواز الفاظ اور لفظی تکرار مل کر کلام میں آہنگ، ترنم اور نغمگی پیدا کرتے ہیں، جس سے شعر کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔

1.8 جواباتِ سرگرمی

- 1۔ خود مختار
- 2۔ مطلع
- 3۔ مقطع
- 4۔ قافیہ
- 5۔ ردیف

1.9 امدادی کتب

- | | |
|----------------------|---|
| ڈاکٹر یوسف حسین خان | ۱۔ اُردو غزل |
| ڈاکٹر عبادت بریلوی | ۲۔ غزل اور مطالعہ غزل |
| ڈاکٹر فرمان فتح پوری | ۳۔ اردو شاعری کا فنی ارتقا |
| شمس الرحمان فاروقی | ۴۔ اردو غزل کے اہم موڈ |
| کلیم الدین احمد | ۵۔ اردو شاعری پر ایک نظر |
| فراق گور کھپوری | ۶۔ اُردو کی عشقیہ شاعری |
| رشید احمد صدیقی | ۷۔ جدید غزل |
| پروفیسر قدوس جاوید | ۸۔ اکیسویں صدی میں اُردو شعریات |
| ڈاکٹر فرحت شمیم | ۹۔ اُردو غزل، فن اور فنکار۔ (اُردو غزل کا نیا انتخاب) |

سبق نمبر ۲۔ اردو غزل پر فارسی کے اثرات

ساخت

- 2.0 اغراض و مقاصد
- 2.1 تعارف
- 2.2 اردو غزل پر فارسی کے اثرات
 - 2.2.0 سرگرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 2.3 عمومی جائزہ
- 2.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 2.5 فرہنگ
- 2.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 2.7 مشقی سوالات
 - 2.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 2.8 جوابات سرگرمی
- 2.9 امدادی کتب

2.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو یہ سمجھانا ہے کہ اردو غزل کی فنی ساخت، لسانی نزاکت اور معنوی وسعت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے فارسی زبان و ادب کے اثرات کا شعور ضروری ہے۔ اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ اردو غزل کی تشکیل ایک وسیع تہذیبی اور ادبی تعامل کا نتیجہ ہے، جس میں فارسی شعری روایت نے اہم کردار ادا کیا۔

اس سبق کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آپ اردو غزل کی ہیئت اور فنی نظام جیسے مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف، بحر اور عروضی سانچے کے پس منظر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور یہ جان سکیں کہ ان کی تشکیل اور ترتیب میں فارسی شعریات کا کیا حصہ ہے۔ اس سے آپ کو غزل کے فنی ڈھانچے کی تاریخی جڑوں کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ اس سبق کے ذریعے آپ کو اردو غزل کی زبان پر فارسی کے اثرات سے آگاہ کیا جاتا ہے، مثلاً لفظیات، تراکیب، اضافت، سالبقوں اور لاحقوں کے استعمال، اور اسلوبی نزاکت کے پہلو۔ اس مطالعے سے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کس طرح فارسی اثر نے غزل کی زبان کو لطافت، اختصار اور ترکیبی حسن عطا کیا۔

اس سبق کا مقصد آپ کو غزل کے علامتی، استعاراتی اور تلمیحی نظام پر فارسی روایت کے اثرات سے بھی روشناس کرانا ہے، تاکہ آپ غزل کے اشعار میں استعمال ہونے والی علامتوں، استعاروں اور تلمیحات کے تہذیبی اور فکری پس منظر کو سمجھ سکیں اور ان کی درست تعبیر کر سکیں۔ مزید برآں اس سبق کے ذریعے آپ میں تقابلی اور تنقیدی شعور پیدا کرنا بھی مقصود ہے، تاکہ آپ یہ پرکھ سکیں کہ اردو غزل نے فارسی روایت سے کس حد تک اثر قبول کیا اور کہاں اسے اپنے مقامی ذوق اور تجربے کے مطابق ڈھالا۔

مجموعی طور پر اس سبق کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ آپ اردو غزل پر فارسی اثرات کی نوعیت، وسعت اور اہمیت کو سمجھیں، اس کے فنی اور فکری پہلوؤں کا تجزیہ کر سکیں، اور غزل کے مطالعے کو زیادہ گہرے اور باخبر انداز میں انجام دے سکیں۔

2.1 تعارف

اردو غزل کی تاریخ اور فنی تشکیل کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اس پر فارسی زبان و ادب کے اثرات کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ برصغیر کی ادبی اور تہذیبی تاریخ میں فارسی کو کئی صدیوں تک علمی، سرکاری اور ادبی زبان کا درجہ حاصل رہا۔ اسی فضا میں اردو زبان نے نشوونما پائی اور اسی ماحول میں اردو غزل نے اپنی ابتدائی صورتیں اختیار کیں۔ چنانچہ اردو غزل کا فنی سانچہ، اسلوبی نزاکت، علامتی نظام اور اظہار کی لطافت بڑی حد تک فارسی شعری روایت سے مربوط دکھائی دیتی ہے۔

فارسی غزل ایک پختہ اور منظم صنف کے طور پر پہلے سے موجود تھی، جس میں ہیئت، عروض، علامت نگاری اور فکری جہات کا ایک وسیع ذخیرہ تیار ہو چکا تھا۔ اردو کے ابتدائی شعرا نے اس روایت سے رہنمائی حاصل کی اور اس کے فنی اصولوں جیسے بحر، قافیہ، ردیف، مطلع اور مقطع کو اختیار کر

کے اردو غزل کو ایک باقاعدہ فنی ڈھانچہ عطا کیا۔ اس اخذ کا مطلب محض نقل نہیں تھا بلکہ تخلیقی تطبیق تھا، کیونکہ اردو شعرا نے فارسی سانچوں کو اپنے لسانی مزاج اور مقامی تجربے کے مطابق ڈھالا۔

اس سبق میں یہ واضح کیا جائے گا کہ فارسی اثرات صرف فنی ہیئت تک محدود نہیں بلکہ اردو غزل کی زبان، لفظیات، تراکیب اور انداز بیان میں بھی گہرے طور پر پیوست ہیں۔ اضافت کی ترکیب، مرکب الفاظ، وصفی پیکر، اور مخصوص شعری لغت نے اردو غزل کو ایک خاص کلاسیکی وقار اور صوتی لطافت عطا کی۔ اسی طرح علامتوں اور استعاروں کا وہ نظام، جو فارسی شاعری میں پروان چڑھا، اردو غزل میں منتقل ہو کر مزید وسعت اختیار کرتا ہے۔

یہ سبق اس پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ فارسی روایت کے ذریعے تصوف، رندی، عشق کی مرکزیت اور باطنی تجربے جیسے فکری عناصر اردو غزل کا حصہ بنے۔ یوں غزل محض جذباتی اظہار نہ رہی بلکہ روحانی، فکری اور وجودی سوالات کی ترجمان بھی بن گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وقت کے ساتھ اردو غزل نے فارسی اثرات کو نئے معنی دیے اور اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئی جہات پیدا کیں۔

مجموعی طور پر یہ سبق اردو غزل اور فارسی روایت کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس کے مطالعے سے غزل کے فنی ڈھانچے، لسانی حسن اور علامتی گہرائی کو زیادہ بصیرت کے ساتھ سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور قاری کے سامنے اردو غزل کی تشکیل کا ایک وسیع تہذیبی اور ادبی پس منظر واضح ہو جاتا ہے۔

2.2 اردو غزل پر فارسی کے اثرات

اردو غزل کی فنی اور فکری تشکیل کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے پس منظر میں موجود ادبی روایتوں اور تہذیبی سرچشموں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ کسی بھی ادبی صنف کی ساخت محض زبان کے اندر نہیں بنتی بلکہ مختلف لسانی، ثقافتی اور فکری اثرات کے باہمی تعامل سے تشکیل پاتی ہے۔ اردو غزل بھی ایک ایسی ہی صنف ہے جس نے اپنے ارتقائی سفر میں متعدد ادبی روایتوں سے فیض حاصل کیا، جن میں فارسی زبان و ادب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ فارسی روایت نے اردو غزل کے فنی سانچے، اسلوب بیان، علامتی نظام اور فکری جہات کو گہرے طور پر متاثر کیا اور اسے ایک منضبط اور تہہ دار اظہار عطا کیا۔ اب ہم اردو غزل پر فارسی کے اثرات کا جائزہ مختلف ذیلی عناوین کے تحت تفصیل سے پیش کریں گے، تاکہ اس اثر کی نوعیت اور وسعت کو منظم انداز میں سمجھا جاسکے۔

اردو غزل کی فنی ساخت، لسانی نزاکت اور معنوی وسعت کو سمجھنے کے لیے فارسی زبان و ادب کے اثرات کا جائزہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اردو جس تہذیبی اور علمی ماحول میں نشوونما پاتی ہے وہاں فارسی کئی صدیوں تک اقتدار، علم، تصوف اور ادب کی مرکزی زبان رہی۔ دربار، عدالت، دفتری نظام، خانقاہیں اور علمی مراکز فارسی کے زیر اثر تھے، اس لیے ادبی اظہار کی طرف آنے والے شعرا براہ راست یا بالواسطہ فارسی روایت سے وابستہ رہے۔

اس فضا میں اردو غزل نے جنم لیا تو اس کے سامنے فارسی غزل کی ایک پختہ، منظم اور جمالیاتی روایت موجود تھی۔ اردو شعرا نے اس روایت سے فنی ڈھانچہ، اسلوبی نزاکت اور اظہار کی لطافت اخذ کی، مگر اسے جوں کا توں قبول کرنے کے بجائے اپنے معاشرتی تجربے اور مقامی احساس کے مطابق ڈھالا۔ اس طرح اردو غزل فارسی اثرات کی وارث ہونے کے ساتھ اپنی جداگانہ شناخت بھی قائم کرتی ہے۔ یہ تعلق یک طرفہ اثر کا نہیں بلکہ تخلیقی اخذ و تطبیق (adaptation) کا ہے۔

ہیئتی اعتبار سے اردو غزل کا بنیادی سانچہ فارسی غزل سے ماخوذ ہے۔ مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف اور بحر کی ترتیب، نیز اوزان اور ارکان عروض کا نظام فارسی شعریات کے ذریعے اردو میں منتقل ہوا۔ اس منظم فنی ڈھانچے نے اردو غزل کو ایک باقاعدہ صنف کے طور پر استحکام دیا۔ شاعر کے لیے یہ پابندیاں محض رکاوٹ نہیں بلکہ فنی تربیت کا ذریعہ بنیں، جنہوں نے اظہار کو نظم، توازن اور صوتی حسن عطا کیا۔ فارسی عروض کے اثر سے اردو غزل میں متعدد بحریں رائج ہوئیں، اور ہر بحر ایک مخصوص آہنگ اور تاثر کی حامل بنی۔ اس سے شاعر کو یہ امکان ملا کہ وہ اپنے مضمون اور کیفیت کے مطابق بحر کا انتخاب کرے۔ یوں فنی نظام نے معنی اور آہنگ کے باہمی ربط کو مضبوط کیا۔ مزید یہ کہ ردیف کے بلیغ استعمال جو فارسی روایت میں بھی نمایاں ہے نے اردو غزل میں صوتی حسن اور یادداشت کو دوچند کیا۔

اردو غزل کی زبان پر فارسی کا اثر سب سے نمایاں طور پر لفظیات اور اسلوب میں نظر آتا ہے۔ ہزاروں فارسی الاصل الفاظ غزل کی زبان کا حصہ بنے اور جذباتی، جمالیاتی اور فکری اظہار کے بنیادی وسیلے قرار پائے جیسے عشق، جلوہ، نگاہ، تمنا، حسرت، راز، نیاز، خمار، بزم، آہنگ وغیرہ۔ ان الفاظ نے محض ذخیرہ الفاظ میں اضافہ نہیں کیا بلکہ اظہار کو تہذیبی شائستگی اور لطافت عطا کی۔

فارسی سابقوں اور لاحقوں (بے، نا، ہم، کم، پرست، گاہ، کدہ، دار وغیرہ) کے ذریعے نئے الفاظ اور مفہیم بنے، جس سے اردو غزل کی زبان میں تخلیقی وسعت پیدا ہوئی۔ اسی طرح اضافت کی ترکیب دلِ ناداں، غمِ ہستی، نقشِ وفانے اردو شعری اسلوب میں صوتی نرمی، اختصار اور ترکیبی حسن پیدا کیا۔ یہ انداز بعد میں کلاسیکی غزل کی پہچان بن گیا۔

فارسی طرزِ بیان کا ایک اور اثر خطابِ اور مکالماتی لہجہ بھی ہے جیسے اے دل، اے ساقی، اے دوست جس نے غزل میں براہِ راست جذباتی اپیل اور ڈرامائی کیفیت پیدا کی۔ اس اسلوب نے شعر کو زندہ مکالمے کا رنگ دیا۔

فارسی شاعری کے علامتی اور استعاراتی نظام نے اردو غزل کو غیر معمولی معنوی وسعت عطا کی۔ شمع و پروانہ، گل و بلبل، صیاد و قفس، ساقی و میخانہ، زلف و زنجیر، صحرا و کارواں یہ سب علامتی پیکر فارسی روایت سے اردو میں آئے۔ مگر اردو شعرا نے انہیں نئے سماجی، نفسیاتی اور روحانی مفہیم بھی دیے۔ یوں علامتیں جامد نہ رہیں بلکہ ارتقا پذیر رہیں۔

تلمیحی نظام بھی فارسی کے ذریعے مضبوط ہوا۔ عشقیہ و اساطیری قصے شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا اور صوفیانہ و مذہبی اشارے منصور، دار، کوہ طور اردو غزل میں کثرت سے آئے۔ تلمیح کے ذریعے شاعر کم لفظوں میں ایک مکمل داستان یا فکری پس منظر کو سمیٹ لیتا ہے، جس سے شعر کی معنوی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔

فکری سطح پر فارسی اثرات نے اردو غزل کے مزاج کو گہرائی عطا کی۔ تصوف، وحدت الوجود، باطنی تجربہ، عشق کو کائناتی قوت کے طور پر دیکھنا، ظاہر و باطن کی کشمکش یہ سب موضوعات فارسی صوفی شاعری کے ذریعے اردو غزل میں داخل ہوئے۔ اس سے غزل محض رومانوی صنف نہ رہی بلکہ روحانی اور وجودی سوالات کی ترجمان بھی بن گئی۔

رندی اور زہد کے تقابل، رسمیت پر تنقید، اور باطنی سچائی پر زور یہ رجحانات بھی فارسی روایت سے آئے اور اردو غزل میں ایک تنقیدی اور فکری جہت پیدا ہوئی۔ اس طرح غزل نے جذباتی اظہار کے ساتھ فکری مکالمے کی صورت بھی اختیار کی۔

وقت کے ساتھ اردو غزل میں فارسی اثرات کی نوعیت بدلتی رہی۔ کلاسیکی دور میں فارسی آمیز زبان، بھاری تراکیب اور کثرتِ تلمیح نمایاں تھی۔ جدید دور میں زبان نسبتاً سادہ ہوئی، مقامی لفظیات بڑھی، اور فارسی علامتوں کو نئے معنی دیے گئے یا ان کی نئی تعبیر کی گئی۔ مگر اس تبدیلی کے باوجود بنیادی فنی اور علامتی ڈھانچہ برقرار رہا۔

یوں مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اردو غزل پر فارسی کے اثرات محض تاریخی وراثت نہیں بلکہ ایک مسلسل تخلیقی تعامل کا نتیجہ ہیں۔ اس تعامل نے اردو غزل کو فنی پختگی، لسانی نزاکت، علامتی وسعت اور فکری گہرائی عطا کی اور اسی اشتراک نے اسے ایک ہمہ جہت اور دیر پا صنفِ سخن بنایا۔

2.2.0 سرگرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیر طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے اردو غزل پر فارسی کے اثرات کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 2.8 سے رجوع کریں۔

- 1۔ اردو غزل کا عروضی اور فنی نظام بڑی حد تک _____ روایت سے ماخوذ ہے۔
- 2۔ دلِ ناداں، نقشِ وفا اور غمِ ہستی فارسی _____ کی مثالیں ہیں۔
- 3۔ شمعِ پروانہ اور گل و بلبل فارسی _____ نظام کے معروف پیکر ہیں۔
- 4۔ شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں شعری طور پر _____ کہلاتے ہیں۔

2.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں اردو غزل پر فارسی زبان و ادب کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں فارسی تہذیبی و ادبی فضا کا تعارف کرایا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ اردو غزل کی فنی اور لسانی تشکیل میں فارسی روایت نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس امر پر زور دیا گیا کہ اردو غزل کا فنی سانچہ، اسلوبی نزاکت اور علامتی نظام ایک وسیع ادبی تعامل کا نتیجہ ہے۔ سبق میں غزل کی ہیئت، عروضی نظام اور فنی ڈھانچے پر فارسی اثرات کو واضح کیا گیا، جن

میں بحر، قافیہ، ردیف اور اوزان کی روایت شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو غزل کی زبان، لفظیات، تراکیب، اضافت اور اسلوب بیان پر فارسی کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی گئی۔

مزید برآں علامتی، استعاراتی اور تلمیحی نظام پر فارسی روایت کے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ کس طرح فارسی قصص، علامات اور صوفیانہ تصورات اردو غزل میں جذب ہو کر نئی معنوی جہات پیدا کرتے ہیں۔ سبق میں فکری اور روحانی رجحانات جیسے تصوف، رندی، عشق کی مرکزیت کے فارسی سرچشموں کو بھی واضح کیا گیا۔

مجموعی طور پر یہ سبق اردو غزل اور فارسی روایت کے تخلیقی تعلق کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور طلبہ میں تقابلی اور تنقیدی مطالعے کا ذوق پیدا کرتا ہے۔

2.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے آپ کو یہ سمجھنے کا موقع ملا کہ اردو غزل کی فنی ساخت اور اسلوبی تشکیل پر فارسی زبان و ادب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آپ نے جانا کہ اردو غزل کا ہیئت ڈھانچہ جیسے بحر، قافیہ، ردیف اور عروضی نظام فارسی شعریات سے مربوط ہے۔

آپ نے یہ بھی سمجھا کہ اردو غزل کی زبان میں فارسی الاصل الفاظ، سابقے، لاحقے اور اضافتی تراکیب نے اظہار کو لطافت، اختصار اور تہذیبی شائستگی عطا کی۔ اس کے ساتھ آپ فارسی طرز بیان اور خطابیہ لہجے کے اثرات سے بھی واقف ہوئے۔

سبق کے ذریعے آپ نے علامتی اور استعاراتی نظام، تلمیحات اور شعری پیکروں پر فارسی روایت کے اثرات کو بھی سمجھا اور یہ جانا کہ کس طرح صوفیانہ اور فکری عناصر اردو غزل میں شامل ہوئے۔ یوں آپ اردو غزل کو اس کے تہذیبی اور ادبی پس منظر کے ساتھ سمجھنے کے قابل ہوئے۔

2.5 فرہنگ

- ۱۔ اختصار مختصر بیان کیا گیا
- ۲۔ روایت دستور، چلن
- ۳۔ عروض شعری اوزان کا علم
- ۴۔ اوزان شعری وزن کی صورتیں
- ۵۔ ارکان عروض وزن کے بنیادی اجزاء
- ۶۔ مرتب آراستہ، قرینہ
- ۷۔ فارسی الاصل فارسی سے ماخوذ لفظ
- ۸۔ سابقہ لفظ کے شروع میں لگنے والا جز
- ۹۔ لاحقہ لفظ کے آخر میں لگنے والا جز

- ۱۰۔ ترکیب مرکب لفظی ساخت
- ۱۱۔ تلمیح کسی مشہور تاریخی و مذہبی واقعے یا کردار کی طرف اشارہ
- ۱۲۔ علامتی پیکر علامتی تصویریں اظہار
- ۱۳۔ کلاسیکی قدیم اور مستند ادبی طرز
- ۱۴۔ صوفیانہ روایت روحانی فکر پر مبنی ادبی روایت
- ۱۵۔ رندی ظاہری زہد کے مقابل آزادانہ صوفیانہ روش
- ۱۶۔ تخلیقی تطبیق اخذ کر کے نئے انداز سے ڈھالنا
- ۱۷۔ تہذیبی تعامل ثقافتی باہمی اثر
- ۱۸۔ اسلوبی نزاکت اظہار کی لطافت

2.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ اردو غزل کی تشکیل میں فارسی ادبی فضا کی کیا اہمیت ہے؟

2۔ اردو غزل کی ہیئت پر فارسی کے کیا اثرات ہیں؟

3۔ اردو غزل کی زبان پر فارسی اثرات کی مثالیں دیں۔

4۔ فارسی روایت نے غزل کے علامتی نظام کو کیسے متاثر کیا؟

5۔ فکری سطح پر فارسی اثرات سے غزل میں کیا تبدیلی آئی؟

2.7 مشقی سوالات

1۔ اردو غزل پر فارسی کے اثرات بیان کیجیے۔

2۔ فارسی عروض نے اردو غزل کو کیا دیا؟

3۔ اضافت اور فارسی تراکیب کی وضاحت کیجیے۔

4۔ فارسی علامتوں اور تلمیحات کی مثالیں دیجیے۔

5۔ صوفیانہ اثرات نے غزل کے مزاج کو کیسے بدلا؟

2.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ اردو غزل پر فارسی زبان و ادب کے اثرات بیان کیجیے۔

اردو غزل پر فارسی کے گہرے فنی، لسانی اور فکری اثرات مرتب ہوئے۔ غزل کی ہیئت، عروضی نظام، قافیہ و ردیف کی ترتیب فارسی روایت سے آئی۔ اردو غزل کی زبان میں بے شمار فارسی الفاظ اور تراکیب شامل ہوئیں۔ علامت نگاری اور تلمیحی نظام بھی فارسی سے منتقل ہوا۔ اس طرح اردو غزل کو فنی پختگی اور معنوی وسعت حاصل ہوئی۔

2۔ فارسی عروض نے اردو غزل کو کیا دیا؟

فارسی عروض نے اردو غزل کو بحر، اوزان اور ارکانِ وزن کا منظم نظام دیا۔ اس سے شعر میں صوتی توازن اور ردھم پیدا ہوا۔ وزن کی پابندی نے غزل میں نغمگی اور ترنم کو مضبوط کیا۔ مختلف بحروں نے مختلف کیفیات کے اظہار میں مدد دی۔ یوں غزل فنی طور پر منضبط صنف بنی۔

3۔ اضافت اور فارسی تراکیب کی وضاحت کیجیے۔

اضافت فارسی ترکیب ہے جس میں دو الفاظ کو ”” سے جوڑا جاتا ہے، جیسے دلِ ناداں، غمِ ہستی۔ اس سے اختصار اور صوتی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ فارسی تراکیب مرکب لفظی ساختیں ہیں جیسے آتشِ دل، زنجیرِ پا۔ یہ تراکیب شعر میں تصویریت اور معنوی گہرائی پیدا کرتی ہیں۔ اردو غزل کے کلاسیکی اسلوب میں ان کا اہم کردار ہے۔

4۔ فارسی علامتوں اور تلمیحات کی مثالیں دیجیے۔

فارسی علامتوں میں شمعِ و پروانہ، گل و بلبل، ساقی و میخانہ نمایاں ہیں۔ یہ عشق، حسن اور سرشاری کے استعارے ہیں۔ تلمیحات میں شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا شامل ہیں۔ ان سے شعر میں وسیع تہذیبی پس منظر آ جاتا ہے۔ کم لفظوں میں بڑا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

5۔ صوفیانہ اثرات نے غزل کے مزاج کو کیسے بدلا؟

صوفیانہ اثر سے غزل میں روحانی اور باطنی موضوعات شامل ہوئے۔ عشق کا تصور مجازی سے بڑھ کر حقیقی اور عرفانی ہو گیا۔ میخانہ، ساقی اور شراب جیسی علامتوں کے معنی بدل گئے۔ زہد اور ریاکاری پر تنقید کا رجحان پیدا ہوا۔ غزل کا لہجہ زیادہ گہرا اور فکری بن گیا۔

2.8 جوابت سرگرمی

- 1۔ فارسی
 - 2۔ اضافت
 - 3۔ علامتی
 - 4۔ تلمیحات
-

2.9 امدادی کتب

- | | |
|-----------------------------------|--------------------------------|
| 1۔ دکنی غزل کی نشوونما | ڈاکٹر محمد علی اثر |
| 2۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات | ڈاکٹر عصمت جاوید |
| 3۔ زبان فارسی کا اثر زبان اردو پر | ڈاکٹر قادری سید کلیم اللہ حسین |
| 4۔ اردو غزل پر تصوف کے اثرات | ڈاکٹر محمد اسلام رشیدی |
| 5۔ اردو شاعری پر ایک نظر | کلیم الدین احمد |
| 6۔ اردو ساخت کے بنیادی عناصر | نصیر احمد خان |
| 7۔ داستان زبان اردو | حامد حسین قادری |
| 8۔ غزل اور مطالعہ غزل | ڈاکٹر عبادت بریلوی |

سبق نمبر ۳۔ اردو غزل کا آغاز و ارتقا

ساخت

3.0 اغراض و مقاصد

3.1 تعارف

3.2 اردو غزل کا آغاز و ارتقاء

3.2.0 سرگرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

3.3 عمومی جائزہ

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

3.5 فرہنگ

3.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

3.7 مشقی سوالات

3.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

3.8 جوابات سرگرمی

3.9 امدادی کتب

3.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو اردو غزل کے آغاز اور ارتقائی سفر سے روشناس کرانا ہے، تاکہ آپ اس صنف کی تاریخی تشکیل اور ادبی ترقی کو منظم انداز میں سمجھ سکیں۔ اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا جاتا ہے کہ اردو غزل ایک تدریجی عمل کے تحت وجود میں آئی اور مختلف ادوار، دبستانوں اور شعرا کی کاوشوں سے پختہ ہوئی۔

اس سبق کا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ دکنی دور، دلی دکنی کے کردار، دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں، اور کلاسیکی و جدید ادوار کی نمایاں خصوصیات کو سمجھ سکیں۔ آپ یہ جان سکیں کہ کس طرح مختلف تاریخی، تہذیبی اور فکری عوامل نے غزل کے مزاج اور موضوعات کو متاثر کیا۔ مزید یہ کہ اس سبق کے ذریعے آپ میں ادبی تاریخ کے مطالعے کا شعور پیدا ہو اور آپ مختلف ادوار کی غزل کے اسلوبی اور فکری فرق کو پہچاننے کے قابل ہوں۔

3.1 تعارف

اردو غزل کا آغاز اور ارتقاء دو ادب کی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے۔ غزل محض ایک شعری صنف نہیں بلکہ برصغیر کے تہذیبی، جذباتی اور فکری تجربے کی نمائندہ صورت ہے۔ اس کا سفر لسانی تشکیل، فارسی روایت کے اثر، دکنی تجربات، اور دہلی و لکھنؤ کے دبستانی فروغ سے گزرتا ہوا جدید دور تک پہنچتا ہے۔

یہ سبق اردو غزل کے اسی تدریجی سفر کو واضح کرتا ہے کہ یہ صنف کیسے ابتدائی تجربات سے کلاسیکی کمال تک پہنچی، اور پھر جدید عہد میں نئے موضوعات اور نئے لہجوں کے ساتھ زندہ رہی۔ اب ہم اردو غزل کے آغاز اور ارتقاء کو مرحلہ وار سمجھیں گے۔

3.2 اردو غزل کا آغاز و ارتقاء

اردو شاعری میں غزل کا ذکر آتے ہی سب سے پہلے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صنف محض چند اشعار کی بندش نہیں بلکہ ہمارے تہذیبی مزاج، جذباتی تجربے اور فکری ارتقاء کی ایک ہمہ گیر علامت ہے۔ غزل برصغیر میں جس صورت میں پروان چڑھی، اس کے پیچھے صدیوں کا لسانی پس منظر، فارسی شعری روایت کی مضبوط بنیاد، اور یہاں کے سماجی و روحانی حالات کی پیچیدہ کیفیتیں کارفرما رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل کے آغاز و ارتقاء کو سمجھنا دراصل اردو زبان، برصغیر کی تہذیب، اور ادبی شعور کے سفر کو سمجھنے کے مترادف ہے۔

غزل کی آمد اردو میں کسی اچانک واقعے کی طرح نہیں ہوئی۔ جس خطے میں اردو نے جنم لیا وہاں فارسی مدتوں تک دربار، مدرسہ، خانقاہ اور علم و ادب کی مقتدر زبان رہی۔ فارسی غزل نے برصغیر کے شعری ذوق کو نہ صرف موضوعات عطا کیے بلکہ اظہار کے پیمانے، رمزیہ اسلوب، استعاروں کی دنیا، اور عروضی ڈھانچا بھی دیا۔ چنانچہ جب اردو نے اپنی شناخت بنانا شروع کی تو اس نے فارسی سے الفاظ ہی نہیں بلکہ شعری تہذیب کے بہت سے سانچے بھی اختیار کیے۔ اسی پس منظر میں یہ کہنا بجائے کہ اردو غزل فارسی کے زیر اثر اپنے فنی وجود میں آئی، لیکن آگے چل کر اس نے اپنے مقامی تجربے اور معاشرتی حقیقتوں کی بنیاد پر ایک الگ اور مستقل مزاج بھی قائم کیا۔

ابتدائی مرحلے کی بحث میں روایت اور تحقیق دونوں سامنے آتی ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ”آبِ حیات“ میں امیر خسرو کو اردو شاعری کے اولین نقشوں میں نمایاں کیا، جبکہ بعض محققین کی رائے یہ رہی کہ امیر خسرو سے بھی پہلے بابا فرید گنج شکر کے بعض ابتدائی نمونے اس سمت اشارہ کرتے ہیں۔ تاہم یہاں ایک احتیاط ضروری ہے: ان بزرگوں کے کلام میں جو لسانی رنگ اور مقامی لہجہ ملتا ہے وہ اردو کے ابتدائی بیج ضرور ہیں، مگر انہیں آج کے مفہوم میں باقاعدہ ”اردو غزل“ کہنا مشکل ہے۔ اس زمانے میں زبانیں اپنی تشکیل کے مرحلے میں تھیں، اور ”ریختہ/ہندوی“ کے ابتدائی تجربات ابھی منضبط صنف کی صورت اختیار نہیں کر پائے تھے۔ اس لیے جدید تحقیق کا عمومی رخ اس طرف ہے کہ اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد کن میں پڑتی ہے، جہاں اردو نے نسبتاً جلد ادبی صورت اختیار کی اور شاعری میں اس کا استعمال منظم طور پر سامنے آیا۔

دکن کی ریاستیں علمی و ادبی اعتبار سے سرگرم تھیں۔ وہاں فارسی کی روایت موجود تھی، مگر مقامی زبانوں کی فضا بھی زندہ تھی، اسی لیے دکنی شاعری میں ایک قدرتی روانی، سادگی اور مقامی رنگ نمایاں ہوا۔ دکن کے ابتدائی شعرا کے یہاں غزل کے تجربات ملتے ہیں، مگر جس شاعر نے اردو غزل کو باضابطہ جمالیاتی شان، صوتی نغمگی اور اظہار کی نئی دلکشی عطا کی وہ ولی دکنی ہیں۔ ولی کا کارنامہ یہ نہیں کہ انہوں نے پہلی بار غزل کہی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو ایسا لہجہ دیا جو عام ذوق سے بھی ہم آہنگ تھا اور ادبی معیار سے بھی بلند۔ ان کی زبان سادہ، مگر بے رنگ نہیں؛ عام فہم، مگر سطحی نہیں؛ اور موضوعات رنگارنگ، مگر منتشر نہیں۔ انہوں نے حسن و عشق کے معاملات کو عام بول چال کے قریب لا کر بھی شاعرانہ وقار قائم رکھا۔ اسی سبب بعد کے ناقدین نے انہیں اردو شاعری کا ”باوا آدم“ بھی کہا، یعنی وہ شاعر جن کے کلام نے اردو غزل کے لیے راستہ ہموار کیا اور شمالی ہند میں اس صنف کے باقاعدہ فروغ کی بنیاد رکھی۔

ولی کی دہلی آمد اردو غزل کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں زبان و بیان کے کئی تجربات ہو رہے تھے، اور ابہام گوئی کی تحریک بھی ایک خاص ادبی فضا پیدا کر رہی تھی۔ ولی کے کلام نے دہلی کے شعری ماحول کو یہ دکھایا کہ ریختہ محض تجربہ نہیں بلکہ ایک مکمل ادبی زبان بن سکتی ہے، جو غزل جیسے لطیف صنف کو اپنے اندر سمو سکتی ہے۔ چنانچہ دہلی میں آہستہ آہستہ اردو غزل کی طرف توجہ بڑھی، فارسی زمینوں میں غزل کہنا عام ہوا، اور زبان کی صفائی، محاورے کی درستگی اور بیان کی شائستگی پر بحث شروع ہوئی۔ اس دور میں آبرو، ناجی، آرزو اور دیگر شعرا کے نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے غزل کے خدوخال سنوارنے میں حصہ لیا۔ یہ مرحلہ اردو غزل کی ”تشکیل معیار“ کا زمانہ بھی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اسی دور میں زبان کی تہذیب، اظہار کی تراش خراش اور صنف کی سمت متعین ہونے لگی۔

اس کے بعد اردو غزل جس عروج تک پہنچی، اس کی بنیاد ولی کے عظیم شعرانے رکھی، اور یہی وہ مرحلہ ہے جسے بہت سے اہل نظر اردو غزل کا ”سنہری دور“ قرار دیتے ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر اور خواجہ میر درد جیسے شعرا نے اپنے اپنے انداز میں غزل کو وسعت دی۔ سودا کے یہاں زبان کی گھن گرج، سماجی شعور اور طنزیہ قوت ملتی ہے، جبکہ میر کے یہاں غم کی داخلیت، انسانی شائستگی اور جذبات کی لطیف ترین کیفیتیں جلوہ گر ہیں۔ میر نے غزل کو اس طرح ”دل کی زبان“ بنایا کہ اردو غزل کی شناخت ہی درد، سوز اور تہہ داری سے جڑ گئی۔ خواجہ میر درد نے اسی

غزل میں صوفیانہ فکر اور باطنی تجربے کو ایسا سلیقہ دیا کہ غزل صرف محبوب کی بات نہیں رہی بلکہ حقیقت وجود اور روحانی سچائی کی جستجو بھی بن گئی۔ یوں دہلی کے دبستان میں غزل کا رشتہ داخلیت، احساس کی سچائی اور زندگی کے کرب سے مضبوط ہوا۔

اسی زمانے میں لکھنؤ کا دبستان بھی اپنے رنگ کے ساتھ ابھرا۔ لکھنؤ میں تہذیبی نفاست، زبان کی آرائش، محفل داری، اور خارجی حسن کے عناصر زیادہ نمایاں ہوئے۔ یہ کہنا درست ہے کہ دہلی کی غزل میں ”دل“ کا دکھ زیادہ بولتا ہے اور لکھنؤ کی غزل میں ”اندازِ بیان“ کی چمک زیادہ دکھائی دیتی ہے، لیکن حقیقت میں دونوں نے مل کر اردو غزل کو مکمل کیا۔ دہلی نے غزل کو معنوی گہرائی دی اور لکھنؤ نے اس کے اظہار کو نفیس بنایا۔ اسی تعامل سے اردو غزل ایک ایسی صنف بنی جس میں سوز بھی ہے، ساز بھی؛ فکر بھی ہے، حسن بھی؛ اور زبان کی شائستگی بھی، تجربے کی سچائی بھی۔

انیسویں صدی کے آغاز کو بعض ناقدین نے اردو غزل کا ”انقلابی دور“ کہا، اس معنی میں کہ غزل کی روایت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ دہلی میں غالب، مومن اور ذوق جیسے بڑے نام سامنے آئے، اور لکھنؤ میں آتش اور ناسخ نے اپنے اپنے انداز سے غزل کی سمت کو متاثر کیا۔ غالب کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے غزل میں نئے مضامین، نئے فکری زاویے اور معنی آفرینی کے غیر معمولی طریقے پیدا کیے۔ ان کے یہاں عشق بھی ہے مگر وہ روایتی دائرے میں محدود نہیں؛ غم بھی ہے مگر وہ صرف رونے کا نام نہیں؛ اور فلسفہ بھی ہے مگر خشک بحث نہیں بن جاتا۔ غالب نے معمولی بات کو غیر معمولی انداز سے کہنے کا فن غزل میں اس درجہ نکھارا کہ بعد کی اردو شاعری اس کے اثر سے باہر نہیں رہ سکی۔ مومن کی غزل میں داخلی لطافت، محاورے کی چمک اور احساس کی نزاکت نظر آتی ہے، جب کہ ذوق کے یہاں زبان کی روانی، ضرب المثل جیسی صاف گوئی اور کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ لکھنؤ میں آتش نے غزل کو جذبات کی سچائی، زبان کی سادگی اور تاثیر کے ساتھ جوڑا، جبکہ ناسخ نے زبان کی اصلاح اور معیار بندی میں بڑا حصہ لیا، اگرچہ ناقدین نے ان کی شاعری پر مختلف آرا بھی قائم کیں۔ بہر حال اس دور میں غزل اپنے کلاسیکی سانچے کو برقرار رکھتے ہوئے فکر اور اسلوب کے نئے امکانات سے آشنا ہوئی۔

یہاں ایک بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ غزل کی مقبولیت کا بڑا سبب اس کی داخلی ساخت ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک مستقل اکائی ہوتا ہے، وہ اپنے اندر مکمل مفہوم رکھتا ہے، اسی لیے غزل مجلس، محفل اور مشاعرے میں فوراً اثر پیدا کرتی ہے۔ یہی خصوصیت اسے دوسری اصناف سے ممتاز کرتی ہے جہاں تسلسل خیال ضروری ہوتا ہے۔ البتہ یہ بھی درست ہے کہ بعض شعرا نے غزل میں ربط مضامین پیدا کر کے ”غزل مسلسل“ کی صورتیں بھی پیدا کیں، لیکن غزل کی بنیادی فطرت پھر بھی آزاد اور خود مختار شعروں کی صنف ہی رہی۔ اشعار کی تعداد کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ غزل کم از کم چند اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اور عموماً پانچ سے انیس اشعار کے اندر رہتی ہے، مگر روایت میں اس کی قطعی حدیں ہمیشہ سختی سے متعین نہیں رہیں؛ اصل چیز یہ ہے کہ مطلع، قافیہ، ردیف کا نظام اور بحر کی پابندی غزل کے بنیادی ارکان ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو غزل نئے عہد کے تقاضوں سے براہِ راست آشنا ہوئی۔ معاشرتی تبدیلیاں، سیاسی تحریکیں، نوآبادیاتی تجربہ، جنگ آزادی کے اثرات، اور نئی فکری لہریں ان سب نے غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ علامہ اقبال نے غزل کے کلاسیکی انداز سے آغاز کرتے ہوئے اسے خودی، ملت، عمل، اور قومی شعور کے موضوعات تک پہنچایا۔ اقبال کی غزل نے ثابت کیا کہ غزل محض ناز و ادا کی گفتگو نہیں بلکہ فکر کی

تہذیب بھی کر سکتی ہے۔ اسی زمانے میں جگر، فراق اور دیگر شعرا نے غزل میں انسانی نفسیات، جمالیاتی تجربے اور داخلی کرب کو نئے طریقے سے برتا۔ فراق کے یہاں رومان بھی ہے اور فکر بھی؛ روایت کی پاسداری بھی ہے اور جدید حسیت بھی۔ یوں غزل اپنی کلاسیکی روایت برقرار رکھتے ہوئے جدید ذہن کی ضرورتوں سے ہم قدم ہونے لگی۔

ترقی پسند تحریک کے دور میں غزل پر یہ اعتراض بھی ہوا کہ یہ صرف عشقیہ جذبات کی نمائندہ ہے، مگر عملاً غزل نے اپنے دامن کو مزید وسیع کیا۔ فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی جیسے شعرا نے غزل میں سیاسی شعور، اجتماعی دکھ، طبقاتی استحصال اور آزادی کی تڑپ کو شامل کیا۔ اس دور کی غزل میں احتجاج بھی ہے اور امید بھی، اور زبان کی لطافت کے ساتھ فکر کی گرمی بھی۔ یوں غزل نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے اندر زمانے کی دھڑکن کو سمیٹنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

بعد کے ادوار میں خصوصاً تقسیم ہند کے بعد غزل نے ہجرت، شناخت، تنہائی، شکستہ خوابوں، اور نئی شہری زندگی کے تجربات کو بھی اپنے اندر جذب کیا۔ اس مرحلے پر کچھ شعرا نے غزل کو بالکل سادہ، داخلی اور علامتی بنایا، کچھ نے اسے سیاسی اور سماجی حوالوں سے مزید با معنی کیا، اور کچھ نے روایت کے ساتھ ایک تخلیقی مکالمہ قائم رکھا۔ جدید غزل میں یہ پہلو نمایاں ہوا کہ اب عاشق و محبوب کی علامتیں محض رومان نہیں رہیں بلکہ انسان اور اس کے عہد کی علامتیں بھی بن گئیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غزل اپنی ”عصری معنویت“ کے ساتھ زندہ دکھائی دیتی ہے۔

غزل کی مقبولیت کے اسباب میں سب سے بنیادی سبب اس کی ہمہ گیری ہے۔ غزل میں عاشقانہ مضامین تو روایتی طور پر ہمیشہ رہے، مگر اس کے ساتھ زاہدانہ رنگ، صوفیانہ تاثر، فلسفیانہ سوالات، اور سماجی و سیاسی فکر بھی اپنے اپنے عہد میں شامل ہوتے رہے۔ اسی لیے غزل ہر طبقے کے دل کے قریب رہی۔ یہی بات رشید احمد صدیقی کے اس معروف خیال سے بھی جڑی ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، اور یہ بھی کہ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈھائی سو برس سے زیادہ کا سفر طے کرنے کے باوجود غزل آج بھی محفل، مجلس اور مشاعرہ میں اسی طرح زندہ ہے جیسے پہلے تھی، بلکہ نئے زمانے میں نئے موضوعات اور نئے لہجوں کے ساتھ اپنی تازگی بھی برقرار رکھتی ہے۔

یوں اردو غزل کا آغاز دکن کے تجربات، ولی دکنی کے فروغ، دہلی و لکھنؤ کے دبستانی ارتقاء، انیسویں صدی کی فکری و لسانی تبدیلی، اور بیسویں صدی کی عصری وسعتوں سے گزرتا ہوا ایک مسلسل زندہ روایت میں بدل گیا۔ اس روایت کی خاص بات یہ ہے کہ غزل نے نہ اپنی کلاسیکی بنیاد چھوڑی، نہ زمانے سے کٹ کر رہی؛ وہ روایت کے اندر رہتے ہوئے نئے معنی پیدا کرتی رہی۔ اسی مسلسل تجدید اور ہمہ گیر قبولیت نے غزل کو اردو شاعری کی سب سے مقبول اور دیر پا صنف بنا دیا۔

3.2.0 سرگرمی—آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیر طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے اردو غزل کے آغاز و ارتقا کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 3.8 سے رجوع کریں۔

- 1- اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد _____ میں پڑتی ہے۔
- 2- اردو غزل کو باضابطہ فروغ دینے والے شاعر _____ کہلاتے ہیں۔
- 3- ولی دکنی کی _____ آمد اردو غزل کے فروغ میں فیصلہ کن موڑ سمجھی جاتی ہے۔
- 4- میر تقی میر کو غزل میں _____ اور سوز کا شاعر کہا جاتا ہے۔
- 5- دبستان لکھنؤ میں زبان کی _____ اور اظہار کی آرائش نمایاں ہے۔

3.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں اردو غزل کے آغاز اور ارتقا کا تاریخی و فکری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں غزل کے تہذیبی و لسانی پس منظر کو واضح کیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ صنف ایک تدریجی عمل کے تحت تشکیل پاتی ہے۔ پھر دکن میں اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد، دکنی شاعری کی سادگی اور مقامی رنگ، اور ولی دکنی کے ذریعے غزل کے فروغ کو نمایاں کیا گیا۔

سبق میں دہلی کے دبستان کے ”سنہری دور“ کا ذکر بھی شامل ہے، جہاں میر، سودا اور درد نے غزل کو داخلیت، فکری گہرائی اور صوفیانہ رنگ عطا کیا۔ ساتھ ہی لکھنؤ کے دبستان کی نفاست زبان اور اسلوبی آرائش کو بھی بیان کیا گیا۔ انیسویں صدی میں غالب کے ذریعے غزل میں معنی آفرینی اور فکری جہتوں کے اضافہ، اور بیسویں صدی میں جدید موضوعات کی وسعت کو بھی واضح کیا گیا۔ مجموعی طور پر یہ سبق بتاتا ہے کہ اردو غزل نے روایت کی بنیاد برقرار رکھتے ہوئے ہر دور میں نئے معنی اور نئے موضوعات پیدا کیے، اسی لیے یہ صنف آج بھی زندہ اور مقبول ہے۔

3.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے آپ نے جانا کہ اردو غزل کا آغاز کسی ایک لمحے میں نہیں ہوا بلکہ یہ ایک تاریخی اور تہذیبی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ آپ نے یہ سمجھا کہ دکن اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد کا اہم مرکز ہے اور ولی دکنی نے غزل کو ایسا لہجہ دیا جس سے اس کا فروغ شمالی ہند میں ممکن ہوا۔ آپ نے دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی خصوصیات بھی سمجھیں دہلی میں داخلیت، سوز اور فکری گہرائی اور لکھنؤ میں نفاست زبان اور اسلوبی آرائش۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ غالب کے دور میں غزل نے فکر اور معنی آفرینی کے نئے امکانات پیدا کیے اور بیسویں صدی میں اقبال و فیض وغیرہ

کے ذریعے موضوعات میں سماجی، قومی اور سیاسی وسعت پیدا ہوئی۔ یوں آپ اردو غزل کو ایک مسلسل زندہ روایت کے طور پر سمجھنے کے قابل ہوئے۔

3.5 فرہنگ

۱۔ آغاز	ابتدا
۲۔ ارتقا	تدریجی ترقی
۳۔ ہجرت	نقل مکانی
۴۔ لسانی پس منظر	زبان کی تاریخی بنیاد
۵۔ ریختہ	اردو کی ابتدائی شعری زبان
۶۔ دکن	اردو کی ابتدائی ادبی سرگرمیوں کا اہم خطہ
۷۔ معنی آفرینی	نئے نئے معانی پیدا کرنے کی صلاحیت
۸۔ داخلیت	باطنی کیفیات کا غلبہ
۹۔ دبستان	ادبی مکتب یا مروجہ انداز
۱۰۔ دبستانِ دہلی	داخلیت اور سوز والا مکتب
۱۱۔ دبستانِ لکھنؤ	زبان کی نفاست اور آرائش والا مکتب
۱۲۔ ایہام گوئی	دو معنی پیدا کرنے والا اسلوب
۱۳۔ سنہری دور	غزل کا کلاسیکی عروج
۱۴۔ صوفیانہ فکر	روحانی اور عرفانی رجحان

3.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ اردو غزل کی باقاعدہ بنیاد کس خطے میں پڑی؟

2۔ ولی دکنی کی دہلی آمد کو فیصلہ کن موڑ کیوں کہا جاتا ہے؟

3۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

4۔ غالب نے غزل میں کون سے نئے فکری امکانات پیدا کیے؟

3.7 مشقی سوالات

- 1- اردو غزل کے آغاز کے بارے میں روشنی ڈالیے۔
- 2- دکنی دور اور ولی دکنی کے کردار پر نوٹ لکھیے۔
- 3- دہلی کے ”سنہری دور“ کے نمایاں شعرا اور ان کی خصوصیات لکھئے۔
- 4- دبستانِ لکھنؤ کی اہم خصوصیات اور خدمات بیان کیجیے۔

3.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

- 1- اردو غزل کے آغاز کے بارے میں روشنی ڈالیے۔

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ غزل کا آغاز عربی شاعری سے ہوا، جہاں یہ قصیدے کے ابتدائی حصے کی صورت میں موجود تھی۔ بعد ازاں فارسی شاعری میں غزل نے مستقل صنف کی حیثیت اختیار کی اور عشق، محبت، تصوف اور انسانی جذبات کے اظہار کا اہم ذریعہ بنی۔ برصغیر میں اردو غزل کی بنیاد دکن میں پڑی۔ ابتدائی دکنی شعرا نے مقامی زبان اور تہذیب کے اثرات کے ساتھ غزل کو فروغ دیا۔ دکن کے شعرا نے عشق، حسن، مذہبی جذبات اور روزمرہ زندگی کے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ بعد میں ولی دکنی نے اردو غزل کو دہلی میں متعارف کرایا، جس کے نتیجے میں اردو غزل کو نئی وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے غزل کو فنی اعتبار سے ترقی دی اور اسے اردو ادب کی سب سے اہم صنف بنا دیا۔ میر، سودا، غالب، مومن اور ذوق جیسے شعرا نے غزل کے فکری اور فنی دائرے کو وسیع کیا۔ یوں اردو غزل مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے ایک مکمل اور ترقی یافتہ صنفِ ادب بن گئی۔
- 2- دکنی دور اور ولی دکنی کے کردار پر نوٹ لکھیے۔

اردو ادب کا دکنی دور اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ابتدائی اور نہایت اہم دور ہے۔ اس دور میں دکن کے مختلف علاقوں، خصوصاً گوالکنڈہ اور بیجاپور میں اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ دکنی شعرا نے اردو شاعری کو ابتدائی بنیادیں فراہم کیں اور اسے عوامی زبان سے ادبی زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ دکنی دور کے نمایاں شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور وجہی شامل ہیں۔ ان شعرا نے مقامی تہذیب، ثقافت اور زبان کے عناصر کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔

ولی دکنی اردو غزل کے اولین شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو فنی پختگی عطا کی اور اسے دہلی تک پہنچایا۔ جب ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے فارسی گو شعرا اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ولی نے فارسی غزل کی لطافت اور حسن کو اردو زبان میں منتقل کیا اور اردو غزل کو ایک مضبوط ادبی بنیاد فراہم کی۔ ان کی خدمات اردو غزل کی ترقی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

3۔ دہلی کے ”سنہری دور“ کے نمایاں شعرا اور ان کی خصوصیات لکھیے۔

اردو غزل کا سنہری دور دہلی میں اٹھارویں صدی کے دوران سامنے آیا۔ اس دور میں اردو غزل نے فکری اور فنی اعتبار سے بے مثال ترقی کی۔ دہلی کے دبستان نے اردو شاعری کو سادگی، سوز و گداز، داخلی کیفیت اور فکری گہرائی عطا کی۔

اس دور کے نمایاں شعرا میں میر تقی میر، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، شیخ ابراہیم ذوق، مومن خان مومن اور مرزا غالب شامل ہیں۔ میر تقی میر کو ”خدائے سخن“ کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں درد، غم، عشق اور انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ خواجہ میر درد کی شاعری تصوف اور روحانیت سے بھرپور ہے۔ سودا نے قصیدہ نگاری اور بھونگاری میں شہرت حاصل کی۔ مومن کی شاعری نازک خیالی اور عشق کی لطیف کیفیات کی ترجمان ہے۔ ذوق نے زبان و بیان کی صفائی اور فصاحت کو فروغ دیا جبکہ غالب نے فلسفیانہ فکر، جدت خیال اور معنوی گہرائی کے ذریعے اردو غزل کو نئی وسعت عطا کی۔ دہلی کے اس سنہری دور نے اردو غزل کی فنی روایت کو مستحکم کیا اور بعد کے شعرا کے لیے راہیں ہموار کیں۔

4۔ دبستانِ لکھنؤ کی اہم خصوصیات اور خدمات بیان کیجیے۔

دبستانِ لکھنؤ اردو ادب کا ایک اہم ادبی دبستان ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں لکھنؤ کے تہذیبی ماحول میں پروان چڑھا۔ اس دبستان نے اردو غزل کو رنگینی، لطافت، نزاکت اور حسن بیان سے مالا مال کیا۔ دبستانِ لکھنؤ کے نمایاں شعرا میں آتش، ناسخ، انشاء، مصحفی اور جرأت شامل ہیں۔ ان شعرا نے زبان کی صفائی، محاورے کی درستی اور شعری صنعتوں کے استعمال پر خصوصی توجہ دی۔ لکھنؤ کی شاعری میں حسن و عشق، محبوب کی ادائیں، نزاکت، نفاست اور خارجی حسن کی عکاسی نمایاں طور پر ملتی ہے۔ اس دبستان کے شعرا نے غزل میں زبان و بیان کی خوبصورتی اور شعری آرائش کو فروغ دیا۔ محاورات اور روزمرہ زبان کے درست استعمال نے اردو زبان کو استحکام بخشا۔ دبستانِ لکھنؤ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کو تہذیبی لطافت، لسانی نفاست اور فنی حسن عطا کیا۔ اردو غزل کی ترقی میں اس دبستان کا کردار نہایت اہم اور ناقابل فراموش ہے۔

3.8 جوابات سرگرمی

- 1۔ دکن
- 2۔ ولی دکنی
- 3۔ دہلی
- 4۔ غم کی داخلیت
- 5۔ نفاست

3.9 امدادی کتب

- ۱۔ اُردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خان
- ۲۔ غزل اور مطالعہ غزل ڈاکٹر عبادت بریلوی
- ۳۔ اردو شاعری کا فنی ارتقا ڈاکٹر فرمان فتح پوری
- ۴۔ اردو غزل کے اہم موڈ شمس الرحمان فاروقی
- ۵۔ اردو شاعری پر ایک نظر کلیم الدین احمد
- ۶۔ اُردو کی عشقیہ شاعری فراق گور کھپوری
- ۷۔ جدید غزل رشید احمد صدیقی
- ۸۔ اکیسویں صدی میں اُردو شعریات پروفیسر قدوس جاوید
- ۹۔ اردو غزل کا تاریخی ارتقا غلام آسی رشیدی
- ۱۰۔ اردو غزل اور اس کی نشوونما سید رفیق حسین
- ۱۱۔ اٹھارویں صدی میں اردو غزل کا فکری نظام محمد زاہد الحق
- ۱۲۔ اُردو غزل، فن اور فنکار۔ (اُردو غزل کا نیا انتخاب) ڈاکٹر فرحت شمیم

سبق نمبر ۴۔ غزل کا ابتدائی دور

ساخت

- 4.0 اغراض و مقاصد
- 4.1 تعارف
- 4.2 غزل کا ابتدائی دور
- 4.2.0 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 4.3 عمومی جائزہ
- 4.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 4.5 فرہنگ
- 4.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 4.7 مشقی سوالات
- 4.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 4.8 جوابات سر گرمی
- 4.9 امدادی کتب

4.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کا مقصد اردو غزل کی ابتدا، ارتقا اور اس کی ادبی روایت کو واضح کرنا ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے اردو غزل کے تاریخی پس منظر اور اس کے ابتدائی نقوش کا علم حاصل ہوگا۔ اردو غزل کے اولین شعر اور ان کی ادبی خدمات سے واقفیت پیدا ہوگی۔ شمالی ہند اور دکن میں غزل کے فروغ اور ارتقا کے مختلف مراحل کا جائزہ لینے کا موقع ملے گا۔ دکنی غزل کی اہم خصوصیات، رجحانات اور فنی و فکری جہات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی اور دیگر دکنی شعرا کی ادبی خدمات کا مطالعہ کیا جاسکے گا۔ ولی دکنی کی شعری عظمت اور کلاسیکی اردو غزل کی تشکیل میں ان کے کردار کو سمجھنا ممکن ہوگا۔ اردو غزل کے موضوعات، اسالیب اور شعری روایات کے ارتقائی سفر کا ادراک حاصل ہوگا اور غزل کی فنی و جمالیاتی خصوصیات کا تنقیدی مطالعہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

4.1 تعارف

اردو غزل اردو ادب کی سب سے مقبول اور مؤثر صنفِ سخن ہے۔ یہ صنف صدیوں کے ارتقائی سفر سے گزر کر اپنی موجودہ صورت تک پہنچی ہے۔ اردو غزل کی ابتدا کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں، تاہم عموماً امیر خسرو کو اردو غزل کا پہلا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے بعد شمالی ہند میں غزل کے چند ابتدائی نمونے ضرور ملتے ہیں، لیکن اس دور میں غزل کی کوئی باقاعدہ اور منظم روایت موجود نہیں تھی۔ اردو غزل کی حقیقی نشوونما دکن میں ہوئی، جہاں اسے سازگار ادبی اور تہذیبی ماحول میسر آیا۔ بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں دکنی شعرا نے غزل کو فکری اور فنی اعتبار سے وسعت عطا کی۔ مقامی تہذیب، ثقافت، رسوم و رواج اور انسانی جذبات کو غزل کا حصہ بنا کر اس صنف کو نئی جہتیں فراہم کی گئیں۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی، نصرتی اور حسن شوقی جیسے شعرا نے اردو غزل کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اس کے دائرہ اظہار کو وسیع بنایا۔

اردو غزل کے ارتقا میں ولی دکنی کی خدمات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے دکنی روایت اور فارسی شعریات کے حسین امتزاج سے اردو غزل کو ایک نیا اسلوب، نئی زبان اور نئی فکری وسعت عطا کی۔ ان کے ذریعے اردو غزل ایک منظم اور مستحکم ادبی روایت کی صورت اختیار کر گئی، جسے بعد میں میر، سودا، درد اور غالب جیسے عظیم شعرا نے مزید جلا بخشی۔

اس سبق میں اردو غزل کی ابتدا، اس کے تاریخی ارتقا، دکن اور شمالی ہند کے شعری رجحانات، اہم غزل گو شعرا کی خدمات اور کلاسیکی اردو غزل کی تشکیل کے مختلف مراحل کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

4.2 غزل کا ابتدائی دور

اردو غزل کی ابتدا کے سوال کا کوئی سادہ اور قطعی جواب دینا آسان نہیں ہے، کیونکہ اس کا ارتقا ایک تدریجی عمل کے تحت ہوا۔ تاہم عمومی طور پر امیر خسرو کو اردو کا پہلا غزل گو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نسبت کی بنیاد ان کی ایک مشہور غزل پر ہے،

زحالی مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تاب ہجراں ندام اے جاں نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں

جو سب سے پہلے 1880ء میں کتاب آپ حیات میں شائع ہوئی، جبکہ اس کا ذکر اس سے پہلے 1852ء میں بھی ملتا ہے۔ اسی غزل کو اردو غزل کے ابتدائی نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو کے بعد شمالی ہند میں تقریباً تین صدیوں تک غزل کے صرف چند منتشر نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً

ہر لحظہ آید دردِ لم دیکھوں او سے ٹک جائے کر

گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیولائے کر

(امیر حسن دہلوی)

ان ابتدائی غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہندی اور فارسی الفاظ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، جو اردو زبان کی تشکیل کے عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس دور میں امیر حسن دہلوی، شیخ جمالی اور دیگر شعرا نے بھی ریختہ میں شاعری کی، لیکن ابھی تک غزل کی کوئی باقاعدہ روایت یا اصول مرتب نہیں ہوئے تھے۔

اردو غزل کی حقیقی نشوونما دکن میں ہوئی۔ شمالی ہند سے نکل کر اردو جب دکن پہنچی تو اسے وہاں سیاسی استحکام، تہذیبی رنگارنگی اور سرکاری سرپرستی میسر آئی۔ بہمنی دور (1350ء تا 1525ء) میں اردو زبان و ادب نے نمایاں ترقی کی۔ مشتاق بیدری اور لطفی کی شاعری میں دکنی غزل کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔

بعد ازاں قطب شاہی دور میں اردو غزل کو ایک نئی توانائی ملی۔ ابراہیم قطب شاہ اور خصوصاً محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں گو لکنڈہ علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ اس کے دیوان میں ہزاروں اشعار موجود ہیں اور اس کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب، مقامی رسوم و رواج، تہواروں اور معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

اس دور کی غزل کی چند نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

- زبان میں سادگی، روانی اور برجستگی۔
- حقیقت نگاری اور مشاہداتی انداز۔
- ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے گہرا تعلق۔
- محبوب کا حقیقی اور زمینی تصور۔
- مقامی تشبیہوں اور استعارات کا استعمال۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی، نصرتی اور دیگر شعرا نے غزل کو مزید وسعت دی۔ خاص طور پر غواصی نے اخلاقی اور روحانی موضوعات کو غزل میں شامل کر کے اس کے دائرہ اظہار کو وسیع کیا۔

کلاسیکی اردو غزل کی تشکیل

دکن میں غزل بتدریج ارتقا کے مراحل طے کرتی رہی۔ فارسی اثرات بڑھتے گئے، قافیہ اور ردیف کی پابندی مضبوط ہوئی اور غزل مثنوی کے طویل بیانیہ انداز سے آزاد ہونے لگی۔ حسن و عشق، تصوف، اخلاقیات، زاہد و ناصح پر طنز اور معاشرتی زندگی جیسے موضوعات غزل میں شامل ہو گئے۔

سترہویں صدی کے اواخر میں ولی دکن کی آمد اردو غزل کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ 1700ء کے قریب ان کے دہلی کے سفر اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات نے ان کے شعری رجحانات کو نئی سمت عطا کی۔ ولی نے دکنی روایت اور فارسی شعریات کے درمیان ایک ایسا حسین امتزاج پیدا کیا جس نے کلاسیکی اردو غزل کی بنیاد رکھ دی۔

ولی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے فارسی محور، اوزان اور اسالیب کو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی شاعری میں زبان کی صفائی، خیال کی پاکیزگی، عشق کی لطافت اور داخلی کیفیات کا اظہار نمایاں طور پر ملتا ہے۔ انہوں نے غزل کو محض حسن و عشق کی داستان سے نکال کر انسانی جذبات، روحانی تجربات اور زندگی کے متنوع احساسات کا آئینہ بنادیا۔ ان کے اشعار میں عشق کی لطافت اور پاکیزگی ملاحظہ ہو:

شغل	بہتر	ہے	عشق	بازی	کا
کیا	حقیقی	و	کیا	مجازی	کا
عشق	کی	راہ	کے	مسافر	کو
ہر	قدم	تجھ	گلی	میں	منزل
					ہے

ولی کے یہاں محبوب محض جسمانی کشش کا مرکز نہیں بلکہ حسن، وقار اور روحانی کشش کا پیکر ہے۔ یہی خصوصیت انہیں اپنے پیش رو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

4.2.0 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیر طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے اردو غزل کے ابتدائی دور کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 4.8 سے رجوع کریں۔

1. اردو غزل کے اولین شاعر کے طور پر عموماً _____ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

2. "زحالی مسکین مکن تغافل" _____ کی مشہور غزل ہے۔
3. دکن میں اردو غزل کے پہلے صاحب دیوان شاعر _____ تھے۔
4. ولی دکنی نے اردو غزل کو _____ روایت سے جوڑا۔
5. دکنی غزل میں ہندوستانی تہذیب اور _____ کے اثرات نمایاں ہیں۔
6. "پند" کے مقابلے میں غزل میں اکثر _____ کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔

4.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں اردو غزل کی ابتدا اور اس کے ارتقائی سفر کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا۔ ابتدا میں امیر خسرو اور ان کے عہد کی شعری روایت کا جائزہ لیا گیا اور یہ دیکھا گیا کہ اردو غزل کے ابتدائی نقوش کس طرح فارسی اور ہندوی عناصر کے امتزاج سے وجود میں آئے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں غزل کے ابتدائی نمونوں اور ان شعر کا ذکر کیا گیا جنہوں نے اردو زبان کی تشکیل اور غزل کی روایت کے فروغ میں حصہ لیا۔ سبق میں دکن کی ادبی فضا اور وہاں غزل کے ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی اور دیگر دکنی شعرا کی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا۔ دکنی غزل کی سادگی، مقامی رنگ، تہذیبی شعور اور ہندوستانی معاشرتی عناصر کی نشاندہی کی گئی۔ آخر میں ولی دکنی کے کردار کو واضح کیا گیا جنہوں نے دکنی اور فارسی روایات کے امتزاج سے کلاسیکی اردو غزل کی بنیاد مستحکم کی اور اردو غزل کو ایک منظم ادبی روایت کی شکل عطا کی۔

4.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ اردو غزل کی ابتدا اور اس کے ارتقائی سفر کو سمجھنے کے قابل ہوئے۔ آپ نے جانا کہ اردو غزل کس طرح مختلف تاریخی، تہذیبی اور لسانی مراحل سے گزرتے ہوئے ایک مکمل اور مقبول ادبی صنف کی صورت میں سامنے آئی۔ آپ نے امیر خسرو اور دیگر ابتدائی غزل گو شعرا کی خدمات کا مطالعہ کیا اور یہ سمجھا کہ اردو غزل کے ابتدائی نقوش فارسی اور ہندوی روایات کے امتزاج سے وجود میں آئے۔ اس کے علاوہ آپ نے شمالی ہند اور دکن میں غزل کے فروغ کے مختلف مراحل کا تقابلی جائزہ بھی حاصل کیا۔ اس سبق کے ذریعے آپ دکنی غزل کی اہم خصوصیات، اس کے موضوعات، زبان و بیان اور ادبی رجحانات سے واقف ہوئے۔ آپ نے یہ بھی سیکھا کہ دکن کے شعرا نے اردو غزل کو مقامی رنگ، تہذیبی شعور اور فکری وسعت عطا کی۔ آپ نے محمد قلی قطب شاہ، غواصی، حسن شوقی اور دیگر دکنی شعرا کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا اور ان کے اردو غزل کی ترقی میں کردار کو سمجھا۔ ساتھ ہی آپ نے ولی دکنی کی ادبی عظمت اور اردو غزل کی کلاسیکی روایت کے استحکام میں ان کی نمایاں خدمات سے آگاہی حاصل کی۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ یہ بھی جان سکے کہ اردو غزل کی تشکیل و ترقی میں فارسی اور ہندوستانی تہذیبی و ادبی اثرات کس طرح کار فرما رہے اور ان دونوں روایتوں کے حسین امتزاج نے اردو غزل کو ایک منفرد شناخت عطا کی۔

مختصراً، اس سبق نے آپ کو اردو غزل کی ابتدا، ارتقاء، دکنی دور کی ادبی خدمات، ولی دکنی کے کردار اور اردو غزل کی فکری و فنی روایت کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔

4.5 فرہنگ

لفظ	معنی
تغافل	بے توجہی
ہجراں	جدائی
ریختہ	اردو زبان کی ابتدائی شکل
صنم	محبوب
پند	نصیحت
سوز و گداز	درد و اثر انگیزی
سراپانگاری	محبوب کے حسن کا تفصیلی بیان
خارجیت	خارجی حالات و واقعات کا بیان
داخلیت	باطنی احساسات اور جذبات کا اظہار
اجتہاد	نئی راہ نکالنا، جدت پیدا کرنا

4.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. اردو غزل کا اولین شاعر کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

2. دکن میں اردو غزل کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے۔

3. محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں کی دو نمایاں خصوصیات لکھیے۔

4. غواصی نے اردو غزل میں کیا نئی جہت پیدا کی؟

5. ولی دکنی کو اردو غزل کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہے؟

4.7 مشقی سوالات

1. اردو غزل کی ابتدا اور ارتقا کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. دکن میں اردو غزل کی روایت اور اس کے اہم رجحانات پر روشنی ڈالیے۔
3. محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
4. غواصی اور حسن شوقی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
5. ولی دکنی کے ادبی کارناموں اور کلاسیکی اردو غزل کی تشکیل میں ان کے کردار پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

4.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1- اردو غزل کی ابتدا اور ارتقا کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

اردو غزل کی ابتدا عموماً امیر خسرو سے منسوب کی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں فارسی اور ہندوی زبان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور میں غزل کی کوئی واضح روایت موجود نہیں تھی، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ اس صنف نے ترقی کی منازل طے کیں۔ شمالی ہند میں چند ابتدائی شعرا کے بعد دکن میں غزل کو باقاعدہ فروغ حاصل ہوا۔ دکنی شعرا نے مقامی تہذیب اور زبان کے عناصر شامل کر کے غزل کو نئی وسعت عطا کی۔ ولی دکنی کے عہد میں غزل نے ایک منظم کلاسیکی روایت کی شکل اختیار کر لی۔

2- دکن میں اردو غزل کی روایت اور اس کے اہم رجحانات پر روشنی ڈالیے۔

دکن اردو غزل کی نشوونما کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں کی غزل میں مقامی تہذیب، ہندستانی رسم و رواج، سادگی بیان اور حقیقت نگاری نمایاں ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی اور حسن شوقی جیسے شعرا نے غزل کو نئے موضوعات اور اسالیب عطا کیے۔ دکنی غزل میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی اور روحانی عناصر بھی شامل ہیں۔

3۔ محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں سادگی، روانی، مقامی رنگ اور حقیقت نگاری نمایاں ہے۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب، تہواروں اور رسوم و رواج کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے محبوب کا تصور بھی مقامی اور حقیقی نوعیت کا ہے۔

4۔ غواصی اور حسن شوقی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

غواصی نے اردو غزل میں اخلاقی اور روحانی مضامین شامل کر کے اس کے موضوعاتی دائرے کو وسیع کیا۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ حسن شوقی نے فارسی طرز شاعری سے استفادہ کرتے ہوئے غزل میں عشق، حسن اور تصوف کے مضامین کو فروغ دیا اور غزل کی فنی روایت کو مضبوط کیا۔

5۔ ولی دکنی کے ادبی کارناموں اور کلاسیکی اردو غزل کی تشکیل میں ان کے کردار پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

ولی دکنی اردو غزل کے سب سے اہم معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے دکنی اور فارسی شعری روایات کو یکجا کر کے اردو غزل کو ایک نیا اسلوب اور نئی زبان عطا کی۔ ان کی شاعری میں عشق، تصوف، حسن اور انسانی جذبات کا نہایت لطیف اظہار ملتا ہے۔ ولی نے غزل کو داخلیت، ایجاز، تہہ داری اور شعری رمزیت سے آشنا کیا۔ ان کی قائم کردہ روایت بعد میں کلاسیکی اردو غزل کی بنیاد بنی جسے میر، سودا اور غالب نے مزید ترقی دی۔

4.8 جوابات سرگرمی

1. امیر خسرو
2. امیر خسرو
3. محمد قلی قطب شاہ
4. فارسی
5. مقامی ثقافت
6. عشق

4.9 امدادی کتب

1. دلی گجراتی پروفیسر محی الدین
2. دلی اورنگ آبادی عبادت بریلوی
3. کلیات محمد قلی قطب شاہ نور الحسن ہاشمی
4. کلیات غواصی پروفیسر محمد بن عمر

سبق نمبر ۵۔ شمالی ہند میں اُردو غزل کی ابتداء

ساخت

- | | |
|-------|------------------------------------|
| 5.0 | اغراض و مقاصد |
| 5.1 | تعارف |
| 5.2 | شمالی ہند میں اُردو غزل کی ابتداء |
| 5.2.0 | سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں |
| 5.3 | عمومی جائزہ |
| 5.4 | آپ نے کیا سیکھا؟ |
| 5.5 | فرہنگ |
| 5.6 | نمونہ برائے امتحانی سوالات |
| 5.7 | مشقی سوالات |
| 5.7.0 | مشقی سوالات کے جوابات |
| 5.8 | جوابات سر گرمی |
| 5.9 | امدادی کتب |

5.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ شمالی ہند میں اردو غزل کی ابتدا اور اس کے ارتقائی سفر کو سمجھ سکیں گے۔ آپ اردو غزل کے فروغ میں ولی دکنی کے کردار اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔ آپ شمالی ہند کے ابتدائی غزل گو شعرا اور ان کی شعری خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔ آپ ایہام گوئی کے رجحان اور اردو غزل پر اس کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔ آپ میر، سودا، درد اور سوز جیسے اہم شعرا کی ادبی خدمات اور اردو غزل کی ترقی میں ان کے کردار کا مطالعہ کر سکیں گے۔ آپ دہلی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز کی اہمیت اور اردو غزل کے ارتقا میں ان کے اثرات کو جان سکیں گے۔ اس کے علاوہ آپ غالب، مومن، ناسخ اور آتش جیسے شعرا کی شعری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اردو غزل کی فکری اور فنی ترقی کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

5.1 تعارف

اردو غزل اردو ادب کی مقبول ترین اور اہم ترین صنفِ سخن ہے۔ اس کی ابتدا اور ارتقا کا مطالعہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز دکن میں ہوا اور وہیں اس نے ابتدائی ترقی کے مراحل طے کیے، لیکن شمالی ہند نے بھی اردو غزل کی تشکیل، فروغ اور استحکام میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دکن سے آنے والی ادبی روایت جب شمالی ہند پہنچی تو اسے یہاں ایک نئی فکری، تہذیبی اور لسانی فضا میسر آئی جس کے نتیجے میں اردو غزل نے تیزی سے ترقی کی۔

شمالی ہند میں اردو غزل کے فروغ کا اہم موڑ ولی دکنی کی دہلی آمد کو قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری نے اہل دہلی کو اردو زبان کی ادبی صلاحیتوں سے روشناس کرایا اور بہت سے شعرا کو اردو میں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ اس کے بعد اردو غزل کی ایک مضبوط روایت وجود میں آئی جسے مختلف شعرا نے اپنے اپنے انداز میں آگے بڑھایا۔ ابتدائی دور میں آرزو، آبرو، ناجی اور مضمون جیسے شعرا نے اس روایت کی بنیادوں کو مضبوط کیا، جبکہ بعد کے دور میں میر، سودا، درد اور سوز نے اردو غزل کو فنی پختگی، فکری وسعت اور جذباتی گہرائی عطا کی۔

بعد ازاں دہلی اور لکھنؤ اردو شاعری کے دو بڑے مراکز بن کر ابھرے۔ ان مراکز سے وابستہ شعرا نے اردو غزل کو نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ خصوصاً غالب، مومن، ذوق، ناسخ اور آتش نے اردو غزل کو ایسی فکری اور فنی بلندیوں تک پہنچایا جن کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اس سبق میں آپ شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت، اس کے اہم شعرا، مختلف ادوار اور نمایاں رجحانات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

5.2 شمالی ہند میں اردو غزل کی ابتداء

شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت ایک طویل ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ اردو شاعری کی باقاعدہ نشوونما دکن میں ہوئی، لیکن شمالی ہند میں بھی اردو زبان اور شاعری کے ابتدائی نقوش بہت پہلے سے موجود تھے۔ امیر خسرو کو اردو غزل کا اولین شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں فارسی اور ہندوئی زبان کا امتزاج پایا جاتا ہے، جس سے اردو زبان کی ابتدائی صورت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان

کے بعد افضل پانی پتی، جعفر زٹلی اور بعض دیگر شعرا نے اردو شاعری کے ابتدائی نمونے پیش کیے، لیکن ان کوششوں سے کوئی مضبوط شاعری روایت قائم نہ ہو سکی۔ شمالی ہند میں اردو غزل کی باقاعدہ روایت کا آغاز اٹھارویں صدی کے اوائل میں ہوا، جب ولی دکنی دہلی آئے۔ اس وقت تک دہلی میں فارسی زبان علمی، ادبی اور درباری زبان کی حیثیت رکھتی تھی جبکہ اردو کو عوامی بول چال کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ ولی دکنی کی شاعری نے اہل دہلی کو پہلی مرتبہ یہ احساس دلایا کہ اردو بھی اعلیٰ ادبی اظہار کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ ان کے دیوان کی مقبولیت نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ولی دکنی کے اثرات کے نتیجے میں سراج الدین علی خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی اور مضمون جیسے شعرا نے اردو غزل کی طرف توجہ دی۔ ان شعرا کی شاعری میں ایہام گوئی کا رجحان نمایاں تھا۔ ایہام ایسی شاعری صنعت ہے جس میں ایک لفظ کے بیک وقت دو یا زیادہ معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ اس دور میں شعر ایہام کو فنی کمال سمجھتے تھے، لیکن اس کے نتیجے میں شاعری پیچیدہ اور بعض اوقات مبہم ہو جاتی تھی۔

ابتدائی دور کے بعد اردو غزل کی روایت میں ایک اہم تبدیلی اس وقت آئی جب ظہور الدین حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں نے ایہام گوئی کی مخالفت کی۔ انہوں نے سادہ، صاف اور بامعنی شاعری کی حمایت کی اور اردو غزل کو تصنع اور لفظی پیچیدگیوں سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ ان کی کوششوں سے اردو غزل میں سادگی، روانی اور فکری گہرائی پیدا ہوئی۔ شمالی ہند میں اردو غزل کا سنہری دور میر تقی میر، خواجہ میر درد، محمد رفیع سودا اور محمد میر سوز کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ان شعرا نے اردو غزل کو فنی اعتبار سے پختگی عطا کی۔ میر تقی میر نے ذاتی تجربات، انسانی احساسات، درد، محرومی اور عشق کے موضوعات کو بے مثال سادگی اور اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی شاعری میں جذبات کی سچائی اور داخلی کیفیت کا اظہار اپنی مثال آپ ہے، اسی لیے انہیں "خدائے سخن" کہا جاتا ہے۔ خواجہ میر درد نے اردو غزل میں تصوف اور روحانیت کے عناصر کو فروغ دیا۔ ان کی شاعری عشق حقیقی، معرفت اور باطنی تجربات کی ترجمان ہے۔ محمد رفیع سودا نے غزل کے ساتھ ساتھ قصیدہ نگاری میں بھی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ ان کی شاعری زبان کی قوت، بلند آہنگی اور فنی مہارت کا بہترین نمونہ ہے۔ محمد میر سوز نے سادہ اور خالص اردو زبان میں شاعری کر کے غزل کو عام فہم اور دلکش بنایا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں دہلی کے سیاسی حالات خراب ہونے لگے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے نتیجے میں بہت سے شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ اس ہجرت نے اردو شاعری کے ایک نئے مرکز کو جنم دیا۔ لکھنؤ میں انشا، جرات اور مصحفی نے اردو غزل کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان شعرا نے زبان کی لطافت، محاورے کی صفائی اور عشقیہ مضامین کی رنگینی پر خصوصی توجہ دی۔ انیسویں صدی میں دہلی میں دوبارہ ادبی سرگرمیاں بحال ہوئیں تو شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرزا غالب، مومن خاں مومن اور بہادر شاہ ظفر نے اردو غزل کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ذوق نے زبان و بیان کی شائستگی کو فروغ دیا، مومن نے عشق و محبت کے مضامین کو دلکش انداز میں پیش کیا، جبکہ غالب نے اردو غزل میں فلسفہ، فکر، تخیل اور معنوی گہرائی پیدا کی۔ غالب کی شاعری نے اردو غزل کو ایک نئی فکری وسعت عطا کی اور اسے عالمی ادبیات کے معیار تک پہنچایا۔ اسی زمانے میں لکھنؤ میں ناسخ اور آتش نے زبان کی اصلاح اور شاعری اسلوب کی تہذیب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ناسخ نے اردو زبان کے قواعد، محاورات اور لفظیات کو منظم کیا جبکہ آتش نے جذبات کی صداقت اور زبان کی

دلکشی کو فروغ دیا۔ اس طرح شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت ولی دکنی کے اثرات سے شروع ہو کر میر، درد، سودا، غالب، مومن، ناسخ اور آتش جیسے عظیم شعرا کے ذریعے مسلسل ترقی کرتی رہی۔ اس روایت نے اردو غزل کو فنی پختگی، فکری وسعت، جذباتی گہرائی اور لسانی حسن عطا کیا اور اردو ادب کی سب سے مقبول اور مؤثر صنف کی حیثیت دلائی۔

5.2.0 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

خالی جگہوں کو پُر کیجئے۔

1. شمالی ہند میں اردو غزل کے فروغ کا سب سے اہم محرک _____ دکنی تھے۔
2. اردو غزل کا پہلا غزل گو شاعر عموماً _____ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔
3. ایہام گوئی سے مراد _____ معنی والے الفاظ کا استعمال ہے۔
4. مرزا مظہر جانِ جاناں نے اردو شاعری کو _____ گوئی سے پاک کرنے کی کوشش کی۔
5. میر تقی میر کو اردو شاعری میں _____ کہا جاتا ہے۔
6. خواجہ میر درد کی شاعری میں _____ کارنگ نمایاں ہے۔

5.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں آپ نے شمالی ہند میں اردو غزل کی ابتدا، ارتقا اور مختلف ادوار کا مطالعہ کیا۔ آپ نے جاننا کہ اگرچہ اردو شاعری کی باقاعدہ ابتداء کن میں ہوئی، لیکن شمالی ہند نے اس کے فروغ اور استحکام میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ولی دکنی کی دہلی آمد اردو غزل کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں اردو شاعری کو شمالی ہند میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

آپ نے ابتدائی شعرا جیسے امیر خسرو، افضل پانی پتی، جعفر زٹلی، آرزو، آبرو، ناجی اور مضمون کی خدمات کا جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ ایہام گوئی کے رجحان اور اس کے اثرات کو بھی سمجھا۔ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں کی اصلاحی کوششوں نے اردو غزل کو سادگی اور معنویت عطا کی۔

سبق میں میر، سودا، درد اور سوز کے ادبی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ بعد ازاں غالب، مومن، ذوق، ناسخ اور آتش جیسے شعرا نے اردو غزل کو نئی فکری اور فنی جہتیں عطا کیں۔ اس طرح شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت مسلسل ترقی کرتی رہی اور اردو ادب کی سب سے اہم صنف بن گئی۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ شمالی ہند میں اردو غزل کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے مختلف مراحل کو سمجھ سکتے ہیں۔ آپ یہ جان سکتے ہیں کہ اردو شاعری اگرچہ دکن میں پروان چڑھی، لیکن شمالی ہند میں اسے نئی زندگی، وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ ولی دکنی کی ادبی خدمات اور

ان کے دیوان کے اثرات کا جائزہ لے سکتے ہیں اور یہ بیان کر سکتے ہیں کہ ان کی شاعری نے شمالی ہند کے شعرا کو اردو میں شعر کہنے کی ترغیب کس طرح دی۔

آپ امیر خسرو، افضل پانی پتی اور جعفر زٹلی جیسے ابتدائی شعرا کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں اور شمالی ہند میں اردو شاعری کی بنیاد رکھنے میں ان کے کردار کو بیان کر سکتے ہیں۔ آپ آرزو، آبرو، ناجی اور مضمون کی شاعری میں ایہام گوئی کے رجحان کو پہچان سکتے ہیں اور اس کے ادبی اثرات کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح آپ حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں کی اصلاحی خدمات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اردو غزل کو سادگی، صفائی اور معنویت کس طرح حاصل ہوئی۔

اس سبق کی مدد سے آپ میر تقی میر، محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد اور محمد میر سوز کی شعری خصوصیات اور اردو غزل کے فروغ میں ان کے کردار کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ آپ میر کی داخلیت، درد کے تصوف، سودا کی قصیدہ نگاری اور سوز کی سادہ اور دلکش زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ مزید برآں آپ غالب، مومن، ذوق، ناسخ اور آتش کی ادبی خدمات کا مطالعہ کرتے ہوئے اردو غزل کی فکری، فنی اور لسانی ترقی کا ادراک حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ دہلی اور لکھنؤ کی شعری روایتوں کے امتیازات کو بیان کر سکتے ہیں اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان دونوں ادبی مراکز نے اردو غزل کو مختلف جہتوں سے مالا مال کیا۔ مجموعی طور پر آپ شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت، اس کے اہم شعرا، نمایاں رجحانات اور ادبی ارتقا کا ایک جامع تصور قائم کر سکتے ہیں۔

5.5 فرہنگ

لفظ	معنی
ایہام	ایک لفظ سے دو یا دو سے زیادہ معنی مراد لینا
روایت	تسلسل سے چلا آنے والا طریقہ
غزل گو	غزل کہنے والا شاعر
سوز و گداز	درد و تاثیر
تصوف	روحانی طرز فکر
داخلیت	باطنی احساسات کا اظہار
قصیدہ	مدحیہ شاعری کی ایک صنف
مرثیہ	شہدائے کربلا یا کسی مرحوم کے غم میں کہی جانے والی نظم

زبان کی صفائی

فصاحت

مؤثر اندازِ بیان

بلاغت

5.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. ولی دکنی کی دہلی آمد اردو غزل کی تاریخ میں کیوں اہم ہے؟

2. امیر خسرو کو اردو غزل کا اولین شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟

3. ایہام گوئی کیا ہے؟ اس کے فوائد اور نقصانات بیان کیجیے۔

4. میر تقی میر کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

5. خواجہ میر درد کی شاعری میں تصوف کے عناصر کی وضاحت کیجیے۔

6. غالب نے اردو غزل کو کن نئی جہتوں سے آشنا کیا؟

5.7 مشقی سوالات

1. شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

2. دلی دکنی کی خدمات اور شمالی ہند میں اردو غزل کے فروغ پر مضمون لکھیے۔

3. آرزو، آبرو، ناجی اور مضمون کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

4. میر، سودا، درد اور سوز کی شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کیجیے۔

5. غالب اور مومن کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

6. دہلی اور لکھنؤ کی شاعری روایتوں کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

5.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1۔ شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

شمالی ہند میں اردو غزل کی روایت کا آغاز ابتدائی طور پر امیر خسرو، افضل پانی پتی اور جعفر زٹلی جیسے شعرا سے ہوا، لیکن اسے باقاعدہ فروغ دلی دکنی کی دہلی آمد کے بعد حاصل ہوا۔ دلی کے دیوان نے اہل دہلی کو اردو شاعری کی ادبی اہمیت سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد آرزو، آبرو، ناجی اور مضمون نے اردو غزل کی ابتدائی روایت کو مستحکم کیا۔ بعد میں میر، سودا، درد اور سوز نے اردو غزل کو فنی پختگی، فکری وسعت اور جذباتی گہرائی عطا کی۔ انیسویں صدی میں غالب، مومن اور ذوق نے اردو غزل کو نئی جہتیں فراہم کیں اور یوں شمالی ہند اردو غزل کا ایک مضبوط مرکز بن گیا۔

2۔ دلی دکنی کی خدمات اور شمالی ہند میں اردو غزل کے فروغ پر مضمون لکھیے۔

دلی دکنی اردو غزل کے اولین عظیم شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی دہلی آمد نے شمالی ہند کے شعرا کو اردو زبان میں شاعری کی ترغیب دی۔ ان کے دیوان نے اہل دہلی کو یہ احساس دلایا کہ اردو زبان اعلیٰ ادبی اظہار کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری نے شمالی ہند میں اردو غزل کی بنیاد مضبوط کی اور آنے والے شعرا کے لیے راہ ہموار کی۔

3۔ آرزو، آبرو، ناجی اور مضمون کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

یہ شعرا شمالی ہند میں اردو غزل کے ابتدائی معمار تھے۔ ان کی شاعری میں ایہام گوئی کا رجحان نمایاں تھا۔ آرزو نے اردو شاعری کی سرپرستی کی اور کئی بڑے شعرا کی تربیت کی۔ آبرو نے غزل کو مقبول بنانے میں کردار ادا کیا۔ ناجی اور مضمون نے بھی اردو شاعری کی ابتدائی روایت کو آگے بڑھایا اور اردو غزل کی ترقی میں حصہ لیا۔

4۔ میر، سودا، درد اور سوز کی شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کیجیے۔

میر کی شاعری میں درد، غم اور داخلی کیفیات نمایاں ہیں۔ سودا قصیدہ نگاری اور زبان کی قوت کے لیے مشہور ہیں۔ درد نے تصوف اور روحانی تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جبکہ سوز نے سادہ اور خالص اردو زبان کے ذریعے غزل کو دلکش بنایا۔ ان چاروں شعرا نے اردو غزل کی مختلف جہات کو فروغ دیا۔

5۔ غالب اور مومن کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

غالب نے اردو غزل میں فلسفہ، فکر، معنوی گہرائی اور تخیل کی وسعت پیدا کی۔ ان کی شاعری میں جدت اور فکری بلندی نمایاں ہے۔ مومن نے عشق و محبت کے مضامین کو نہایت دلکش اور منفرد انداز میں پیش کیا۔ ان کی شاعری میں لطافت، نزاکت اور جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔

6۔ دہلی اور لکھنؤ کی شعری روایتوں کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

دہلی کی شعری روایت میں سادگی، داخلیت، تصوف اور فکری گہرائی کو اہمیت حاصل رہی جبکہ لکھنؤ کی شعری روایت میں زبان کی صفائی، حسن بیان، نزاکت اور خارجی حسن پر زیادہ توجہ دی گئی۔ دونوں مراکز نے اردو غزل کو مختلف پہلوؤں سے مالا مال کیا۔

5.8 جوابات سرگرمی

1. دلی
2. امیر خسرو
3. دو
4. ایہام
5. خدائے سخن
6. تصوف

5.9 امدادی کتب

- | | |
|----------------------|------------------------------|
| محمد حسین آزاد | 1. آبِ حیات |
| ڈاکٹر جمیل جالبی | 2. تاریخ ادبِ اردو |
| شمس الرحمن فاروقی | 3. اردو کا ابتدائی زمانہ |
| ڈاکٹر عبادت بریلوی | 4. اردو غزل کا ارتقا |
| ڈاکٹر مسعود حسین خاں | 5. تاریخ زبان و ادبِ اردو |
| الطاف حسین حالی | 6. مقدمہ شعر و شاعری |
| ڈاکٹر سلیم اختر | 7. اردو ادب کی مختصر تاریخ |
| گوپی چند نارنگ | 8. اردو غزل: روایت اور مسائل |

سبق نمبر ۶۔ ترقی پسند اردو غزل

ساخت

6.0 اغراض و مقاصد

6.1 تعارف

6.2 ترقی پسند اردو غزل

6.2.0 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

6.3 عمومی جائزہ

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

6.5 فرہنگ

6.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

6.7 مشقی سوالات

6.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

6.8 جوابات سر گرمی

6.9 امدادی کتب

6.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ ترقی پسند تحریک کے تاریخی، سماجی اور ادبی پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو غزل کے موضوعات، اسلوب اور فکری جہات میں کس طرح تبدیلی پیدا کی۔ آپ ترقی پسند غزل کی بنیادی خصوصیات اور اس کے نمایاں رجحانات کا جائزہ لے سکیں گے۔ آپ یہ سمجھ سکیں گے کہ ترقی پسند شعرا نے روایتی غزل کے استعارات، علامات اور شعری وسائل کو نئے معانی و مفاہیم کے ساتھ کس طرح برتا۔ آپ فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی اور کیفی اعظمی جیسے اہم ترقی پسند غزل گو شعرا کی ادبی خدمات سے واقف ہو سکیں گے۔ اس کے علاوہ آپ ترقی پسند غزل میں سماجی شعور، انسانی ہمدردی، طبقاتی کشمکش، آزادی، انقلاب اور عصری مسائل کی عکاسی کا تنقیدی جائزہ لینے کے قابل ہو سکیں گے۔

6.1 تعارف

بیسویں صدی اردو ادب میں فکری اور سماجی تبدیلیوں کی صدی کہلاتی ہے۔ اس دور میں دنیا بھر میں سیاسی، معاشی اور سماجی سطح پر بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ انہی حالات کے زیر اثر اردو ادب میں ترقی پسند تحریک وجود میں آئی جس کا بنیادی مقصد ادب کو زندگی کے حقیقی مسائل سے جوڑنا اور اسے سماجی تبدیلی کا مؤثر ذریعہ بنانا تھا۔ اس تحریک نے ادب کو محض تفریح یا جذباتی اظہار کے دائرے سے نکال کر انسانی زندگی، سماجی نا انصافی، طبقاتی استحصال، قومی آزادی اور عوامی مسائل کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔

اردو غزل، جو صدیوں سے عشق و محبت، حسن و جمال اور داخلی کیفیات کے اظہار کا اہم ذریعہ رہی تھی، ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نئے موضوعات اور نئے فکری زاویوں سے آشنا ہوئی۔ ترقی پسند شعرا نے غزل کی روایتی ہیئت اور فنی ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو شامل کیا۔ چنانچہ مزدور، کسان، محروم طبقات، آزادی کی جدوجہد، انسانی مساوات، امن اور سماجی انصاف جیسے موضوعات غزل کا حصہ بن گئے۔

ترقی پسند غزل گو شعرا نے کلاسیکی روایت سے بھی رشتہ برقرار رکھا اور اس کے مثبت عناصر کو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے قدیم استعارات، تشبیہات اور علامات کو نئے مفاہیم عطا کیے اور غزل کو عصری شعور سے ہم آہنگ کیا۔ اس تحریک کے زیر اثر فیض احمد فیض، مجاز، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی، کیفی اعظمی اور دیگر شعرا نے اردو غزل کو نئی فکری وسعت اور معنوی گہرائی عطا کی۔ اس سبق میں آپ ترقی پسند تحریک کے اثرات، ترقی پسند اردو غزل کی نمایاں خصوصیات، اہم شعرا اور ان کی ادبی خدمات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے اور یہ جان سکیں گے کہ اس تحریک نے اردو غزل کو کس طرح نئے امکانات اور نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

6.2 ترقی پسند اردو غزل

اردو غزل کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک ایک اہم اور فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترقی پسند غزل دراصل اسی ادبی تحریک کی توسیع ہے جس نے ادب کو محض حسن و عشق کے محدود دائرے سے نکال کر سماجی حقیقتوں، انسانی مسائل اور اجتماعی زندگی سے جوڑنے کی کوشش

کی۔ ترقی پسند شعرا نے غزل کی قدیم روایت کو یکسر مسترد کرنے کے بجائے اس کے مثبت اور زندہ عناصر کو قبول کیا اور انہیں نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی سعی کی۔ اس فکری تبدیلی کی بنیاد انیسویں صدی میں ہی پڑ چکی تھی۔ الطاف حسین حالی نے غزل کے روایتی مضامین میں وسعت پیدا کرنے پر زور دیتے ہوئے یہ تصور پیش کیا کہ محبت اور انسانی تعلقات کے موضوعات کو زیادہ جامع انداز میں بیان کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے مختلف تجربات اور احساسات کا احاطہ کر سکیں۔ ان کے بعد چکبست، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، حسرت موہانی، یاس یگانہ چنگیزی، شاد عارفی، فراق گورکھپوری اور اقبال سہیل جیسے شعرا نے اپنی غزلوں میں سیاسی، سماجی اور قومی مسائل کو جگہ دے کر غزل کو نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے ظہور کے ساتھ اردو غزل کا مزاج مزید تبدیل ہوا۔ ترقی پسند شعرا نے مزدوروں، کسانوں، محروم طبقات اور استحصال کا شکار انسانوں کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ سرمایہ دارانہ نظام، سماجی نا انصافی، طبقاتی کشمکش، غربت، بھوک، فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی جبر جیسے موضوعات غزل میں داخل ہوئے۔ اس طرح غزل صرف فرد کے جذبات کی ترجمان نہ رہی بلکہ اجتماعی شعور کی آواز بھی بن گئی۔ ترقی پسند غزل گو شعرا نے کلاسیکی روایت سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ انہوں نے سودا کی خارجیت، غالب کی فکری وسعت، حالی کی مقصدیت اور اقبال کی بلند آہنگی کو اپنے شعری اظہار میں سمویا۔ اگرچہ موضوعات اور فکر میں نمایاں تبدیلی آئی، لیکن غزل کی روایتی ہیئت، بحر، قافیہ اور ردیف کو برقرار رکھا گیا۔ یوں ترقی پسند غزل روایت اور جدت کے حسین امتزاج کی صورت اختیار کر گئی۔ ابتدائی ترقی پسند شعرا میں رومانیت کا رجحان نمایاں تھا کیونکہ ان کی ادبی تربیت اسی فضا میں ہوئی تھی۔ تاہم وقت کے ساتھ سیاسی اور سماجی حالات نے ان کے شعور کو نئی سمت دی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ذاتی عشق کے ساتھ اجتماعی دکھ، قومی مسائل اور انسانی محرومیوں کی جھلک بھی نمایاں ہونے لگی۔ انہوں نے روایتی استعاروں اور علامتوں کو نئے مفاہیم عطا کیے اور انہیں عصری زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

فیض احمد فیض ترقی پسند غزل کی روایت میں فیض احمد فیض کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے محبت اور انقلاب کو ایک دوسرے کے قریب لا کر اردو شاعری کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کے یہاں رومانیت اور انقلابی شعور کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو اردو شاعری میں کم ہی نظر آتا ہے۔ فیض نے کلاسیکی غزل کے الفاظ، علامتوں اور استعاروں کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں نئے سیاسی اور سماجی معانی عطا کیے۔ ان کی غزلوں میں حسن بیان، موسیقیت، رمزیت اور عصری شعور ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مجاز بنیادی طور پر رومانوی شاعر تھے، لیکن ان کی رومانیت محض جذباتی وابستگی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں بغاوت، آزادی اور سماجی تبدیلی کا جذبہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے نوجوان نسل کے احساسات اور خوابوں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری میں محبت کے ساتھ انقلاب کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ زبان کی شگفتگی، لہجے کی نرمی اور ترنم ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مجروح سلطان پوری نے اس دور میں غزل کی اہمیت کو ثابت کیا جب بعض ترقی پسند حلقے اسے فرسودہ صنف سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے روایتی غزل کی دلکشی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں عصری زندگی کے مسائل اور انسانی جدوجہد کو شامل کیا۔ ان کی شاعری میں موسیقیت، جذبے کی حرارت اور انسان دوستی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ کلاسیکی روایت اور جدید شعور کے کامیاب امتزاج کے شاعر ہیں۔

احسن جذبہ نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود اپنی انفرادی شناخت برقرار رکھی۔ ان کی غزلوں میں داخلی کرب، انسانی تنہائی اور زندگی کے تلخ تجربات کا گہرا احساس ملتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند ادب کے عمومی نعروں سے گریز کرتے ہوئے ذاتی اور کائناتی غم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں کلاسیکی شعری روایت اور جدید احساسات کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

کیفی اعظمی نے اپنی غزلوں میں اشتراکی فکر، سماجی شعور اور انسانی ہمدردی کو بڑی فنی مہارت سے پیش کیا۔ اگرچہ ان کا اصل میدان نظم تھا، لیکن غزل میں بھی انہوں نے اپنے عہد کے مسائل کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا۔ ان کے یہاں رومان اور انقلاب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہی ان کی شاعری کا امتیاز ہے۔ ان شعرا کے علاوہ مخدوم محی الدین، سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، پرویز شہادی، دامت جوہوری، اختر انصاری اور قتیل شفائی جیسے متعدد شعرا نے بھی ترقی پسند غزل کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ مجموعی طور پر ترقی پسند تحریک نے اردو غزل کو نئے موضوعات، نئی فکری جہتوں اور عصری شعور سے آشنا کیا۔ اگرچہ بعض اوقات نظریاتی وابستگی کے باعث غزل پر تبلیغی اور سیاسی رنگ غالب آگیا، لیکن اس کے باوجود بہت سے شعرا نے غزل کے جمالیاتی حسن اور فنی وقار کو برقرار رکھتے ہوئے اسے زندگی کے نئے حقائق کا ترجمان بنایا۔ یہی وہ سرمایہ ہے جس نے ترقی پسند اردو غزل کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک منفرد اور قابل قدر مقام عطا کیا۔

6.2.0 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے ترقی پسند اردو غزل کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 6.8 سے رجوع کریں۔

1. ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز _____ میں ہوا۔
2. حالی نے غزل کے مضامین میں _____ پیدا کرنے پر زور دیا۔
3. فیض احمد فیض کو ترقی پسند تحریک کا _____ شاعر تصور کیا جاتا ہے۔
4. مجاز کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ _____ کا عنصر بھی نمایاں ہے۔
5. کیفی اعظمی نے اپنی شاعری میں _____ اور سماجی مسائل کو موضوع بنایا۔
6. مجروح سلطان پوری نے غزل کو _____ مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

6.3 عمومی جائزہ

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک اہم ادبی اور فکری تحریک تھی جس نے ادب کو زندگی اور سماج سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے زیر اثر اردو غزل کے موضوعات میں نمایاں وسعت پیدا ہوئی اور شاعر محض حسن و عشق کی روایتی دنیا تک محدود نہ رہے بلکہ انہوں نے معاشرتی نا انصافی، غربت، استحصال، طبقاتی کشمکش، قومی آزادی اور انسانی مساوات جیسے موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

ترقی پسند شعرانے غزل کی کلاسیکی روایت کو یکسر مسترد نہیں کیا بلکہ اس کے مثبت عناصر سے استفادہ کرتے ہوئے اسے نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اس سلسلے میں حالی، اکبر، چکبست، اقبال اور حسرت موہانی کی کاوشوں نے نئی راہیں ہموار کیں جن سے بعد میں ترقی پسند غزل کی بنیاد مضبوط ہوئی۔

فیض احمد فیض نے محبت اور انقلاب کو یکجا کر کے اردو غزل کو نئی معنویت عطا کی۔ ان کے یہاں رومانوی جذبہ سماجی شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ مجاز نے نوجوان نسل کے جذبات، خوابوں اور انقلابی امنگوں کو غزل کا حصہ بنایا۔ مجروح سلطان پوری نے روایتی غزل کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے عوامی مسائل اور انسانی آزادی کے جذبات کو اپنی شاعری میں سموایا۔

معین احسن جذبی نے کلاسیکی روایت اور جدید شعور کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کیا جبکہ کیفی اعظمی نے محنت کش طبقے، سماجی انصاف اور انسانی وقار کے موضوعات کو اپنی غزلوں میں مؤثر انداز میں پیش کیا۔

اس طرح ترقی پسند غزل نے اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئے زاویہ نظر اور عصری شعور سے آشنا کیا اور غزل کو محض جذباتی اظہار کے بجائے سماجی تبدیلی کے ایک مؤثر وسیلے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ کو معلوم ہوا کہ ترقی پسند تحریک نے اردو غزل کے مزاج اور موضوعات میں نمایاں تبدیلی پیدا کی۔ آپ نے جانا کہ حالی نے غزل میں نئے امکانات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے دائرہ موضوعات کو وسیع کرنے کی بات کی۔ آپ نے یہ بھی سمجھا کہ ترقی پسند شعرانے روایتی غزل کے فنی حسن کو برقرار رکھتے ہوئے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ آپ نے فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، معین احسن جذبی اور کیفی اعظمی کی ادبی خدمات اور ان کے شعری رجحانات کا مطالعہ کیا۔ آپ اس قابل ہوئے کہ ترقی پسند غزل کی نمایاں خصوصیات، اس کے موضوعات اور اردو غزل کی روایت میں اس کے مقام کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔

6.5 فرہنگ

لفظ	معنی
افادیت	فائدہ مندی
استحصا	ظلم و نا انصافی کے ذریعے فائدہ اٹھانا
سرمایہ داری	سرمایہ پر مبنی معاشی نظام
انقلاب	بنیادی تبدیلی

لفظ	معنی
رومانیت	جذبات اور حسن پر مبنی طرزِ فکر
غنائیت	نغمگی اور موسیقیت
عصری	زمانہ حاضر سے متعلق
معروضی	خارجی یا حقیقت پر مبنی
اشتراکیت	مساوات اور اجتماعی ملکیت کا نظریہ
مقصدیت	کسی واضح مقصد کے تحت تخلیق

6.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟

2. حالی نے غزل میں کس قسم کی تبدیلیوں کی ضرورت پر زور دیا؟

3. فیض احمد فیض کی شاعری کی دو نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

4. مجاز کی غزلوں میں کون سے عناصر نمایاں ہیں؟

5. مجروح سلطان پوری کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟

6. معین احسن جذبی اور کیفی اعظمی کی شاعری میں کیا نمایاں فرق پایا جاتا ہے؟

7. ترقی پسند غزل نے اردو ادب کو کیا نئی جہت عطا کی؟

6.7 مشقی سوالات

1. ترقی پسند تحریک کے پس منظر اور اس کے ادبی اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. ترقی پسند اردو غزل کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔
3. فیض احمد فیض کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔
4. مجاز کی شاعری میں رومانیت اور انقلاب کے امتزاج پر روشنی ڈالیے۔
5. مجروح سلطان پوری کی غزلوں میں ترقی پسند عناصر کا جائزہ لیجیے۔
6. معین احسن جذبی اور کیفی اعظمی کی غزل گوئی کا تقابلی مطالعہ کیجیے۔
7. ترقی پسند تحریک نے اردو غزل کے موضوعات اور اسلوب میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں؟

6.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

- 1- ترقی پسند تحریک کے پس منظر اور اس کے ادبی اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
- ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ابھری۔ اس تحریک کا مقصد ادب کو زندگی کے حقیقی مسائل سے وابستہ کرنا تھا۔ اس کے زیر اثر ادیبوں اور شاعروں نے غربت، طبقاتی استحصال، قومی غلامی، سماجی نا انصافی اور انسانی مساوات جیسے موضوعات کو ادب میں اہمیت دی۔ اس تحریک نے اردو ادب میں حقیقت نگاری، سماجی شعور اور مقصدیت کو فروغ دیا۔

2- ترقی پسند اردو غزل کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

ترقی پسند غزل میں سماجی شعور، عوامی مسائل، انسانی ہمدردی، انقلاب پسندی، قومی احساس اور طبقاتی کشمکش کے موضوعات نمایاں ہیں۔ اس غزل کی زبان نسبتاً سادہ اور عام فہم ہے۔ اس میں روایتی استعاروں کو نئے معنی دے کر استعمال کیا گیا ہے۔

3- فیض احمد فیض کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

فیض نے محبت اور انقلاب کو ایک ساتھ پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی حسن بھی موجود ہے اور جدید سماجی شعور بھی۔ انہوں نے روایتی غزل کے الفاظ اور علامتوں کو نئے معانی عطا کیے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی، امید، حریت اور جمالیاتی حسن کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

4- مجاز کی شاعری میں رومانیت اور انقلاب کے امتزاج پر روشنی ڈالیے۔

مجاز کی شاعری میں عشق، حسن اور جذبات کی رومانوی فضا موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انقلابی شعور بھی نمایاں ہے۔ وہ نوجوان نسل کو بیداری، حوصلے اور عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی شاعری جذباتی حسن اور سماجی شعور دونوں کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

5- مجروح سلطان پوری کی غزلوں میں ترقی پسند عناصر کا جائزہ لیجیے۔

مجروح نے غزل کی روایتی دلکشی کو برقرار رکھتے ہوئے عوامی مسائل اور انسانی آزادی کے جذبات کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔ ان کی غزلوں میں حوصلہ، امید، جدوجہد اور انسان دوستی کے عناصر نمایاں ہیں۔

6- معین احسن جذبی اور کیفی اعظمی کی غزل گوئی کا تقابلی مطالعہ کیجیے۔

جذبی کی شاعری میں داخلی کرب، غم ذات اور کلاسیکی روایت کا اثر نمایاں ہے جبکہ کیفی کی شاعری میں سماجی شعور، طبقاتی مسائل اور انقلابی فکر زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ دونوں شاعروں نے ترقی پسند فکر سے وابستگی کے باوجود اپنا منفرد اسلوب برقرار رکھا۔

7- ترقی پسند تحریک نے اردو غزل کے موضوعات اور اسلوب میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں؟

ترقی پسند تحریک نے غزل کو روایتی عشق و محبت کے محدود دائرے سے نکال کر سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے روشناس کرایا۔ اس کے نتیجے میں غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور زبان زیادہ سادہ، رواں اور عوامی ہو گئی۔

6.8 جوابات سرگرمی

1. 1936ء

2. وسعت

3. سب سے بڑا

4. انقلاب

5. محنت کش طبقے

6. عوامی

6.9 امدادی کتب

- مقدمہ شعر و شاعری
- ترقی پسند اردو غزل: آغاز و ارتقا
- اردو غزل پر ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات
- اردو شاعری کا فنی ارتقا
- تاریخ ادبِ اردو
- ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری
- ترقی پسند تحریک اور اردو غزل
- اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک
- الطاف حسین حالی
- ڈاکٹر محمد صادق
- ڈاکٹر نصرت جہاں
- ڈاکٹر فرمان فتح پوری
- ڈاکٹر جمیل جالبی
- یعقوب یاور
- سراج الجمالی
- خلیل الرحمن اعظمی

سبق نمبر ۷۔ جدید اردو غزل

ساخت

7.0	اغراض و مقاصد
7.1	تعارف
7.2	جدید اردو غزل
7.2.0	سرگرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
7.3	عمومی جائزہ
7.4	آپ نے کیا سیکھا؟
7.5	فرہنگ
7.6	نمونہ برائے امتحانی سوالات
7.7	مشقی سوالات
7.7.0	مشقی سوالات کے جوابات
7.8	جوابات سرگرمی
7.9	امدادی کتب

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ جدید اردو غزل کے ارتقائی سفر اور اس کے فکری و فنی رجحانات کو سمجھ سکیں گے۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ ترقی پسند تحریک کے بعد اردو غزل میں کن نئی تبدیلیوں نے جنم لیا اور جدیدیت و مابعد جدیدیت نے غزل کے موضوعات، اسلوب اور فکر پر کس طرح اثرات مرتب کیے۔ آپ جدید دور کے غزل گو شعرا کی ادبی خدمات، فکری جہات اور شعری خصوصیات کا تنقیدی جائزہ لینے کے قابل ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ جدید اردو غزل میں فرد کی تنہائی، وجودی کرب، سماجی بے چینی، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت، امید و رجائیت اور عصری شعور جیسے موضوعات کس انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس سبق کے ذریعے آپ جدید غزل کے منتخب شعرا کے اشعار کی تشریح، تجزیہ اور ادبی محاسن کی شناخت بھی کر سکیں گے اور جدید اردو غزل کے مجموعی مزاج اور اس کے نئے امکانات سے آگاہی حاصل کریں گے۔

7.1 تعارف

اردو غزل اردو ادب کی ایک ایسی مقبول اور توانا صنفِ سخن ہے جس نے ہر دور میں اپنے عہد کے فکری، سماجی اور تہذیبی تقاضوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اس کا سفر دکن سے شروع ہو کر کلاسیکی دور، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے مختلف مراحل سے گزرتا ہوا عصر حاضر تک پہنچا ہے۔ ہر دور میں غزل نے نئے موضوعات، نئے تجربات اور نئے اسالیب کو قبول کر کے اپنی زندگی اور معنویت کو برقرار رکھا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے بعد اردو شاعری میں جدیدیت کا رجحان پیدا ہوا جس نے فرد کی داخلی کیفیت، تنہائی، بے یقینی، اضطراب اور وجودی مسائل کو اظہار کا مرکز بنایا۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ادب میں نئے امکانات اور نئے زاویہ نظر کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، جس کے نتیجے میں جدید اردو غزل نے اپنے دائرہ اظہار کو مزید وسیع کیا۔ اس دور کے شعرا نے نہ صرف فرد کی داخلی دنیا کو موضوع بنایا بلکہ سماجی تبدیلیوں، تہذیبی اقدار، قومی یکجہتی، انسانی رشتوں، ماحولیاتی مسائل اور عصری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

جدید اردو غزل کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ایک طرف کلاسیکی غزل کی شعری لطافت، رمزیت اور فنی حسن برقرار رہتا ہے اور دوسری طرف جدید دور کے مسائل، احساسات اور فکری میلانات بھی پوری قوت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس عہد کے شعرا نے غزل کو نئے موضوعات اور نئے فکری امکانات عطا کیے اور اسے زندگی کے زیادہ قریب کر دیا۔

اس سبق میں آپ جدید اردو غزل کے ارتقا، اس کی نمایاں خصوصیات، اہم شعرا اور ان کی شعری خدمات کا مطالعہ کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ جدید اردو غزل نے کس طرح اپنے عہد کے مسائل، انسانی احساسات اور معاشرتی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہوئے اردو ادب کی روایت کو مزید مستحکم اور وسیع بنایا۔

7.2 جدید اردو غزل

اردو غزل اپنی طویل ادبی روایت، فنی وسعت اور مسلسل ارتقائی سفر کے باعث اردو ادب کی سب سے مقبول اور زندہ صنفِ سخن سمجھی جاتی ہے۔ اس نے ہر دور میں اپنے عہد کے فکری، سماجی اور تہذیبی تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے نئے رجحانات کو اپنے اندر جذب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل صدیوں کے سفر کے باوجود آج بھی اپنی تازگی اور معنویت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعد اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان ابھرا۔ جدیدیت نے فرد کی داخلی دنیا، تنہائی، بے یقینی، شکست خوردگی، کرب اور وجودی مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس دور کی شاعری میں اجتماعی زندگی کے بجائے فرد کے باطنی تجربات اور ذہنی الجھنوں کو اہمیت حاصل رہی۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ جدیدیت کے بعض رویے تکرار اور محدودیت کا شکار ہونے لگے۔ نتیجتاً شاعری میں نئے امکانات اور نئے زاویہ نظر کی تلاش شروع ہوئی جس نے بعد از جدید رجحانات کو جنم دیا۔

1980 کے بعد اردو غزل میں نئے موضوعات، نئی فکری جہات اور تازہ اسالیب سامنے آئے۔ اس دور کے شاعروں نے نہ صرف انسان کی داخلی کیفیت کو بیان کیا بلکہ سماجی، تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کی غزلوں میں امید، زندگی سے وابستگی، انسان دوستی، قومی یکجہتی اور بہتر مستقبل کی آرزو نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس عہد کے ممتاز شعرا میں شاہد جمیل کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری میں قومی اتحاد، مذہبی رواداری اور سیکولر اقدار کی جھلک نمایاں ہے۔ انہوں نے معاشرے میں انتشار اور فرقہ واریت کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اتحاد و اتفاق کا پیغام دیا۔ ان کے اشعار انسانوں کو باہمی ہم آہنگی اور یکجہتی کی دعوت دیتے ہیں۔

کوثر مظہری کی غزلیں انسانی احساسات، آرزوؤں اور زندگی کی جدوجہد کی مؤثر عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے یہاں بہتر زندگی کی تلاش، حوصلہ مندی اور انسانی نفسیات کی گہری تصویر کشی ملتی ہے۔ وہ اپنے شعری اظہار میں سادگی اور معنویت دونوں کو برقرار رکھتے ہیں۔ اسلم بدر نے اپنی غزلوں میں عصری مسائل کے ساتھ ساتھ روحانی اور فکری موضوعات کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے کلام میں انسان اور کائنات کے تعلق، خدا کی قدرت اور وجودی سوالات کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری فکری گہرائی اور فنی پختگی کا نمونہ ہے۔

ارشاد کمال کی غزلوں میں سماجی شعور اور مستقبل کی فکر نمایاں ہے۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے انسان کو بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں ایک بہتر اور محفوظ ماحول میں زندگی گزار سکیں۔ ان کی شاعری میں ماحولیات، انسانی ذمہ داری اور معاشرتی اصلاح کے موضوعات اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

محمود سعیدی جدید اردو غزل کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے زندگی کے تلخ حقائق، انسانی محرومیوں اور معاشرتی مسائل کو نہایت درد مندی سے پیش کیا۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی، ہمدردی اور سماجی شعور کا گہرا احساس ملتا ہے۔

ندا فاضلی نے جدید اردو غزل کو ایک منفرد انداز عطا کیا۔ ان کی شاعری میں فرد کی بے بسی، زندگی کی پیچیدگیاں اور معاشرتی حقیقتیں نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں سامنے آتی ہیں۔ ان کے اشعار ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات دونوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کلیم عاجز نے اپنی غزلوں میں انسانی جذبات اور معاشرتی نا انصافیوں کے خلاف احتجاج کو جگہ دی۔ ان کی شاعری بظاہر سادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پس منظر میں گہرا سماجی شعور اور فکری معنویت پوشیدہ ہوتی ہے۔

سلطان اختر کے یہاں جدید انسان کی تنہائی، اجنبیت اور بدلتے ہوئے معاشرتی رشتوں کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری صنعتی اور مشینی زندگی کے منفی اثرات کو نمایاں کرتی ہے اور انسان کے داخلی بحرانوں کی ترجمانی کرتی ہے۔

شہریار کی غزلوں میں زندگی کے تلخ حقائق کے باوجود امید اور حوصلے کا عنصر موجود رہتا ہے۔ انہوں نے انسانی رشتوں کی کمزوری، وقت کی بے رحمی اور زندگی کی جدوجہد کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری فکری گہرائی اور فنی حسن کا حسین امتزاج ہے۔

فرحت احساس نے جدید دور کے تقاضوں اور تہذیبی اقدار کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی غزلوں میں انسانی رویوں، معاشرتی تبدیلیوں اور داخلی کرب کی تصویر کشی ملتی ہے۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جدید شعور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

عین تابلش کی شاعری زندگی اور موت، امید اور ناامیدی، روشنی اور تاریکی جیسے متضاد تجربات کی ترجمان ہے۔ ان کے اشعار سادگی، فکری گہرائی اور علامتی اظہار کی خوب صورت مثال پیش کرتے ہیں۔

خورشید اکبر کی غزلوں میں رجائیت، حوصلہ مندی اور زندگی سے وابستگی نمایاں ہے۔ وہ زمانے کی ناہمواریوں اور مشکلات کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن قنوطیت کے بجائے امید اور مثبت فکر کو فروغ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری نئے عہد کے انسان کے مسائل اور امکانات دونوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان شعرا کے علاوہ علیم اللہ حالی، عطاء عابدی، عالم خورشید، محبوب راہی، علیم صبانویدی، مہدی پرتاپ گڑھی، کرشن کمار طور، ملک زادہ جاوید، سہیل اختر، عبدالاحد ساز اور ف۔ س۔ اعجاز جیسے شعرا نے بھی جدید اردو غزل کی ترقی اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مختصر آئیہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید اردو غزل نے روایت اور جدت کے درمیان ایک متوازن رشتہ قائم کیا۔ اس نے فرد کی داخلی دنیا کے ساتھ معاشرتی مسائل، انسانی اقدار اور عصری تقاضوں کو بھی اپنی گرفت میں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اردو غزل آج بھی فکری وسعت، فنی تنوع اور معنوی گہرائی کے اعتبار سے اردو ادب کا ایک اہم سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔

7.2.0 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیر طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے جدید اردو غزل کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 7.8 سے رجوع کریں۔

1. شاہد جمیل نے اپنی شاعری میں _____ اور قومی یکجہتی کو اہمیت دی ہے۔
2. نذافت علی کی غزلوں میں _____ اور جگ-بیتی دونوں کا اظہار ملتا ہے۔
3. کلیم عاجز کی شاعری میں _____ کے خلاف احتجاجی لہجہ نمایاں ہے۔

4. فرحت احساس کے دو شعری مجموعوں میں سے ایک کا نام _____ ہے۔

5. شہریار کی شاعری میں _____ اور انسانی رشتوں کے زوال کا احساس ملتا ہے۔

7.3 عمومی جائزہ

جدید اردو غزل اردو شاعری کے ارتقائی سفر کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے بعد اردو غزل نے نئے فکری اور فنی امکانات کو قبول کیا۔ اس دور کے شعرا نے انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات، معاشرتی مسائل، تہذیبی بحران، قومی یکجہتی، انسانی رشتوں کی کمزوری، تنہائی، کرب اور امید جیسے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

جدید اردو غزل کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ شعرا نے کلاسیکی غزل کی فنی خوبصورتی کو برقرار رکھتے ہوئے عصر حاضر کے مسائل کو بھی نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ اس دور کے شاعروں نے انسانی نفسیات، سماجی نا انصافیوں، ماحولیاتی مسائل، سیاسی بے یقینی اور تہذیبی تبدیلیوں پر بھی توجہ دی۔

شاہد جمیل، کوثر مظہری، اسلم بدر، ارشد کمال، مخمور سعیدی، ندا فاضلی، کلیم عاجز، شہریار، فرحت احساس، عین تابش اور خورشید اکبر جیسے شعرا نے جدید اردو غزل کو نئی معنویت، وسعت اور تازگی عطا کی۔ ان کی شاعری میں فکری گہرائی، فنی مہارت اور عصری شعور نمایاں طور پر موجود ہے۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ جدید اردو غزل کے ارتقا اور اس کے فکری پس منظر کو سمجھ سکتے ہیں۔ آپ جدید غزل کے اہم موضوعات جیسے تنہائی، کرب، انسانی رشتے، قومی یکجہتی، سماجی شعور اور رجائیت کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ آپ جدید اردو غزل کے نمایاں شعرا اور ان کی ادبی خدمات سے واقف ہو چکے ہیں۔ آپ جدید غزل کے فنی اور فکری امتیازات کو بیان کر سکتے ہیں اور منتخب اشعار کی تشریح و تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ جدید اردو غزل میں روایت اور جدت کے امتزاج کو سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

7.5 فرہنگ

لفظ	معنی
رجائیت	امید پسندی
قنوطیت	مایوسی
عصری حسیت	زمانے کے مسائل کا شعور
معنویت	معنی خیزی

لفظ	معنی
وحدانیت	خدا کی یکتائی
استعارہ	بالواسطہ تشبیہ
نفسیات	انسانی ذہنی و جذباتی کیفیت
ناہمواری	دشواری، بے اعتدالی
اختصاص	انفرادیت، امتیاز
آبیاری	فروغ دینا، ترقی دینا

7.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. جدید اردو غزل کے نمایاں موضوعات کون سے ہیں؟

2. نذا فضلی کی غزل گوئی کے امتیازات کیا ہیں؟

3. کلیم عاجز کی شاعری میں کس نوعیت کے مسائل بیان ہوئے ہیں؟

4. شہریار کی غزلوں میں کن موضوعات کو اہمیت حاصل ہے؟

7.7 مشقی سوالات

1. جدید اردو غزل کے ارتقا اور اہم رجحانات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. جدید اردو غزل میں روایت اور جدت کے امتزاج کا جائزہ لیجیے۔
3. شاہد جمیل اور کوثر مظہری کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ کیجیے۔
4. نذافت علی اور کلیم عاجز کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
5. جدید اردو غزل میں عصری حسیت اور سماجی شعور کے مظاہر پر روشنی ڈالیے۔

1- جدید اردو غزل کے ارتقا اور اہم رجحانات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

جدید اردو غزل ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے بعد وجود میں آنے والے نئے ادبی رجحانات کا نتیجہ ہے۔ اس دور میں غزل نے زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے نئے موضوعات اور نئے اسالیب اختیار کیے۔ انسانی تنہائی، وجودی کرب، سماجی مسائل، تہذیبی بحران، قومی یکجہتی، امید اور مستقبل کے امکانات جدید غزل کے اہم موضوعات بن گئے۔ اس دور کے شعرا نے کلاسیکی غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے عصری شعور کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

2- جدید اردو غزل میں روایت اور جدت کے امتزاج کا جائزہ لیجیے۔

جدید اردو غزل میں کلاسیکی شعری روایت کے فنی عناصر مثلاً استعارہ، تشبیہ، علامت اور موسیقیت کو برقرار رکھا گیا ہے، لیکن ان کے ذریعے جدید زندگی کے مسائل اور تجربات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح روایت اور جدت کا حسین امتزاج پیدا ہوا جس نے اردو غزل کو نئی وسعت عطا کی۔

3- ندافاضلی اور کلیم عاجز کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

ندافاضلی کی شاعری میں سادگی، عام فہم زبان، انسانی محرومیوں کا احساس اور زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی ملتی ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری میں ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، سماجی شعور اور منفرد طرز اظہار نمایاں ہے۔

4- جدید اردو غزل میں عصری حسیت اور سماجی شعور کے مظاہر پر روشنی ڈالیے۔

جدید اردو غزل میں عصری مسائل، انسانی رشتوں کی کمزوری، ماحولیاتی مسائل، سیاسی بے یقینی اور معاشرتی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ شعرا نے اپنے عہد کے مسائل کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کر کے غزل کو سماجی شعور کا مؤثر وسیلہ بنایا ہے۔

7.8 جوابات سرگرمی

1. سیکولرزم
2. آپ بیتی
3. ظلم و جبر
4. میں رونا چاہتا ہوں
5. تنہائی

- اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ
- غزل کے جدید رجحانات
- جدید اردو غزل ۱۹۷۱ء سے ۲۰۱۰ء تک
- اردو غزل کے اہم موڈ
- جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد
- اردو ادب کی مختصر تاریخ
- تاریخ جدید اردو غزل
- اردو غزل کا ارتقا
- منظر اعظمی
- خالد علوی
- ڈاکٹر راحت بدر
- شمس الرحمن فاروقی
- خدا بخش اور نیشنل پبلک لائبریری، پٹنہ
- ڈاکٹر سلیم اختر
- ڈاکٹر وقار احمد رضوی
- ڈاکٹر عبادت بریلوی

سبق نمبر ۸۔ محمد قلی قطب شاہ

ساخت

- 8.0 اغراض و مقاصد
- 8.1 تعارف
- 8.2 محمد قلی قطب شاہ: حیات اور غزل گوئی
- 8.2.0 پیابانج پیالہ پیاجائے نا
- 8.2.1 صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا
- 8.2.2 تمہارے مکھ کے گہرتھے سونور پایا بہشت
- 8.2.3 پیاری بھنواں ہیں تیریاں جوں کہ چند
- 8.2.4 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 8.3 عمومی جائزہ
- 8.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 8.5 فرہنگ
- 8.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 8.7 مشقی سوالات
- 8.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 8.8 جوابات سر گرمی
- 8.9 امدادی کتب

8.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کا مقصد یہ ہے کہ آپ محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت اور ان کی غزل گوئی سے واقف ہوں اور یہ جان سکیں کہ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں غزل کس انداز میں کہی جاتی تھی۔ آپ اس بات کو سمجھیں گے کہ ایک بادشاہ بھی شاعر ہو سکتا ہے اور اپنے جذبات، خوشیوں اور محبت کو شعر کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اس سبق میں شامل غزلوں ’پیابانِ پیالہ پیاجائے نا‘، ’صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا‘، ’تمہارے مکھ کے گہر تھے سونوڑ و پایا بہشت‘ اور ’پیارے بھنواں ہیں تیریاں جوں کہ چند‘ کے مطالعے کے ذریعے آپ قدیم اردو (دکنی) زبان کے ذائقے سے آشنا ہوں گے۔ آپ اشعار کا مفہوم سمجھنے، مشکل الفاظ کے معنی جاننے اور غزل کے اندازِ بیان کو پہچاننے کے قابل ہوں گے۔ اس سبق سے آپ میں ادب اور تہذیب سے دلچسپی بھی بڑھے گی۔

8.1 تعارف

اس سبق میں آپ ایک ایسے حکمران شاعر کے بارے میں پڑھیں گے جس نے اردو شاعری کے ابتدائی دور میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد قلی قطب شاہ دکن کے بادشاہ تھے اور انہیں شاعری سے گہرا شوق تھا۔ انہوں نے اپنی زبان میں بہت سی غزلیں اور نظمیں کہیں۔ ان کی شاعری میں محبت، حسن، خوشی، دعا اور تہوار کے رنگ نمایاں ہیں۔ اس سبق کی خاص بات یہ ہے کہ آپ صرف ان کی زندگی کے بارے میں نہیں پڑھیں گے بلکہ ان کی منتخب غزلوں کا مطالعہ بھی کریں گے۔ ان غزلوں کے ذریعے آپ کو اندازہ ہو گا کہ پرانی اردو کس قدر شیریں، سادہ اور دلکش تھی اور شاعر اپنے محبوب اور اپنے جذبات کو کس طرح بیان کرتا تھا۔

8.2 محمد قلی قطب شاہ: حیات اور غزل گوئی

سلطان محمد قلی قطب شاہ برصغیر کی تاریخ کے ان ممتاز فرمانرواؤں میں شمار ہوتے ہیں جن میں سیاسی اقتدار، تہذیبی بصیرت اور شعری ذوق بیک وقت جمع تھا۔ وہ سولہویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے اوائل میں دکن کی قطب شاہی سلطنت کے درخشاں حکمران رہے۔ ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شاہانہ شان و شوکت کے باوجود مقامی ہندوستانی لباس اور طرزِ معاشرت کو اختیار کیا اور درباری ثقافت کو مقامی تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے عہد میں گوکنڈہ علم، فن اور ادب کا اہم مرکز بن گیا۔

ان ہی کے زمانے میں حیدر آباد شہر کی بنیاد رکھی گئی اور چارمینار جیسی عظیم یادگار تعمیر کرائی گئی جو آج بھی ان کے تہذیبی شعور کی علامت ہے۔ شہری تعمیر و ترقی، نہروں کی کھدائی، کتب خانوں کے قیام اور عوامی سہولتوں کی فراہمی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض سیاسی حکمران نہیں بلکہ تہذیب کے معمار بھی تھے۔ ان کے دور کی فضا نسبتاً پُر امن تھی، اسی لیے مختلف مذاہب اور قوموں کے تہوار آزادی اور شان کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ ان تقریبات کو ادبی رنگ دینے کے لیے وہ خود بھی نظمیں تحریر فرماتے تھے، جس کا واضح ثبوت ان کے کلیات کے مطالعے سے ملتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں انہیں خاص امتیاز حاصل ہے کہ وہ ابتدائی دور کے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ انہوں نے بڑی کثرت سے شاعری کی اور ہزاروں اشعار کہے جن میں زندگی کے گونا گوں پہلو نمایاں ہیں۔ ان کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ انہوں نے خواص کی شعری روایت کو عوامی زبان میں منتقل کیا۔ ان کی شاعری میں ایک طرف فارسی شعریات کے اثرات — اصناف، اوزان اور تلمیحات نمایاں ہیں تو دوسری طرف عوامی بول چال، مقامی محاورہ اور لوک رنگ بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

ان کے کلام کے موضوعات پر نظر کی جائے تو مذہبی عقیدت اور عشق دونوں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذہبی شاعری میں منقبت، دعا اور روحانی وابستگی کا رنگ ملتا ہے، جبکہ عشقیہ شاعری میں محبوب کا تصور مقامی اور ہندوستانی ماحول سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ محبوبہ کو دیسی پیکروں اور علامتوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں، جس سے ان کے اشعار میں مقامی تہذیب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ اس اظہار میں حسی کیفیت اور لطفِ جذبات بھی شامل ہے۔ بعض ناقدین کے نزدیک ان کی غزلوں میں جذبے کی فراوانی تو ہے مگر وہ فنی گہرائی نسبتاً کم ہے جو بعد کی کلاسیکی غزل کا خاصہ بنی، تاہم چار صدیوں پر محیط قدامت کے باوجود ان کی شاعری کی تہذیبی اور تاریخی قدر مسلم ہے۔

ان کے شعری سرمایے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے تخیل کو ادبی پیکر دینے والے فنکار تھے۔ انہوں نے صرف روایتی مضامین تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ موسموں، تہواروں، مذہبی مواقع اور شخصی مسرتوں تک کو شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے بہت سے گیت اور نظمیں طویل عرصے تک دکن کی عوامی زندگی میں زندہ رہیں۔ اس طرح وہ ایک ایسے حکمران شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں جنہوں نے دربار اور عوام، فارسی روایت اور مقامی زبان، اقتدار اور جذبے سب کو ایک ہی ادبی دھارے میں جمع کر دیا۔

8.2.0 غزل (پیاباج پیالہ پیاجائے نا)

پیاباج پیالا پیاجائے نا
پیاباج یک تل جیاجائے نا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے بغیر نہ محبت و سرور کا جام پیاجا سکتا ہے اور نہ زندگی کا ایک لمحہ بھی گزارا جاسکتا ہے۔ یہاں شاعر نے محبوب کو زندگی اور سرشاری دونوں کا مرکز بنا دیا گیا ہے، اس لیے اس کی عدم موجودگی وجود کو بے معنی کر دیتی ہے۔ ”پیالا“ اپنے ظاہری معنی میں نہیں بلکہ عشق اور کیفِ محبت کا استعارہ ہے، جس سے شعر کی معنویت گہری ہو جاتی ہے۔ دونوں مصرعوں میں ”پیاباج“ اور ”جائے نا“ صنعتِ تکرار کے ذریعے عاشق کی بے بسی، مجبوری اور شدتِ محرومی کو نمایاں کرتی ہے اور ساتھ ہی کلام میں نغمگی اور آہنگ بھی پیدا کرتی ہے۔ پینا اور جینا کے مقابلے میں نہ پینا اور نہ جینا صنعتِ تضاد کو ظاہر کرتا ہے، جس سے محبوب کی ناگزیر حیثیت اور زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔

کہی تھے پیا بن صوری کروں
کھیا جائے اما کیا جائے نا

اس شعر میں شاعر اپنی سابقہ بات اور موجودہ حالت کے درمیان فرق کو سچائی سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تو کہا تھا کہ محبوب کے بغیر صبر کر لوں گا، مگر اب کیفیت یہ ہے کہ نہ کچھ کھایا جاتا ہے اور نہ کوئی تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ اس طرح عشق نے اس کے دعوے کو عملی طور پر باطل کر دیا ہے۔ یہاں، ”کھیا جائے نا“ محض بھوک نہ لگنے کا بیان نہیں بلکہ شدید ذہنی اضطراب اور غم عشق کا کنایہ ہے، جس سے کیفیت کی گہرائی بڑھتی ہے۔ صبر کے دعوے اور بے قراری کی حالت کے درمیان واضح معنوی تضاد موجود ہے جو شعر میں داخلی کشمکش کو نمایاں کرتا ہے۔

نہیں عشق جس دو بڑا کوڑ ہے
کدھیں اس سے مل بیسا جائے نا

شاعر کہتا ہے کہ جس شخص کو عشق کا درد نصیب نہیں ہوا وہ گویا ایک بڑی ”بیماری“ سے محروم ہے، یعنی یہاں بیماری کا لفظ الٹ معنی میں استعمال ہوا ہے اور عشق کو اصل زندگی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس خیال کے ذریعے شاعر عشق کو انسانی کمال سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی لیے وہ ایسے شخص سے میل جول بھی پسند نہیں کرتا جو اس سوز سے خالی ہو۔ یہاں، ”کوڑ“ بیماری نہیں بلکہ عشق کے درد کا استعارہ ہے۔ بیماری کو نعمت بنانا شعر کو چونکا دینے والی معنوی تازگی دیتا ہے۔ اس طرح شعر میں تصوف اور عشق کا فلسفہ ایک ساتھ جمع ہو جاتا ہے۔

قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند
دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

اس شعر میں شاعر اپنے آپ سے خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے کہ اے قطب! اس دیوانے کو نصیحت نہ کر، کیونکہ دیوانگی عشق کی حالت میں عقل کی باتیں اثر نہیں کرتیں۔ یہاں دیوانگی کو منفی نہیں بلکہ سچے عشق کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نصیحت اور عقل کا نظام عشق کی وارفستگی کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے۔ شاعر نصیحت کے بے اثر ہونے کی وجہ بھی خود ہی بتاتا ہے کہ دیوانہ نصیحت قبول کرنے کی حالت میں نہیں ہوتا، اس طرح حسن تعلیل کی صنعت پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ پند (عقل) اور دیوانگی (عشق) کا تقابل واضح صنعت تضاد پیدا کرتا ہے۔

8.2.1 غزل (صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا)

صبر سوں معمور تھا مندر سو بچ دیوانے کا
عشق آپ آ کیا سودا سو میرے خانے کا

شاعر کہتا ہے کہ اس دیوانے کا گھر (دل/وجود) پہلے صبر سے بھرا ہوا تھا، گویا ایک عبادت گاہ کی طرح پرسکون اور قائم تھا، مگر جب عشق خود آکر داخل ہوا تو اس نے سب کچھ بدل ڈالا اور اس گھر کو دیوانگی اور وارفتگی کا مرکز بنا دیا۔ یہاں عاشق کی داخلی حالت کی تبدیلی بیان ہوئی ہے۔ صبر سے عشق تک کا سفر۔ ”مندر“ دل یا باطن کا استعارہ ہے اور ”دیوانے کا خانہ“ عاشق کا وجود ہے۔ عشق کو ایسا طاقتور عامل دکھایا گیا ہے جو خود آتا ہے اور نظام بدل دیتا ہے، اس میں صنعتِ تشخیص بھی ہے کیونکہ عشق کو فاعل کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ صبر اور سودا (دیوانگی) کے درمیان واضح معنوی تضاد موجود ہے جو کیفیت کی تبدیلی کو نمایاں کرتا ہے۔ صوفیانہ رنگ بھی جھلکتا ہے کہ دل پہلے عبادت گاہ تھا، پھر عشق نے اسے اپنی جلوہ گاہ بنالیا۔

وصل کہہ یا دوری اے دونوں کا معنی ایک ہے
نس میں جگنا شمع پروا کیا شے پروانے کا

شاعر کہتا ہے کہ وصل اور دوری بظاہر دو مختلف حالتیں ہیں، مگر عشق کی شدت میں دونوں کا اثر ایک جیسا ہو جاتا ہے، کیونکہ اصل کیفیت اندر جلنے اور تڑپنے کی ہے۔ جیسے شمع اور پروانہ دونوں جلنے کے عمل سے وابستہ ہوتے ہیں، اسی طرح عاشق وصل میں بھی جلتا ہے اور ہجر میں بھی۔ ”نس میں جگنا“ اندرونی سوز اور مسلسل حرارت کی علامت ہے۔ شمع اور پروانہ کلاسیکی عشقیہ استعارے ہیں۔ شمع محبوب اور پروانہ عاشق، جن کی باہمی نسبت صنعتِ مراعات النظر پیدا کرتی ہے۔ وصل اور دوری کو ایک معنی قرار دینا فکری paradox (معنوی الٹ) ہے جو عشق کی نفسیاتی گہرائی ظاہر کرتا ہے۔ اس شعر میں تمثیل کے ذریعے بھی خیال کو مجسم بنادیا گیا ہے، جو شعر کا بڑا فنی حسن ہے۔

سب ہی کچھ کوں انت ہیں نا پیم حرف کوں انت نیں
بہوت ڈھونڈ دیکھے نہ پائے انتھ نیبہ افسانے کا

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز کی کوئی نہ کوئی حد اور انتہا ہے، مگر لفظ، معنی اور بیان کی کوئی آخری حد نہیں۔ میں نے بہت تلاش کیا مگر اس کہانی اور بیان کی گہرائی کا کوئی آخری کنارہ نہیں ملا۔ یہاں زبان اور معنی کی لامحدود وسعت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ ”حرف“ علم، بیان اور تخلیق کا

استعارہ بن جاتا ہے۔ مادی اشیا کی حد لفظ کی بے حدی یہ معنوی تضاد پیدا کرتا ہے۔ اس شعر میں فکری اور تنقیدی شعور جھلکتا ہے، جو محض عشقیہ نہیں بلکہ ادبی و فلسفیانہ جہت بھی رکھتا ہے۔

عاشقوں کا دور ہے آلودہ تیرے بارے تھے
سنگ سکیں باندھے ہیں بنیاد اس میخانے کا

شاعر کہتا ہے کہ یہ دور عاشقوں کا ہے جو تیرے عشق میں آلودہ اور سرشار ہیں اور اسی عشق نے اس میخانے (محفلِ عشق / روحانی حلقہ) کی بنیاد رکھی ہے۔ ”میخانہ“ یہاں صوفیانہ اور عشقیہ مرکز کا استعارہ ہے جہاں عشق کی مے تقسیم ہوتی ہے۔ عاشقوں کے اجتماع کو عمارت کی بنیاد سے تشبیہ دینا شعر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ میخانہ، مے، عاشق یہ سب ایک ہی معنوی دائرے کے الفاظ ہیں، اس لیے صنعتِ مراعات النظر پیدا ہوتی ہے۔ اجتماعی عشق کا منظر شعر کو وسعت دیتا ہے۔

قطب کے میخانے تھے مے پیا آساں کام نئیں
بن محمد کون پیوے سے سو اس پیمانے کا

شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میخانے کی مے پینا آسان کام نہیں، ہر شخص اس پیمانے سے نہیں پی سکتا۔ یہاں ”مے“ عشق یا معرفت کا استعارہ ہے اور ”پیمانہ“ استعداد اور ظرف کی علامت ہے۔ مطلب یہ کہ عشق حقیقی یا معرفت خاص ہر کسی کے نصیب میں نہیں آتی، اس کے لیے خاص ظرف چاہیے۔ عشق کو مے اور دل کو پیمانہ کہنا کلاسیکی صوفیانہ استعارہ ہے۔ سوالیہ انداز ”کون پیوے“ صنعتِ استفہام پیدا کرتا ہے جو معنی میں زور اور امتیاز پیدا کرتا ہے۔ میخانہ، مے اور پیمانہ کی لفظی رفاقت صنعتِ مراعات النظر کو ظاہر کرتی ہے۔

8.2.2 غزل (تمہارے مکھ کے گھر تھے سو نور پایا بہشت)

تمہارے مکھ کے گھر تھے سو نور پایا بہشت عدن
چمن میں تمن مہر کا ہوا ہے کشت

شاعر محبوب کے چہرے کی چمک اور حسن کو اس درجہ بلند کرتا ہے کہ اسے جنتِ عدن کے نور کا سبب قرار دیتا ہے۔ گویا بہشت کی روشنی بھی محبوب کے مکھ (چہرے) کے جواہر سے حاصل ہوئی ہے۔ دوسرے مصرع میں سورج کی روشنی کو چمن میں بوئی ہوئی فصل کی طرح بتایا گیا ہے، یعنی حسنِ محبوب سے پوری کائنات کا حسن پیدا ہوا۔ یہاں محبوب کا چہرہ نور کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ ”مکھ کے گھر“ ایک بلیغ استعارہ ہے جس میں چہرے کی

تابانی کو جواہر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بہشت، نور، مہر، چمن یہ سب روشنی اور حسن کے زمرے میں آتے ہیں، اس لیے صنعتِ مراعاتِ النظر پیدا ہوتی ہے۔ مبالغہ بھی نمایاں ہے کہ جنت کا نور بھی محبوب سے منسوب کر دیا گیا۔

پیا کے حسن تھے سورج چھپا ہے مغرب میں
گلے میں طوق سو دیکھ چاند کے مرا یہ سرشت

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا حسن سورج جیسا ہے جس کے سامنے سورج خود مغرب میں چھپ گیا، یعنی محبوب کا نور آفتاب سے بھی بڑھ کر ہے۔ دوسرے مصرع میں چاند کو طوق (ہار/حلقہ) کی طرح گلے میں پڑا دکھایا گیا ہے، گویا کائنات کے اجرام محبوب کے حسن کے زیور بن گئے ہیں۔ یہ حسن کو کائنات کی سطح تک بلند کرنے کا انداز ہے۔ سورج اور چاند کو محبوب کے تابع دکھانا شدید مبالغہ ہے۔ سورج، مغرب، چاند، طوق تصویری پیکر بناتے ہیں، جس سے شعر میں منظر نگاری پیدا ہوتی ہے

رقم ہوا ہے مرے خیال میں سچا تو خیال
نہ حک تھے جائے نہ آب زلال تھے او نوشت

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی سچی تصویر اور حقیقت میرے خیال میں رقم ہو چکی ہے، اسے نہ کسی جگہ کی قید ہے اور نہ کسی صاف پانی یا تحریر کی ضرورت۔ وہ میرے باطن میں نقش ہے۔ یعنی اصل نقش دل اور خیال میں بنتا ہے، باہر کے وسائل غیر ضروری ہیں۔ ”خیال میں رقم ہونا“ ایک لطیف استعارہ ہے جو باطنی ادراک کو ظاہر کرتا ہے۔ ”حک، نوشت، رقم“ سب تحریر کے دائرے کے الفاظ ہیں، اس لیے صنعتِ مراعاتِ النظر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر باطن کا تقابل بھی معنوی تضاد پیدا کرتا ہے۔

تو مکھ کے باغ تھے مو آرزو کے پھول کھلے
سو اس نہال کوں بلاتے باغبان نشست

شاعر محبوب کے چہرے کو ایک باغ سے تشبیہ دیتا ہے جہاں آرزو کے پھول کھلتے ہیں۔ یعنی محبوب کا دیدار خواہشوں اور امیدوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ ”نہال“ (پودا) عاشق یا محبت کے جذبے کا استعارہ ہے جسے باغبان (مرشد، محبوب، راہنما) بلا کر بٹھاتا ہے، یعنی پرورش دیتا ہے۔ باغ، پھول، نہال، باغبان صنعتِ مراعاتِ النظر کو ظاہر کرتے ہیں۔

سو باس تیرے تھے آپ دل میں لالہ داغ دیا
پھولاں سو باغ میں تج باج دستے ہیں سب زشت

شاعر کہتا ہے کہ تیری خوشبو اور اثر نے دل میں گل لالہ (Tulip) کی طرح داغ پیدا کر دیا، یعنی عشق کا زخم بھی سرخی اور حسن رکھتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ تیرے بغیر باغ کے سارے پھول بد صورت لگتے ہیں۔ محبوب کو حسن کا معیار بنادیا گیا ہے۔ ”لالہ داغ“ کلاسیکی استعارہ ہے۔ شعر میں زخم کو گل لالہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

نہ کر خیال ہی پی شراب مست ہوئے
کہ مکھ کے پانی تیرے تھے سدا ہیں مست بہشت

شاعر کہتا ہے کہ ظاہری شراب پینے کی ضرورت نہیں، محبوب کے چہرے کی تازگی اور آب (چمک) ہی ایسی ہے کہ اس سے ہمیشہ کی مستی حاصل ہو جاتی ہے۔ یعنی حسن محبوب ہی اصل مے ہے۔ یہاں ”مکھ کا پانی“ شراب کا استعارہ ہے۔ یہ صوفیانہ انداز بیان ہے۔ شراب، چہرہ کا نور یہ سب استعارے ہیں۔ اس شعر میں مستی کو روحانی کیفیت بنادیا گیا ہے اور صوفیانہ علامت نگاری بھی شعر میں نمایاں ہے۔

پیا کا حسن معانی ہے جگ میں جیوں اوتار
سپند حالوں لگے مت اُسے کسی کی دشت

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا حسن دنیا میں معنی اور سچائی کا اوتار (ظہور) ہے، یعنی وہ حسن محض ظاہری نہیں بلکہ روحانی حقیقت رکھتا ہے۔ ”سپند“ کی طرح اس کے ذکر سے دل جلتے اور مہکتے ہیں۔ شاعر تنبیہ کرتا ہے کہ اسے عام صحرا (خشک نظر/عام فہم) سے نہ دیکھو۔ حسن کو ”معانی“ اور ”اوتار“ کہنا استعارہ تجسیم ہے۔ مذہبی اور روحانی علامت (اوتار) شعر کو اور معنی خیز بناتا ہے۔

8.2.3 غزل (پیاری بھنواں ہیں تیریاں جوں کہ چند)

پیاری بھنواں ہیں تیریاں چوں کہ چند
اسے دیکھنے میں ہیں عشاق بند

شاعر محبوب کی بھنواؤں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیری بھنویں چاند کی طرح خوبصورت اور دلکش ہیں اور ان کے حسن کو دیکھ کر عاشق مہبوت اور بند سے ہو جاتے ہیں، یعنی ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ یہاں بھنواؤں کو چاند سے تشبیہ دینا حسن کی لطافت اور نورانیت کو ظاہر کرتا

ہے، جبکہ عاشقوں کا ”بند“ ہو جانا شدتِ اثر اور وارفتگی کا مبالغہ آمیز بیان ہے۔ بھنویں اور چاند کے درمیان صنعتِ تشبیہ قائم ہوئی ہے اور حسن کے اثر کو حد سے بڑھا کر دکھانے میں صنعتِ مبالغہ نمایاں ہے۔ محبوب کے ایک عضو (بھنویں) کو مرکز بنا کر کیفیت پیدا کرنا جزو سے کل کے حسن کا انداز بھی ہے، جو کلاسیکی غزل کا معروف طریقہ ہے۔

توں سولہ سنگاراں کوں جب چین آئے
تجھے دیکھ کر پائے عیشاں آئند

شاعر کہتا ہے کہ جب تو سولہ سنگار کر کے سامنے آتی ہے تو دیکھنے والے عیش و مسرت حاصل کرتے ہیں، یعنی تیرا آراستہ حسن دوسروں کے لیے خوشی اور سرور کا سبب بن جاتا ہے۔ ”سولہ سنگار“ مکمل آرائش اور نسوانی جمال کا استعارہ ہے۔ محبوب کے دیدار سے دوسروں کو ”آئند“ ملنا حسن کی فیاضی کو ظاہر کرتا ہے۔ سنگار، عیش، آئند سب خوشی اور جمال کے دائرے کے الفاظ ہیں، اس لیے صنعتِ مراعات النظر پیدا ہوتی ہے۔ حسن کو مسرت کا سرچشمہ بنانا مبالغہ کا پہلو بھی رکھتا ہے۔

ہوئے عاشقاں بے خبر دیکھ تج تجھے
کون سکلائے آئے مست چھند

شاعر کہتا ہے کہ تجھے بار بار دیکھ کر عاشق بے خبر اور بے خود ہو جاتے ہیں اور جو بھی آتا ہے مستی اور وارفتگی کی حالت میں آتا ہے۔ محبوب کا جلوہ ہوش سلب کر لینے والی قوت رکھتا ہے۔ ”بے خبر“ اور ”مست“ کیفیتِ وجد اور جذب کی علامتیں ہیں جو صوفیانہ رنگ بھی پیدا کرتی ہیں۔ دیکھنے کی تکرار (”تج تجھے“) صنعتِ تکرار کے ذریعے شدتِ اثر کو بڑھاتی ہے۔ عاشقوں کی اجتماعی بے خودی مبالغہ کو ظاہر کرتی ہے۔ شعر میں مستی کا استعارہ عشق کی سرشاری کو مجسم بناتا ہے۔

بہوت بھید سیتی تو فتنائیں سو آئے
نظر نا لگے تیوں کرو ان سپند

شاعر کہتا ہے کہ تیرا حسن بہت سے راز اور فتنے اپنے ساتھ لاتا ہے، اس لیے نظرِ بد سے بچانے کے لیے سپند (اسپند / حرمل) جلاؤ۔ یعنی حسن اتنا نمایاں ہے کہ اسے بد نظر لگنے کا اندیشہ ہے۔ یہاں حسن کو فتنہ کہنا صنعتِ استعارہ ہے جو حسن کی کشش اور ہنگامہ خیزی کو ظاہر کرتا ہے۔ ”سپند جلانا“ ایک تہذیبی اور ثقافتی علامت ہے جو نظرِ بد سے بچاؤ کا کنایہ ہے۔ بھید، فتنہ، نظر معنوی طور پر مربوط الفاظ ہیں، اس لیے مراعات النظر بھی موجود ہے۔

سباتی ہے مہمات کی رات چھب
کہ اس نور کی پتلی ہوں مل اند

شاعر کہتا ہے کہ یہ خوبصورت (چھب والی) رات اہم اور بابرکت ہے کیونکہ اس نورانی چہرے کی پتلی (آنکھ / جلوہ) سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ محبوب کا نور رات کو بھی روشن اور بامعنی بنا دیتا ہے۔ رات اور نور کا تقابل صنعت تضاد پیدا کرتا ہے، کیونکہ رات اندھیرے کی علامت ہے مگر محبوب کا نور اسے روشن کر دیتا ہے۔ ”نور کی پتلی“ ایک بلیغ استعارہ ہے جو آنکھ یا جلوہ چہرہ کے لیے آیا ہے۔ رات، نور، چھب تصویریں فضا بناتے ہیں، جس سے پیکر نگاری پیدا ہوتی ہے۔

پیا گھر میں دن دن صفت عید ہے
کہ عیدوں ہو یاں ان تھے سب ارجمند

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے گھر میں ہر دن عید کی طرح ہے، کیونکہ اس کی موجودگی ہر وقت کو خوشی اور برکت میں بدل دیتی ہے۔ یعنی محبوب کی نسبت سے معمول کا دن بھی جشن بن جاتا ہے۔ ”عید“ خوشی اور مسرت کی علامت ہے۔ دن کو عید کے رشتے کے ساتھ جوڑنا صنعت تشبیہ کو ظاہر کرتا ہے۔

بنی کی غلامی میں ہے قطب شاہ
صفت اسکے ہے نانوں کی چاروں کھنڈ

شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ قطب شاہ اس محبوب (یا مرشد / ممدوح) کی غلامی میں ہے اور اس کی تعریف چاروں طرف، چاروں سمتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ درباری اور عقیدتی لہجہ ہے جس میں مدح کا رنگ نمایاں ہے۔ ”غلامی“ یہاں محبت اور عقیدت کا استعارہ ہے۔ چاروں کھنڈ (چاروں جہات) مبالغہ کے ذریعے شہرت کی وسعت ظاہر کرتے ہیں۔

8.2.4 سرگرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے، تو نیچے دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جاننے کے لیے حصہ 8.8 سے رجوع کریں۔

1. محمد قلی قطب شاہ اردو کے ابتدائی دور کے _____ شاعر ہیں۔
2. ”پیاباج پیالہ پیاجائے نا“ ایک _____ ہے۔
3. دکنی شاعری میں ”مکھ“ کا مطلب _____ ہے۔
4. میخانہ اور مے صوفیانہ شاعری میں _____ کے استعارے ہیں۔
5. ”پند“ کے معنی _____ ہیں۔
6. ”پیالا“ اکثر اشعار میں _____ کا استعارہ ہے۔

8.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں آپ نے محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت، ان کے عہد کے تہذیبی پس منظر اور ان کی غزل گوئی کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ آپ نے جانا کہ وہ صرف ایک حکمران نہیں بلکہ ایک صاحب دیوان شاعر بھی تھے جنہوں نے دکنی اردو میں غزل کو فروغ دیا۔ ان کے دور میں حیدر آباد اور گوکنڈہ علم و ادب کے مراکز بنے اور شاعری کو درباری اور عوامی دونوں سطحوں پر پذیرائی ملی۔ سبق میں شامل غزلوں کے اشعار کے ذریعے آپ نے دیکھا کہ ان کی شاعری میں محبت، حسن، مذہبی عقیدت، سرشاری اور تہذیبی رنگ نمایاں ہیں۔ دکنی زبان کی مٹھاس، سادہ بیان، مقامی تشبہات اور فارسی اثرات سب مل کر ایک منفرد شعری آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ ہر غزل کی تشریح کے ساتھ آپ نے شعری محاسن جیسے تشبیہ، استعارہ، تضاد، مراعات النظیر، مبالغہ اور حسن تعلیل کو بھی پہچانا۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

- محمد قلی قطب شاہ کی ادبی حیثیت بیان کر سکتے ہیں۔
- دکنی غزل کی بنیادی خصوصیات بتا سکتے ہیں۔
- منتخب غزلوں کا مفہوم بیان کر سکتے ہیں۔
- شعری محاسن جیسے تشبیہ، استعارہ اور تضاد پہچان سکتے ہیں۔
- قدیم دکنی الفاظ کے معنی سمجھ سکتے ہیں۔

8.5 فرہنگ

لفظ	معنی
باج	بغیر

ایک لمحہ	یک تل
صبر	صبوری
نصیحت	پند
عشق / دیوانگی	سودا
چہرہ	مکھ
جواہر	گہر
حرمل	سپند
آرائش	سنگار
معزز	ارجمند

8.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. محمد قلی قطب شاہ کس سلطنت کے حکمران تھے؟

2. ان کی شاعری کی دو خصوصیات لکھیں۔

3. دکنی غزل میں زبان کیسی ہے؟

4. ”پیالا“ کس چیز کا استعارہ ہے؟

5. قلی قطب شاہ کی شاعری کے دو مرکزی موضوعات بتائیں۔

1. محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت اور دورِ حکومت کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. غزل، ”پیاباج پیالہ پیاجائے نا“ کا مرکزی خیال بیان کریں اور اس کے منتخب اشعار کی تشریح کیجیے۔
4. غزل، ”صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا“ کی روشنی میں صبر، عشق، میخانہ، مے کی وضاحت کیجیے۔
5. محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں حسن اور عشق کے بیان کا جائزہ لیجیے،

8.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1. محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت اور دورِ حکومت کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
- محمد قلی قطب شاہ دکن کی قطب شاہی سلطنت کے ممتاز فرمانروا تھے جن میں حکمرانی، تہذیبی شعور اور ادبی ذوق بیک وقت جمع تھا۔ وہ صرف ایک سیاسی حکمران نہیں بلکہ ایک باذوق شاعر اور تہذیب پرور شخصیت کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے دور میں گو لکنڈہ اور اس کے گرد و نواح علم و ادب، فنِ تعمیر اور ثقافتی سرگرمیوں کے اہم مراکز بنے۔
- انہوں نے حیدر آباد شہر کی بنیاد رکھی اور چارمینار جیسی تاریخی عمارت تعمیر کرائی، جو آج بھی ان کے تہذیبی وژن کی علامت ہے۔ انہوں نے نہریں، کتب خانے اور عوامی سہولتوں کے کئی منصوبے شروع کیے۔ ان کے عہد کی ایک نمایاں خصوصیت مذہبی رواداری تھی۔ مختلف مذاہب کے تہوار آزادی اور احترام کے ساتھ منائے جاتے تھے۔ وہ خود بھی ان مواقع پر نظمیں کہتے تھے۔ اس طرح ان کا دور سیاسی استحکام کے ساتھ ادبی اور ثقافتی عروج کا زمانہ بھی تھا۔
2. محمد قلی قطب شاہ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
- محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کی غزل گوئی کی سب سے نمایاں خصوصیت زبان کی سادگی اور مقامی رنگ ہے۔ انہوں نے دکنی اردو میں شاعری کی جو عوامی بول چال کے قریب تھی، اسی لیے ان کا کلام گیتوں جیسا لطف دیتا ہے۔
- ان کی غزلوں میں عشق، حسن، مذہبی عقیدت اور سرور کے مضامین نمایاں ہیں۔ وہ محبوب کو دیسی پیکروں اور علامتوں کے ذریعے پیش کرتے ہیں جیسے مکھ، بھنویں، سنگار وغیرہ۔ فارسی شعریات کا اثر بھی ان کے ہاں موجود ہے بحور، اصناف، تلمیحات اور استعارے مگر بیان مقامی فضا سے جڑا رہتا ہے۔ ان کی شاعری میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور مراعات النظر کا خوب استعمال ملتا ہے۔ جذبات کی شدت تو نمایاں ہے، اگرچہ بعد کی کلاسیکی غزل جیسی فنی تہہ داری کم نظر آتی ہے، مگر تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے ان کی غزل نہایت اہم ہے۔

3. غزل، ”پیاباج پیالہ پیاجائے نا“ کا مرکزی خیال بیان کریں اور اس کے منتخب اشعار کی تشریح کیجیے۔

اس غزل کا مرکزی خیال محبوب کے بغیر زندگی کی بے معنویت اور عشق کی ناگزیریت ہے۔ شاعر کے نزدیک محبوب ہی زندگی، سرور اور وجود کا مرکز ہے۔

پیاباج پیالہ پیاجائے نا / پیاباج یک تل جیا جائے نا

یہاں، ”پیالہ“ عشق اور سرور کا استعارہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے بغیر نہ عشق کا جام پیاجا سکتا ہے اور نہ ایک لمحہ جیا جاسکتا ہے۔ تکرار سے شدتِ احساس اور نغمگی پیدا ہوئی ہے۔

کہی تھے پیابن صوری کروں / کھیا جائے اما کیا جائے نا

شاعر اپنے دعوے اور حالت کا تضاد دکھاتا ہے۔ کہتا ہے میں نے صبر کا کہا تھا مگر اب نہ کھایا جاتا ہے نہ کوئی چارہ سمجھ آتا ہے۔ یہ عشق کی بے قراری کا بیان ہے۔

قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند

یہاں شاعر خود کلامی کرتا ہے کہ دیوانہ عشق کو نصیحت بے اثر ہے۔ پند (عقل) اور دیوانگی (عشق) کا تضاد نمایاں ہے۔

4. غزل، ”صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا“ کی روشنی میں صبر، عشق، میخانہ، مے کی وضاحت کیجئے۔

اس غزل میں شاعر باطنی تبدیلی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ صبر سے عشق تک کا سفر۔

صبر سوں معمور تھا مندر سو منج دیوانے کا / عشق آپی آکیا سودا سو میرے خانے کا

دل کو، ”مندر“ کہا گیا یعنی عبادت گاہ جیسا پر سکون مقام، مگر عشق آکر اسے دیوانگی کا گھر بنا دیتا ہے۔ عشق کو فاعل بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

میخانہ، مے، پیانہ یہ سب صوفیانہ استعارے ہیں:

• مے = عشق یا معرفت

• میخانہ = روحانی یا عشقیہ محفل

• پیانہ = دل کا ظرف

شاعر کہتا ہے کہ ہر شخص اس پیانے سے نہیں پی سکتا یعنی عشق و معرفت ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔

5. محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں حسن اور عشق کے بیان کا جائزہ لیجیے،

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں حسن اور عشق کا بیان نہایت رنگین، حسی اور مقامی انداز میں ملتا ہے۔ وہ محبوب کو دیہی علامتوں سے پیش کرتے ہیں مکھ، بھنویں، سنگار، خوشبو، چاند جس سے اشعار میں ہندوستانی تہذیبی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

تمہارے مکھ کے گہر تھے سو نور و پایا بہشت

محبوب کے چہرے کو نور اور جواہر کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔ جنت کے نور کو بھی محبوب سے منسوب کرنا مبالغہ اور استعارہ دونوں ہے۔

پیاری بھنواں ہیں تیریاں جوں کہ چند

بھنواؤں کو چاند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جزوی حسن (بھنویں) سے حسن کا اثر پیدا کیا گیا ہے۔ عاشقوں کا مہبوت ہو جانا شدتِ تاثیر کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے ہاں عشق زیادہ تر جذبہ حسن اور حسی مسرت سے جڑا ہوا ہے۔ صوفیانہ اور روحانی اشارے بھی ملتے ہیں، مگر غالب رنگ عشقیہ اور جمالیاتی ہے۔ یوں ان کی شاعری حسن و عشق کا ایک دلکش اور ابتدائی دکنی نمونہ پیش کرتی ہے۔

8.8 جوابات سرگرمی (خالی جگہیں)

1. صاحب دیوان

2. غزل

3. چہرہ

4. عشق / معرفت

5. نصیحت

6. عشق / سرور

8.9 امدادی کتب

- تاریخ ادبِ اردو ڈاکٹر جمیل جالبی
- اردو کا ابتدائی زمانہ شمس الرحمن فاروقی
- کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری
- انتخابِ کلام قلی قطب شاہ سیدہ جعفر
- دکنی ادب کی تاریخ ڈاکٹر سید محی الدین قادری
- دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی

سبق نمبر ۹۔ ولی دکنی

ساخت

9.0 اغراض و مقاصد

9.1 تعارف

9.2 ولی دکنی حیات اور غزل گوئی

9.2.0 کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ

9.2.1 جسے عشق کا تیر کاری لگے

9.2.2 عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا

9.2.3 تجھ لب کی صفت لعل بد خشاں سوں کہوں گا

9.2.4 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

9.3 عمومی جائزہ

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

9.5 فرہنگ

9.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

9.7 مشقی سوالات

9.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

9.8 جوابات سر گرمی

9.9 امدادی کتب

اس سبق کا بنیادی مقصد آپ کو اردو غزل کی تاریخ میں ولی دکنی کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کرنا ہے۔ اس مطالعے کے ذریعے آپ ولی کی شخصیت، ان کے عہد کے ادبی اور تہذیبی پس منظر اور ان کی شاعری کی فنی و لسانی خصوصیات کو سمجھ سکیں گے۔

مزید یہ کہ آپ ولی کے سفرِ دہلی کی ادبی اہمیت، ان کے دیوان کے اثرات اور اردو غزل کی تشکیل میں ان کے تاریخی کردار کا تجزیہ کر سکیں گے۔ آپ ان کی زبان کی سادگی، شیرینی، روانی اور دکنی، فارسی اور ہندوی عناصر کے امتزاج کو پہچان سکیں گے اور یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ انہوں نے وارداتِ قلبی کو کس طرح مؤثر اور دلکش پیرائے میں پیش کیا۔

اس سبق میں ولی کی منتخب غزلوں کا مطالعہ بھی کیا جائے گا تاکہ آپ ان کے اسلوب، موضوعات، تشبیہات و استعارات اور فنی محاسن کو براہِ راست متن کی روشنی میں سمجھ سکیں۔ اس طرح آپ نہ صرف معلومات حاصل کریں گے بلکہ تنقیدی شعور کے ساتھ ان کے کلام کا جائزہ لینے کے قابل بھی ہو سکیں گے۔

9.1 تعارف

اردو غزل کی کلاسیکی روایت میں ولی دکنی کو ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے اس دور میں شاعری کی جب ریختہ ابھی اپنی ابتدائی تشکیل کے مرحلے میں تھا، مگر اپنے فنی شعور اور لسانی مہارت کے ذریعے اسے ادبی وقار عطا کیا۔ دکن کے ماحول میں تربیت پانے والے اس شاعر نے اپنے سفر اور علمی جستجو کے ذریعے مختلف علاقوں کے ادبی اثرات کو جذب کیا اور ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو نہ صرف دلنشین تھا بلکہ ہمہ گیر بھی ثابت ہوا۔

ان کا دہلی کا سفر اردو ادب کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی کے نتیجے میں ان کا دیوان شمالی ہند کے شعری حلقوں تک پہنچا اور وہاں کے شعرا کے ذوق پر گہرا اثر ڈالا۔ ولی کی شاعری میں سادگی اور سوزِ دل کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ عشق اور جذباتِ انسانی کو براہِ راست مگر لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اس سبق میں آپ ولی دکنی کی زندگی، ان کے ادبی سفر، فنی خصوصیات اور اردو غزل پر ان کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ ساتھ ہی ان کی منتخب غزلوں کے ذریعے ان کے اسلوب اور شعری کمال کا عملی مشاہدہ بھی کریں گے، تاکہ اردو غزل کی کلاسیکی بنیادوں کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔

9.2 ولی دکنی حیات اور غزل گوئی

اردو غزل کی تاریخ میں ولی دکنی کا نام ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ ان کے وطن اور جائے پیدائش سے متعلق اختلاف ہے۔ کچھ اہلِ گجرات انہیں گجرات سے وابستہ قرار دیتے ہیں جبکہ دکنی محققین کے نزدیک ان کی پیدائش اور ننگ آباد دکن میں ہوئی۔ ان کے کلام کے لسانی شواہد بھی دکنی نسبت کو مضبوط کرتے ہیں۔ اندازہ یہی کیا جاتا ہے کہ وہ سترہویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تربیت دکن کے ماحول میں پائی، تاہم علمی جستجو نے انہیں احمد آباد پہنچایا جو اس زمانے میں علم و

فن کا اہم مرکز تھا۔ وہاں خانقاہی اور درسی فضائے ان کے ذوق کو نکھار اور ان کی شخصیت میں تصوف اور شعری لطافت کا امتزاج پیدا ہوا۔ احمد آباد سے ان کی قلبی وابستگی اس قدر گہری تھی کہ اس شہر کی یاد میں انہوں نے درد بھرے اشعار بھی کہے۔

ولی نے مختلف علاقوں کا سفر کیا اور ان کے کلام میں گجرات، سورت اور دہلی کے اشارات ملتے ہیں۔ دہلی کا سفر ان کی ادبی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ان کے دیوان نے شمالی ہند کے ادبی حلقوں کو چونکا دیا۔ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ دہلی میں سعد اللہ گلشن نے ان کا کلام دیکھ کر انہیں فارسی مضامین کو ریختہ میں برتنے اور دکنی الفاظ کم کرنے کا مشورہ دیا، لیکن جدید تحقیق اس قصے کو قطعی تاریخی حقیقت ماننے میں احتیاط کرتی ہے اور اسے بعد کی ادبی تشکیل بھی قرار دیتی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ ولی کے کلام نے دہلی کے شعری ذوق کو متاثر کیا اور اردو غزل کو نئی سمت دی۔

ولی کی شاعرانہ عظمت محض اس بات میں نہیں کہ وہ ابتدائی دور کے شاعر ہیں بلکہ اس میں ہے کہ انہوں نے غزل کو ایک بھرپور فنی اظہار بنایا۔ ان کی زبان میں سادگی، شیرینی اور روانی ہے۔ دکنی محاورہ، فارسی لطافت اور ہندوی الفاظ کی مٹھاس ان کے ہاں اس طرح گھل مل جاتی ہے کہ شعر نہ تو ثقیل محسوس ہوتا ہے اور نہ سطحی۔ ان کے اشعار میں جذبات کی سچائی، عشق کی وارفتگی اور دل کا سوز نمایاں ہے۔ وہ پیچیدہ فلسفیانہ مباحث میں نہیں الجھتے بلکہ وارداتِ قلبی کو براہِ راست مگر دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں، اسی لیے ان کا کلام عام قاری اور خاص اہل ذوق دونوں کو متاثر کرتا ہے۔

ان کی غزلوں میں تشبیہات اور استعارات تازگی لیے ہوئے ہیں اور بیان میں ایک فطری بہاؤ پایا جاتا ہے۔ بعض جگہ ہندوستانی شعری روایت کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے جہاں اظہارِ محبت محبوبہ کی طرف سے ہوتا ہے، جو فارسی روایت سے مختلف انداز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی صرف مقلد نہیں بلکہ اپنے ماحول اور تہذیبی سرمائے کو شعری پیکر دینے والے شاعر تھے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ قصیدہ، رباعی، مثنوی اور قطعہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی فنی قدرت کا ثبوت دیا، اگرچہ ان کی اصل شہرت غزل ہی کے سبب ہوئی۔

اردو شعری روایت میں ولی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے دکن اور شمالی ہند کی ادبی دنیا کے درمیان ایک مضبوط پُل قائم کیا۔ ان کے دیوان نے ریختہ کو مقبول بنایا اور بعد کے شعر کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اسی بنا پر بعض ناقدین نے انہیں اردو غزل کا معمارِ اول قرار دیا اور ان کا مقابل انگریزی کے چاسر اور فارسی کے رودکی سے کیا۔ ان کی تاریخِ وفات کے بارے میں بھی اختلاف ملتا ہے، مگر اس اختلاف سے ان کے ادبی مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ مجموعی طور پر ولی دکنی وہ شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کو علاقائی دائرے سے نکال کر ہمہ گیر ادبی صنف بنایا اور ایک ایسا اسلوب دیا جس کی بازگشت بعد کی پوری کلاسیکی روایت میں سنائی دیتی ہے۔

9.2.0 غزل (کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ)

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

شاعر کہتا ہے کہ میرے عشق نے اس ظالم اور سنگ دل محبوب کو رفتہ رفتہ نرم کر دیا۔ یہاں "ظالم" محض الزام نہیں بلکہ محبوب کی بے رحمی اور سرد مہری کا استعارہ ہے، اور "آب ہونا" دل کے پگھلنے اور نرم پڑ جانے کی علامت ہے۔ اس طرح شاعر نے کیفیت کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے استعاراتی پیرائے میں پیش کیا ہے، جس سے شعر میں معنوی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر عشق کی تاثیر کو واضح کرنے کے لیے ایک فطری تشبیہ لاتا ہے کہ جس طرح گلاب کی لطافت آگ کی شدت کو کم کرتی ہے، اسی طرح عشق سخت دل کو نرم کر دیتا ہے۔ یہاں "آتش" اور "گلاب" دو متضاد پیکر ہیں؛ ایک سختی اور حرارت کی علامت ہے اور دوسرا نرمی اور لطافت کی۔ اس تضاد نے شعر میں حسنِ تقابل پیدا کر دیا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں گلاب آگ کو نہیں بجھاتا، مگر شاعر نے حسنِ تعلیل کے ذریعے یہ دل کش علت قائم کی ہے۔

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتشِ غم کوں
کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

اس شعر میں شاعر بیان کرتا ہے کہ محبوب کی وفاداری نے اس کے دل میں سلگتی ہوئی غم کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ "آتشِ غم" ایک بلیغ استعارہ ہے جو غم کی شدت اور سوز کو مجسم کر دیتا ہے۔ اس طرح غم کو مجرد کیفیت کے بجائے محسوس شے بنادیا گیا ہے۔

شاعر وفاداری کو گلاب سے تشبیہ دیتا ہے، جو اپنی فطری نرمی سے حرارت کو کم کرتا ہے۔ یہاں بھی آتش اور گلاب کا تضاد موجود ہے، جو معنوی سطح پر نرمی کی سختی پر فح کی علامت بنتا ہے۔ گرمی کے دفع ہونے کو گلاب سے منسوب کرنا حسنِ تعلیل کی عمدہ مثال ہے۔

مرے دل کوں کیا بے خود تری اکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی آنکھوں نے میرے دل کو آہستہ آہستہ بے خود کر دیا۔ یہاں آنکھوں کو شراب سے تشبیہ دی گئی ہے، جو تشبیہ مرکب کی صورت اختیار کر لیتی ہے کیونکہ صرف آنکھوں کی چمک ہی نہیں بلکہ ان کی تاثیر کو بھی شراب کی تاثیر کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

"بے خودی" اور "بے ہوشی" کی کیفیات عشق کی داخلی واردات کو ظاہر کرتی ہیں۔ شاعر نے نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بجائے محبوب کی آنکھوں کو اس کیفیت کی علت قرار دیا ہے، جو حسنِ تعلیل کا خوب صورت نمونہ ہے۔ آنکھوں کا شراب سے زیادہ اثر کرنا ایک لطیف مبالغہ ہے، مگر اس میں اعتدال ہے، اس لیے شعر کا جمالیاتی توازن برقرار رہتا ہے۔

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رو دل مرا پانی
کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

اس شعر میں شاعر محبوب کو "آتشیں رو" کہہ کر مخاطب کرتا ہے، جو بذاتِ خود ایک استعارہ ہے اور محبوب کے چہرے کی سرخی اور اس کی تاثیر دونوں کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرے عشق نے میرے دل کو پانی بنا دیا۔ یہاں "دل کا پانی ہونا" تحلیلِ ذات اور خودی کے پگھل جانے کا استعارہ ہے۔

دوسرے مصرعے میں گلاب کا آگ کے سامنے لگنا ایک مشاہداتی تشبیہ ہے۔ اس تصویر کشی سے شعر میں پیکر تراشی پیدا ہوتی ہے اور قاری کے ذہن میں ایک بصری منظر ابھرتا ہے۔ آتش اور گلاب کا تضاد یہاں بھی برقرار ہے، مگر اس بار زور دل کی نزاکت پر ہے۔

ادا و ناز سوں آتا ہے وو روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

اس شعر میں شاعر محبوب کی آمد کو طلوعِ آفتاب سے تشبیہ دیتا ہے۔ "روشن جبیں" محبوب کے چہرے کے نور کا استعارہ ہے اور اسے آفتاب سے تشبیہ دے کر شاعر نے محبوب کے حسن کو کائناتی وسعت عطا کر دی ہے۔ یہ تشبیہ صرف حسن کی نہیں بلکہ جلال، مرکزیت اور عظمت کی بھی علامت ہے۔

طلوعِ آفتاب کا منظر خود تدریجی ہوتا ہے، اس لیے "آہستہ آہستہ" یہاں محض ردیف نہیں بلکہ منظر کی فطری تکمیل ہے۔ "ادا، ناز، روشن، آفتاب" جیسے نرم اور مترنم الفاظ صوتی حسن پیدا کرتے ہیں، جس سے شعر کی فضا نور اور لطافت سے بھر جاتی ہے۔

9.2.1 جسے عشق کا تیر کاری لگے

جسے	عشق	کا	تیر	کاری	لگے
اسے	زندگی	کیوں	نہ	بھاری	لگے

شاعر کہتا ہے کہ جس شخص کے دل میں عشق کا تیر پوری گہرائی کے ساتھ پیوست ہو جائے، اس کے لیے زندگی کا بوجھل ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ یہاں عشق کو ”تیر“ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو ایک واضح استعارہ ہے۔ تیر کا کام زخمی کرنا ہے، اور عشق بھی دل کو اسی طرح زخمی کرتا ہے۔ ”مکاری لگے“ کا لفظ اس زخم کی شدت کو بڑھا دیتا ہے، گویا یہ معمولی چوٹ نہیں بلکہ گہرا اور جان لیوا وار ہے۔

زندگی کا ”بھاری“ محسوس ہونا صنعتِ مبالغہ کی خوب صورت مثال ہے، کیونکہ حقیقت میں زندگی کا وزن نہیں بڑھتا، بلکہ دل کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ شاعر نے داخلی کرب کو خارجی بوجھ کی صورت میں پیش کر کے ایک نفسیاتی سچائی کو شعری پیکر دے دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر محض تخیل نہیں بلکہ انسانی تجربے کی سچی عکاسی معلوم ہوتا ہے۔

نہ	چھوڑے	محبت	دم	مرگ	تک
جسے	یار	جانی	سوں	یاری	لگے

شاعر کہتا ہے کہ جسے محبوب کے ساتھ سچی اور قلبی یاری نصیب ہو جائے، وہ مرتے دم تک اس محبت کو نہیں چھوڑتا۔ یہاں ”یار جانی“ کی ترکیب محبت کی شدت اور گہرائی کو ظاہر کرتی ہے، گویا محبوب جان کے برابر ہے۔ محبت کے نہ چھوٹنے کی وجہ شاعر نے اسی ”یار جانی سوں یاری“ کو قرار دیا ہے، جو ایک شعری علت ہے؛ یہی حسنِ تعلیل ہے کہ عقلی دلیل کے بجائے جذباتی سبب پیش کیا گیا ہے۔

”دم مرگ تک“ کا استعمال محبت کی دوامیت کو ظاہر کرتا ہے اور اس میں ایجاز بھی ہے، کیونکہ دو مصرعوں میں پوری عمر کی وفاداری سمیٹ دی گئی ہے۔ اس شعر میں وفاداری کو ایک اعلیٰ اخلاقی قدر کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس سے شعر محض عاشقانہ نہیں بلکہ اخلاقی تاثر بھی رکھتا ہے۔

نہ	ہووے	اسے	جگ	میں	ہر گز	قرار
جسے	عشق	کی	بے	قراری	لگے	

شاعر بیان کرتا ہے کہ جسے عشق کی بے قراری نصیب ہو جائے، وہ دنیا میں کبھی سکون نہیں پاسکتا۔ یہاں ”قرار“ اور ”بے قراری“ کا تقابل صنعتِ تضاد کی واضح مثال ہے۔ انہی متضاد الفاظ کے ذریعے عشق کی داخلی کشمکش نمایاں ہو جاتی ہے۔

”جگ میں ہر گز قرار“ کا عمومی انداز بیان شعر کو آفاقی بنا دیتا ہے۔ شاعر کسی ایک عاشق کی نہیں بلکہ ہر اس شخص کی بات کر رہا ہے جو عشق کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ عشق، بے قراری، عدم سکون کی یہ معنوی ترتیب شعر کے فکری حسن کو مضبوط کرتی ہے اور اسے منطقی ربط عطا کرتی ہے۔

ہر	اک	وقت	مجھ	عاشق	پاک	کوں
پیارے	تری	بات	پیاری	لگے		

شاعر کہتا ہے کہ میں جو ایک پاکیزہ عاشق ہوں، مجھے ہر وقت محبوب کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ یہاں، ”عاشق پاک“ کی ترکیب عشق کو روحانی سطح پر لے جاتی ہے اور یہ تاثر دیتی ہے کہ یہ محبت محض جسمانی یا وقتی نہیں بلکہ خالص اور بے غرض ہے۔

محبوب کی ہر بات کا پیارا لگنا شدتِ محبت کی علامت ہے۔ لفظ ”پیارے“ اور ”پیارے“ کی تکرار صوتی حسن بھی پیدا کرتی ہے اور جذباتی وابستگی کو بھی بڑھاتی ہے۔ اس شعر کی اصل خوبی اس کی سادگی اور سلاست ہے؛ نہ پیچیدہ تشبیہ ہے نہ مبالغہ آمیز منظر، مگر احساس کی سچائی اسے مؤثر بنا دیتی ہے۔ یہی ولی کی شاعری کا امتیاز ہے کہ وہ سادہ الفاظ میں گہری کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

ولیؔ کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیبوں کے دل میں کٹاری لگے

شاعر کہتا ہے کہ اگر محبوب صرف ایک بات بھی مجھ سے کہہ دے تو وہی بات رقیب کے دل میں کٹاری کی طرح چبھ جاتی ہے۔ یہاں ”کٹاری“ واضح استعارہ ہے جو حسد، جلن اور رقابت کی چوٹ کو مجسم کر دیتا ہے۔

محبوب، عاشق اور رقیب تینوں کردار ایک ہی منظر میں جمع ہو گئے ہیں، جس سے شعر میں ڈرامائی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ”یک بچن“ کی معمولی سی بات کو، ”کٹاری“ جیسی تیز شے سے تشبیہ دینا لطیف مبالغہ بھی ہے، جو رقابت کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح شعر میں صرف محبت نہیں بلکہ حسد کی نفسیات بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

9.2.2 غزل (عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا)

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدہ حیراں، نہیں جگ میں نقاب اس کا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا حسن اس قدر آشکار اور ہمہ گیر ہے کہ پوری کائنات اس کے جلووں سے معمور نظر آتی ہے۔ وہ حسن اپنی ذات میں بے حجاب ہے، اس پر کوئی پردہ نہیں۔ اگر کوئی نقاب ہے تو وہ دیکھنے والے کی آنکھوں کی حیرت ہے، جو اس جمالِ مطلق کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔

یہاں، ”حسن بے حجاب“ ایک استعارہ ہے، جو حسن کو مطلق اور ازلی حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ”دیدہ حیراں“ صرف آنکھ نہیں بلکہ انسانی عقل اور شعور کا استعارہ ہے، جو حسن کی وسعت کے سامنے حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ اس طرح شاعر نے پردہ حسن پر نہیں بلکہ انسان کی محدود فہم پر ڈالا ہے، جو ایک گہرا فلسفیانہ نکتہ ہے۔ ”بے حجاب“ اور ”نقاب“ کے تقابل سے صنعتِ تضاد پیدا ہوئی ہے، جس نے شعر میں فکری کشش بڑھادی ہے۔ حسن کے ہر طرف عیاں ہونے کا دعویٰ صنعتِ مبالغہ ہے، مگر یہ مبالغہ محض جذباتی نہیں بلکہ جمالیاتی اور صوفیانہ ہے، جو حسن

کو کائناتی سطح پر لے جاتا ہے۔ حیرت کو نقاب کی علت قرار دینا حسنِ تعلیل کی لطیف مثال ہے، جس سے شعر خشک منطق سے بلند ہو کر تخیل کی فضا میں داخل ہو جاتا ہے۔

ہوا ہے مجھ پہ شمعِ بزمِ یک رنگی سے یوں روشن
کہ ہر ذرہ اوپر تاباں ہے دائمِ آفتاب اس کا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے نور نے میرے باطن کو اس طرح روشن کر دیا ہے جیسے یک رنگی کی محفل میں شمع جل اٹھے۔ اس روشنی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب مجھے کائنات کا ہر ذرہ محبوب کے آفتاب سے منور دکھائی دیتا ہے۔ یہاں شمع، بزم، روشنی، آفتاب، ذرہ اور تاباں جیسے الفاظ ایک ہی معنوی دائرے یعنی نور سے تعلق رکھتے ہیں، جس سے مراعاتِ النظر کی صنعت پیدا ہوتی ہے اور شعر میں معنوی ہم آہنگی قائم رہتی ہے۔ شاعر نے اپنی داخلی کیفیت کو خارجی تمثیل کے ذریعے بیان کیا ہے، جو ایک تمثیلی تشبیہ کا خوب صورت نمونہ ہے۔ ”ہر ذرہ اوپر تاباں ہے آفتاب اس کا“ میں صوفیانہ فکر نمایاں ہے، کیونکہ یہ تصور وحدت الوجود کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایک ہی حقیقت ہر شے میں جلوہ گر ہے۔ آفتاب کو مرکزِ نور بنا کر شاعر نے محبوب کے حسن کو کائناتی مرکزیت عطا کی ہے، جو صنعتِ مبالغہ کے باوجود معنوی سطح پر با معنی محسوس ہوتا ہے۔

کرے عشاق کوں، جوں صورتِ تصویر، حیرت سوں
اگر پردے سوں وا ہووے جمالِ بے خواب اس کا

شاعر کہتا ہے کہ اگر محبوب کا بے مثال حسن پردے سے باہر آجائے تو عاشق حیرت کے عالم میں تصویر کی طرح ساکت ہو جائیں گے۔ یہاں عاشقوں کو، ”صورتِ تصویر“ سے تشبیہ دینا تشبیہِ صریح کی عمدہ مثال ہے، کیونکہ مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ تشبہ سب واضح ہیں۔ یہ منظر اپنے اندر ڈرامائیت بھی رکھتا ہے۔ ”پردے سوں وا ہووے“ میں ایک اچانک انکشاف کا تصور ہے، جیسے کوئی عظیم راز ظاہر ہونے والا ہو۔ اس اچانک جلوے کا تصور شعر میں حرکت اور کشش پیدا کرتا ہے۔ حسن کے جلوے سے انسان کا تصویر بن جانا صنعتِ مبالغہ ہے، مگر اس میں شدت کے ساتھ ایک جمالیاتی وقار بھی ہے۔ ”جمالِ بے خواب“ کی ترکیب نہایت معنی خیز ہے۔ یہ ایسا حسن ہے جو کسی پردے یا حد میں مقید نہیں۔ اس طرح شاعر نے حسن کو لامحدود اور مادی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔

سجن نے یک نظر دیکھا نگاہِ مست سوں جس کوں
خراباتِ دو عالم میں، سدا ہے دو خراب اس کا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی مست نگاہ نے جسے بھی ایک نظر دیکھ لیا، وہ دونوں جہانوں کی خرابات میں ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا۔ یہاں ”نگاہِ مست“ ایک بلیغ استعارہ ہے، جو محبوب کی اس نظر کی طرف اشارہ کرتا ہے جو عقل و ہوش کو سلب کر لے۔

”خراباتِ دو عالم“ ایک صوفیانہ علامت ہے۔ خراباتِ تصوف میں اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سالک دنیاوی اور اخروی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس طرح دونوں جہانوں کی بربادی دراصل عشق میں فنا ہو جانے کا استعارہ ہے۔ ایک نظر میں دونوں جہانوں کا اجڑ جانا صنعتِ مبالغہ ہے، مگر اس سے عشق کی قوت اور مرکزیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس شعر میں عاشق، محبوب، دنیا اور آخرت سب ایک ہی منظر میں جمع ہو گئے ہیں، جس سے شعر کا دائرہ وسیع اور آفاقی ہو گیا ہے۔

مرا دل پاک ہے از بس دلی! زنگِ کدورت سوں
ہوا جیوں جوہر آئینہ مخفی پتچ و تاب اس کا

شاعر خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے کہ میرا دل اس قدر پاک ہو چکا ہے کہ اس میں کسی قسم کی کدورت باقی نہیں رہی۔ ”زنگِ کدورت“ دل کی نفسانی میل اور روحانی آلودگی کا استعارہ ہے۔ دل کو آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر حرفِ تشبیہ حذف ہے، اس لیے یہ تشبیہ بلیغ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ آئینہ جب زنگ سے پاک ہو تو ہر شے کا صحیح عکس دکھاتا ہے۔ اسی طرح صاف دل ہی حسنِ حقیقی کا مظہر بن سکتا ہے۔ ”جوہر آئینہ“ اور ”پتچ و تاب“ کی ترکیب آئینے کی ساخت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس میں پیکر تراشی کا عنصر بھی شامل ہے۔ یہاں صوفیانہ فکر اپنے عروج پر ہے، کیونکہ دل کی صفائی کو حسن کے انعکاس کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ گویا حسن ہر طرف موجود ہے، مگر اس کے جلوے کا انحصار دل کی شفافیت پر ہے۔

9.2.3 غزل (تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا)

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

شاعر محبوب کے لبوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ان کی صفت لعلِ بدخشاں سے بیان کروں گا، کیونکہ لعلِ بدخشاں اپنی سرخی، چمک اور نایابی کے باعث حسن و قیمت کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس طرح یہاں لبوں کو لعل سے تشبیہ دے کر شاعر نے ایک خوبصورت تشبیہ قائم کی ہے جو کلاسیکی روایت سے وابستہ ہے۔ اسی تسلسل میں وہ محبوب کی آنکھوں کو جادو قرار دیتا ہے اور انہیں غزال کی آنکھوں سے نسبت دیتا ہے، کیونکہ غزال کی آنکھیں معصومیت اور دلکشی کی علامت ہیں، اس طرح نین اور غزال کے درمیان بھی واضح تشبیہ پیدا ہو جاتی ہے۔

آنکھوں کو، ”جادو“ کہنا مبالغہ ہے جو حسن کی غیر معمولی تاثیر کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ لب، لعل، نین اور غزال جیسے الفاظ کے باہمی تعلق سے شعر میں مراعاتِ النظر بھی پیدا ہوئی ہے اور پورا منظر بصری حسن کی ایک مکمل تصویر بن جاتا ہے۔

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی
یو کشورِ ایراں میں سلیمان سوں کہوں گا

اس شعر میں شاعر محبوب کے حسن کو ایک سلطنت سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا نے تمہیں حسن کے شہر کی بادشاہی عطا کی ہے، یوں ”حسن نگر کی بادشاہی“ ایک خوبصورت استعارہ بن جاتا ہے جو محبوب کے جمال کی ہمہ گیر حکمرانی کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر شاعر اس بادشاہی کو حضرت سلیمانؑ کی حکومت سے تشبیہ دیتا ہے، جس میں واضح تلمیح پائی جاتی ہے، کیونکہ حضرت سلیمانؑ اپنی عظیم سلطنت اور شان کے حوالے سے معروف ہیں۔ محبوب کی برتری کو، ”حق کی عطا“ قرار دینا حسنِ تعلیل کی مثال ہے، کیونکہ شاعر نے حسن کی عظمت کی وجہ الٰہی بخشش کو قرار دے کر شعر میں تقدس اور رفعت پیدا کر دی ہے اور یوں معنی کا دائرہ صرف ظاہری حسن تک محدود نہیں رہتا بلکہ روحانی وسعت اختیار کر لیتا ہے۔

تعریف ترے قد کی الف وار سرِ یجن
جا سروِ گلستاں کوں خوش الحان سوں کہوں گا

یہاں شاعر محبوب کے قد کو حرف ”الف“ کی مانند سیدھا اور متوازن قرار دیتا ہے اور چونکہ حرف تشبیہ مذکور نہیں، اس لیے یہ تشبیہ بلیغ ہے جو قامت کی درستی اور وقار کو نمایاں کرتی ہے۔ الف سیدھائی اور استقامت کی علامت ہے، اس لیے یہ علامتی حسن بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پھر شاعر گلستاں کے سرو کا ذکر کرتا ہے، جو کلاسیکی شاعری میں قدِ عناک کی علامت سمجھا جاتا ہے اور محبوب کے قد کو اس سے بھی برتر قرار دیتا ہے، اس طرح یہاں سرو کا ذکر روایتی علامت کے طور پر آیا ہے۔ قد، الف، سرو اور گلستاں کے الفاظ کے باہمی ربط سے شعر میں مراعاتِ النظر بھی پیدا ہوئی ہے اور پورا شعر حسنِ قامت کی ایک مربوط تصویر پیش کرتا ہے۔

مجھ پر نہ کرو ظلم تم اے لیلیٰ خوباں
مجنوں ہوں ترے غم کوں بیاباں سوں کہوں گا

اس شعر میں شاعر محبوب کو لیلیٰ کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور خود کو مجنوں قرار دیتا ہے، یوں یہاں مشہور داستانِ عشق کی طرف اشارہ موجود ہے جو واضح تلمیح کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عاشق کا خود کو مجنوں کہنا اپنی وفاداری اور دیوانگی کا اظہار ہے، جبکہ ”بیاباں“ عشق کی ویرانی اور تنہائی کا

استعارہ ہے۔ محبوب کو براہ راست خطاب کرنے سے شعر میں خطابیہ انداز پیدا ہوا ہے جس سے جذباتی شدت اور اثر آفرینی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں شعر صرف بیان نہیں رہتا بلکہ ایک فریاد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایہ خوبی
اس خواب کو جا یوسف کنگاں سوں کہوں گا

شاعر کہتا ہے کہ میں نے تمہیں خواب میں دیکھا ہے اور اس خواب کی تعبیر بیان کرنے کے لیے میں اسے حضرت یوسفؑ کے حسن سے نسبت دوں گا، اس طرح یہاں واضح تلمیح پائی جاتی ہے کیونکہ حضرت یوسف حسن کامل کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ محبوب کے حسن کو یوسفؑ کے حسن کے برابر یا اس سے بڑھ کر قرار دینا مبالغہ ہے جو عشق کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ خواب کا ذکر شعر کو ایک روحانی فضاء عطا کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کا حسن صرف ظاہری نہیں بلکہ باطنی اور وجدانی کیفیت بھی رکھتا ہے۔

جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن
یہ سوز ترا مشعل سوزاں سوں کہوں گا

یہاں شاعر اپنے مسلسل غم کو، ”جلنے“ سے تعبیر کرتا ہے اور اس جلنے کو مشعل سوزاں قرار دیتا ہے، اس طرح غم کو آگ اور مشعل سے تعبیر کرنا ایک خوبصورت استعارہ ہے۔ ”شب و روز“ کے الفاظ کیفیت کے تسلسل کو ظاہر کرتے ہیں، جس سے عاشق کی حالت کی ہمیشگی واضح ہوتی ہے۔ جلنا عام طور پر تکلیف کی علامت ہے مگر مشعل روشنی کی علامت ہے، اس طرح یہاں صنعت تضاد بھی پیدا ہو گئی ہے کیونکہ دکھ ہی روشنی کا سبب بن رہا ہے اور یہی بات شعر کو فکری گہرائی عطا کرتی ہے۔

یک نقطہ ترے صفحہ رخ پر ننیں بے جا
اس مکھ کو ترے صفحہ قرآں سوں کہوں گا

شاعر کہتا ہے کہ تمہارے چہرے پر ایک نقطہ بھی بے محل نہیں، ہر چیز اپنی جگہ مکمل تناسب کے ساتھ موجود ہے اور پھر وہ اس چہرے کو صفحہ قرآن سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس تشبیہ سے حسن کو تقدس اور پاکیزگی کا رنگ مل جاتا ہے۔ مکمل اور بے نقص صورت کا بیان مبالغہ بھی ہے، جبکہ ”نقطہ“ اور ”صفحہ“ کے الفاظ کے ذریعے ترتیب اور تناسب کا تصور بھی پیدا کیا گیا ہے، جس سے شعر میں معنوی گہرائی آتی ہے۔

قربان پری مکھ پہ ہوئی چوب سی جل کر
یہ بات عجائب مہ تاباں سوں کہوں گا

اس شعر میں شاعر محبوب کے پری چہرے کی تابناکی کو اس قدر شدید قرار دیتا ہے کہ لکڑی بھی جل کر اس پر قربان ہو جائے، یہاں بے جان شے کو انسانی کیفیت دینا تشخیص کی مثال ہے۔ لکڑی کا جل جانا اور قربان ہونا مبالغہ بھی ہے جو حسن کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ میں یہ عجیب بات چمکتے ہوئے چاند سے جا کر بیان کروں گا، یوں مہ تاباں حسن کی روایتی علامت کے طور پر آیا ہے اور محبوب کا چہرہ چاند سے بھی بڑھ کر دکھایا گیا ہے۔

بے صبر نہ ہو اے ولیؔ اس درد سوں ہر گز
جلتا ہوں ترے درد میں درماں سوں کہوں گا

آخری شعر میں شاعر خود کو مخاطب کر کے نصیحت کرتا ہے کہ اس دردِ عشق میں بے صبر نہ ہو، کیونکہ یہی درد دراصل علاج ہے۔ یہاں درد اور درماں کا باہمی تقابل واضح صنعتِ تضاد کی مثال ہے۔ عشق کا درد شفا بن جائے، یہ تصور صوفیانہ فکر کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں دکھ ہی روحانی ارتقا کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور یوں شاعر اپنی داخلی کیفیت کو ایک حکیمانہ نتیجے پر پہنچا دیتا ہے۔

9.2.4 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے ولی دکنی کی حیات اور غزل گوئی کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لیا ہے تو دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جانچنے کے لیے حصہ 9.8 سے رجوع کریں۔

1. ولی دکنی اردو غزل کی تاریخ میں ایک _____ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
2. ولی کے وطن اور جائے پیدائش کے بارے میں _____ پایا جاتا ہے۔
3. دکنی محققین کے نزدیک ولی کی پیدائش _____ میں ہوئی۔
4. ولی کے کلام میں دکنی، فارسی اور _____ عناصر کا امتزاج ملتا ہے۔
5. دہلی کا سفر ولی کی ادبی زندگی میں _____ اہمیت رکھتا ہے۔

9.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں آپ نے اردو غزل کی تاریخ میں ولی دکنی کے مقام و مرتبہ کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ آپ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ولی محض ابتدائی دور کے شاعر نہیں بلکہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے غزل کو علاقائی حدود سے نکال کر ہمہ گیر ادبی صنف بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ ولی کے وطن اور جائے پیدائش کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا ہے؛ کچھ اہل گجرات انہیں گجرات سے وابستہ مانتے ہیں، جبکہ دکنی محققین ان کی پیدائش اور نگ آباد کن میں قرار دیتے ہیں اور ان کے کلام کے لسانی شواہد دکنی نسبت کو مضبوط بناتے ہیں۔

سبق میں ولی کے ادبی سفر کا ذکر بھی سامنے آیا، خصوصاً احمد آباد سے ان کی قلبی وابستگی اور دہلی کے سفر کی ادبی اہمیت، جہاں ان کے دیوان نے شمالی ہند کے ادبی حلقوں کو متاثر کیا اور اردو غزل کو نئی سمت ملی۔ آپ نے ولی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات سادگی، شیرینی، روانی، واردات قلبی کو بھی سمجھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان کے ہاں دکنی محاورہ، فارسی لطافت اور ہندوی الفاظ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ شعر نہ ثقیل محسوس ہوتا ہے نہ سطحی۔

منتخب غزلوں کے مطالعے کے ذریعے آپ نے مشاہدہ کیا کہ ولی کی شاعری میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ، تضاد، مراعات النظیر، حسن تعلیل اور تلمیح جیسی صنعتیں فطری طور پر جلوہ گر ہیں۔ کہیں عشق کو، ”میر“ اور رقبابت کو، ”کٹاری“ سے تعبیر کیا گیا، کہیں ”حسن بے حجاب“ اور ”دیدہ“ حیراں ” کے ذریعے صوفیانہ و جمالیاتی مفہوم پیدا ہوا، اور کہیں لب و لہجہ کے کلاسیکی پیکروں سے حسن کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ یوں اس سبق نے آپ کو ولی کی غزل گوئی کی فنی جہتوں سے روشناس کرایا اور کلاسیکی روایت کی بنیادوں کو سمجھنے میں مدد دی۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

آپ اب ولی دکنی کی ادبی حیثیت اور اردو غزل میں ان کے تاریخی کردار کو واضح انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ آپ ولی کے وطن و جائے پیدائش کے اختلافات اور ان کے لسانی شواہد کی نوعیت سمجھ سکتے ہیں اور دہلی کے سفر کے ادبی اثرات کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ دکنی، فارسی اور ہندوی عناصر کے امتزاج سے پیدا ہونے والی زبان کی شیرینی اور روانی کو پہچان سکتے ہیں۔ منتخب غزلوں کی روشنی میں آپ غزل کے مرکزی خیال، کیفیت عشق، حسن و جمال کی تصویری تشکیل، اور رقبابت و حیرت جیسے مضامین کی تفہیم کر سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ تشبیہ، استعارہ، تضاد، مراعات النظیر، مبالغہ، حسن تعلیل اور تلمیح جیسی صنعتوں کی شناخت اور ان کی مثالیں دینے کے قابل ہو چکے ہیں۔

9.5 فرہنگ

لفظ	معنی
معمارِ اول	ابتدائی بنیاد رکھنے والا / بنیادی معمار
نقاب	پردہ / حجاب
دیدہ حیراں	حیران آنکھ / حیرت زدہ نظر

آہستہ آہستہ	آہستہ آہستہ / رفتہ رفتہ
آب ہونا	نرم پڑ جانا / پگھل جانا
آتشِ غم	غم کی آگ
نگاہِ مست	مست نظر
خرابات	شراب خانہ / مے خانہ (استعارہ)
زنگہ کدورت	دل کی میل / نفسانی آلودگی
کٹاری	زخم لگانے والی چیز
کاری	گہرا اثر کرنے والا
سجن / یار	محبوب
الف وار (الف کی مانند)	قد کا سیدھا ہونا
لعلِ بد خشاں	نایاب سرخ پتھر
عمیاں	ہر طرف ظاہر
حسنِ تعلیل	دلکش علت (شعری سبب)

9.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. ولی دکنی کے وطن اور جائے پیدائش کے بارے میں کیا اختلافات بیان کیے جاتے ہیں؟

2. ولی کے سفرِ دہلی کی ادبی اہمیت بیان کیجیے۔

3. دلی کی شاعری کی زبان میں کن لسانی عناصر کا امتزاج ملتا ہے؟

4. دلی کے اسلوب کی تین نمایاں خصوصیات لکھیں۔

5. دلی کے نزدیک غزل میں وارداتِ قلبی کی اہمیت کیسے واضح ہوتی ہے؟

9.7 مشقی سوالات

1. دلی دکنی کی حیات اور ادبی سفر کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. دلی دکنی کی غزل گوئی کی فنی و لسانی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. غزل، ”کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ“ کا مرکزی خیال بیان کریں اور منتخب اشعار کی تشریح کیجیے۔
4. غزل، ”جسے عشق کا تیر کاری لگے“ کی روشنی میں عشق، وفاداری اور رقابت کے مضامین واضح کیجیے۔

9.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

- (1) دلی دکنی کی حیات اور ادبی سفر کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
دلی دکنی اردو غزل کے ابتدائی اور مؤثر شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے وطن اور جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ بعض اہل گجرات انہیں گجرات سے وابستہ قرار دیتے ہیں، جبکہ دکنی محققین کے نزدیک ان کی پیدائش اور نگ آباد دکن میں ہوئی۔ لسانی شواہد دکنی نسبت کو تقویت دیتے ہیں اور عمومی طور پر یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ سترہویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تربیت دکن کے ماحول میں پائی، لیکن علمی جستجو انہیں احمد آباد لے گئی جو اس زمانے میں علم و فن کا بڑا مرکز تھا۔ وہاں کی خانقاہی و درسی فضا نے ان کے ذوق کو نکھارا اور ان کی شخصیت میں تصوف اور شعری لطافت کا امتزاج پیدا ہوا۔
دلی نے گجرات، سورت اور دیگر علاقوں کے سفر کیے، مگر دہلی کا سفر خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی مرحلے پر ان کا دیوان شمالی ہند کے ادبی حلقوں میں پہنچا اور وہاں کے شعری ذوق کو متاثر کیا۔ بعض روایات میں سعد اللہ گلشن کے مشورے کا ذکر ملتا ہے، تاہم جدید تحقیق اسے قطعی تاریخی حقیقت ماننے میں احتیاط کرتی ہے۔ بہر حال یہ حقیقت مسلم ہے کہ دلی کے دیوان نے اردو غزل کو نئی سمت دی اور اسے ہمہ گیر ادبی روایت بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

- (2) دلی دکنی کی غزل گوئی کی فنی و لسانی خصوصیات بیان کیجیے۔

ولی کی غزل گوئی کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی زبان کی سادگی، شیرینی اور روانی ہے۔ ان کے ہاں دکنی محاورہ، فارسی لطافت اور ہندوی الفاظ کی مٹھاس اس طرح گھل مل جاتی ہے کہ شعر نہ ثقیل محسوس ہوتا ہے نہ سسطی۔ وہ پیچیدہ فلسفیانہ مباحث میں نہیں الجھتے بلکہ وارداتِ قلبی کو براہِ راست مگر دلنشیں پیرائے میں بیان کرتے ہیں، اسی لیے ان کا کلام عام قاری اور خاص اہل ذوق دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

فنی اعتبار سے ان کے ہاں تشبیہ، استعارہ، تضاد، مراعات النظیر، مبالغہ اور حسنِ تعلیل کی جھلک نمایاں ہے۔ بعض غزلوں میں ہندوستانی شعری روایت کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ولی محض مقلد نہیں بلکہ اپنے تہذیبی سرمائے کو شعری پیکر دینے والے شاعر ہیں۔

(3) غزل، ”کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ“ کا مرکزی خیال بیان کریں اور منتخب اشعار کی تشریح کیجیے۔

اس غزل کا مرکزی خیال عشق کی تدریجی مگر گہری تاثیر ہے جو سنگ دل محبوب کو بھی آہستہ آہستہ نرم کر دیتی ہے۔ پہلے شعر میں ”ظالم“ محبوب کی بے رخی کا استعارہ ہے اور ”آب ہونا“ دل کے پگھلنے کی علامت۔ ”آتش“ اور ”گلاب“ کے تضاد سے حسنِ تقابل پیدا ہوا ہے اور عشق کی تاثیر کو فطری تمثیل کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں ”آتشِ غم“ غم کی شدت کا بلیغ استعارہ ہے جسے محبوب کی وفاداری ”گلاب“ کی مانند بجھا دیتی ہے۔ تیسرے شعر میں محبوب کی آنکھیں ”شراب“ سے تشبیہ پا کر عاشق کی بے خودی کا سبب بنتی ہیں۔ یوں غزل کے اشعار ایک ہی تسلسل میں عشق کی تاثیر، بے خودی اور دل کی نرمی کو تدریجی انداز سے نمایاں کرتے ہیں۔

(4) غزل، ”جسے عشق کا تیر کاری لگے“ کی روشنی میں عشق، وفاداری اور رقابت کے مضامین واضح کیجیے۔

اس غزل میں عشق کو ”تیر“ کے استعارے سے تعبیر کر کے اس کے زخم کی گہرائی واضح کی گئی ہے، اسی لیے زندگی، ”بھاری“ محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے شعر میں سچی یاری اور ”دم مرگ تک“ محبت کے دوام کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ تیسرے شعر میں ”قرار / بے قراری“ کے تضاد سے عشق کی داخلی کشمکش نمایاں ہوتی ہے۔ چوتھے شعر میں پاکیزہ عاشق کو محبوب کی ہر بات پیاری لگتی ہے، جو شدتِ محبت کی علامت ہے۔ آخری شعر میں رقیب کے دل میں ”کٹاری“ چھنے کا استعارہ حسد اور رقابت کی نفسیات کو نمایاں کرتا ہے۔ یوں غزل عشق کے دکھ، وفاداری کی پختگی اور رقابت کی جلن تینوں پہلو سادہ مگر مؤثر انداز میں سمیٹتی ہے۔

9.8 جوابات سرگرمی (خالی جگہیں)

1. سنگِ میل

2. اختلاف

3. اورنگ آباد

4. ہندوی

5. خاص / بڑی

9.9 امدادی کتب

- تاریخِ ادبِ اردو ڈاکٹر جمیل جالبی
- کلیاتِ ولی مرتبہ مولوی عبدالحق
- انتخابِ ولی دکنی ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی
- ولی اور نگ آبادی ڈاکٹر عبادت بریلوی
- ولی دکنی مرتبہ گوپی چند نارنگ
- آئینہ معنی نما (ولی اور نگ آبادی) اسلم مرزا

سبق نمبر ۱۰۔ میر درد

ساخت	
10.0	اغراض و مقاصد
10.1	تعارف
10.2	میر درد حیات اور غزل گوئی
10.2.0	ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے۔
10.2.1	جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا۔
10.2.2	اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
10.2.3	سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
10.3	عمومی جائزہ
10.4	آپ نے کیا سیکھا؟
10.5	فرہنگ
10.6	نمونہ برائے امتحانی سوالات
10.7	مشقی سوالات
10.7.0	مشقی سوالات کے جوابات
10.8	جوابات سر گرمی
10.9	امدادی کتب

10.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو سید خواجہ میر درد کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کے صوفیانہ افکار سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ یہ جان سکیں گے کہ خواجہ میر درد صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ صوفی اور روحانی شخصیت بھی تھے جنہوں نے اردو شاعری کو تصوف کے رنگ سے آشنا کیا۔

اس سبق کے مطالعے سے آپ کو درد کے خاندانی پس منظر، ان کی علمی و روحانی تربیت اور دہلی کے ادبی و سماجی ماحول کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ درد نے اپنے والد سے ظاہری اور باطنی علوم حاصل کیے اور بعد میں سجادہ نشین کی حیثیت سے روحانی خدمات انجام دیں۔ ساتھ ہی سبق کے ذریعے آپ درد کی شاعری کے بنیادی موضوعات جیسے عشق الہی، انسان دوستی، قناعت، توکل اور تصوف کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور ان کے منتخب اشعار کی مدد سے ان کے فکری اور روحانی پہلوؤں کا ادراک حاصل کریں گے۔ مزید یہ کہ اس سبق کے مطالعے سے آپ کو اردو شاعری میں صوفیانہ روایت اور اس کی اہمیت کا بھی علم ہوگا۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ خواجہ میر درد نے اردو ادب میں تصوف کو کس طرح مؤثر انداز میں پیش کیا اور کیوں انہیں صوفیانہ شاعری کا ایک اہم نمائندہ شاعر سمجھا جاتا ہے۔

10.1 تعارف

یہ سبق اردو کے ممتاز صوفی شاعر سید خواجہ میر درد کی زندگی اور ادبی خدمات سے متعلق ہے۔ اس میں درد کی شخصیت، ان کے خاندانی پس منظر، روحانی تربیت اور تصوف سے وابستگی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری کی خصوصیات اور اردو ادب میں ان کے مقام کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

اس سبق کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خواجہ میر درد نے اپنی شاعری میں عشق الہی، انسان دوستی، قناعت اور روحانیت جیسے موضوعات کو بڑی سادگی اور اثر انگیزی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کا کلام صوفیانہ فکر کا آئینہ دار ہے اور اردو شاعری میں انہیں ایک اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔

10.2 میر درد حیات اور غزل گوئی

سید خواجہ میر درد اردو کے ممتاز صوفی شاعر تھے۔ آپ کا اصل نام سید خواجہ میر تھا اور ”درد“ آپ کا تخلص تھا۔ آپ 1720ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور 1781ء میں وہیں وفات پائی۔ خواجہ میر درد کا تعلق ایک معزز صوفی خاندان سے تھا جس کی دہلی میں بڑی روحانی و علمی حیثیت تھی۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب ایک بلند پایہ صوفی بزرگ اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا ضخیم دیوان ”نالہ عندلیب“ کے نام سے شائع ہوا۔ درد کا سلسلہ نسب صوفی بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے ملتا ہے اور والدہ کی طرف سے نسبت حضرت غوث اعظم تک پہنچتی ہے۔ اسی روحانی ماحول اور خاندانی روایت کے باعث درد کی طبیعت ابتدا ہی سے تصوف اور روحانیت کی طرف مائل تھی۔

خواجہ میر درد نے ظاہری اور باطنی علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔ درویشانہ تربیت نے ان کے اندر روحانیت اور تصوف کی گہری کیفیت پیدا کر دی۔ نوجوانی کے زمانے میں کچھ عرصہ سپاہی پیشہ بھی اختیار کیا، مگر بعد میں دنیاوی مشاغل سے کنارہ کش ہو گئے۔ صرف اٹھائیس سال کی عمر میں ترک دنیا اختیار کر لیا اور جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو انا تالیس سال کی عمر میں سجادہ نشین مقرر ہوئے۔

درد نہایت با عمل صوفی تھے۔ ان کی زندگی میں قناعت، توکل، انسان دوستی، رضا اور عبادت کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے دنیاوی دولت اور جاہ و حشمت کو کبھی اہمیت نہ دی اور درویشانہ زندگی اختیار کی۔ اس اخلاقی عظمت اور روحانی وقار کی وجہ سے امیر و غریب، بادشاہ اور فقیر سب ان کا احترام کرتے تھے۔

خواجہ میر درد کے زمانے میں دہلی سیاسی انتشار اور ہنگاموں کا مرکز بن چکی تھی۔ اس بد حالی کے باعث بہت سے اہل علم و ادب دہلی چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف چلے گئے، جن میں میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا سبھی شامل تھے۔ لیکن درد نے اپنی سر زمین کو ترک کرنا گوارا نہ کیا اور تمام تر مشکلات کے باوجود دہلی ہی میں مقیم رہے۔

خواجہ میر درد کو بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ انہوں نے فارسی زبان میں تصوف کے موضوع پر متعدد رسائل لکھے۔ ان کی شاعری میں الفت الہی، روحانیت، اخلاقی پاکیزگی اور انسانی ہمدردی کے جذبات نمایاں ہیں۔ اردو شاعری میں انہوں نے غزل، رباعیات اور ترجیع بند جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کا اردو دیوان مختصر ہے مگر اعلیٰ فکری اور فنی معیار کا حامل ہے۔

ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

تر دامن پہ شیخ ہماری نہ جانیو
دامن نہجوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمایاں
ہم آئینے کے سامنے جب جا کے ہو کریں

درد کی شاعری میں تصوف کا رنگ نہایت گہرا ہے۔ اسی لیے بعض محققین کا خیال ہے کہ: ”خواجہ میر درد دار و شاعری میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم ہیں۔“

ان کی شاعری میں وحدت الوجود اور خدا کی ہمہ گیر موجودگی کا احساس نمایاں طور پر ملتا ہے، جیسا کہ ان کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

تصانیف و رسائل

خواجہ میر درد نے تصوف پر کئی اہم رسائل تحریر کیے جن میں نمایاں یہ ہیں:

1. احکام الصلوٰۃ
2. واردات
3. علم الکتاب
4. درود دل
5. شمع محفل
6. آہ سرد
7. نالہ دور

ان کے کلام کا مجموعہ ”دیوان درد“ کے نام سے شائع ہوا۔

مختصر آئیہ کہ خواجہ میر درد آرد و ادب کے ان ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے تصوف، اخلاق اور روحانیت کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا۔ ان کی شخصیت اور شاعری اردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتی ہے اور آج بھی ان کا کلام فکری گہرائی اور روحانی تاثیر کے باعث بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

شاعر یہاں محبوب حقیقی یعنی خدا کی لامحدود وسعت کا بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زمین و آسمان جیسی عظیم اور وسیع مخلوقات بھی تیری حقیقت کو نہیں پاسکتیں، یعنی ان کی ظاہری وسعت بھی تیری ذات کے مقابلے میں محدود ہے۔ لیکن اسی کے مقابل شاعر اپنے دل کو وہ مقام قرار دیتا ہے جہاں خدا کی تجلی سما سکتی ہے۔ یہاں ایک گہرا صوفیانہ تصور موجود ہے کہ دل محض جسمانی عضو نہیں بلکہ عرفان اور تجلیات الہی کا مرکز ہے۔ ”ارض و سما“ اور ”دل“ کے درمیان جو تقابل قائم کیا گیا ہے وہ واضح صنعت تضاد ہے، کیونکہ ایک طرف کائنات کی بے پایاں وسعت ہے اور دوسری طرف انسان کا چھوٹا سا دل، مگر شاعر دل کو زیادہ وسیع قرار دیتا ہے۔ زمین و آسمان کے ناکافی ہونے کا بیان مبالغہ بھی ہے جو محبوب حقیقی کی عظمت کو نمایاں کرتا ہے اور دل میں خدا کے سما جانے کا تصور خالص تصوف اور باطنی وحدت کی علامت ہے۔

وحدت میں تیری حرفِ دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

اس شعر میں شاعر خدا کی ذات کو کامل وحدت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تیری وحدت میں دوئی کا کوئی تصور داخل نہیں ہو سکتا۔ ”حرفِ دوئی“ کی نفی دراصل کثرت اور تقسیم کے انکار کی علامت ہے، جو صوفیانہ نظریہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر شاعر کہتا ہے کہ آئینہ بھی تجھے منہ نہیں دکھا سکتا، کیونکہ آئینہ صورت اور عکس کا محتاج ہے جبکہ خدا شکل و صورت سے ماوراء ہے۔ یہاں ”آئینہ“ عقل، حواس اور ظاہری علم کا استعارہ ہے جو حقیقتِ مطلق کو منعکس کرنے سے قاصر ہیں۔ ”کیا مجال“ کے الفاظ میں زور دار حسنِ نفی پایا جاتا ہے جو خدا کی برتری اور انسان کی عاجزی کو مزید واضح کرتا ہے۔

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

یہاں شاعر اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے خود کو ”فتادہ“ یعنی گرا ہوا کہتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ جب تک میں فنا کی منزل سے نہ گزروں، کوئی مجھے اٹھا نہیں سکتا۔ فنا سے مراد اپنی انا اور خودی کا مٹ جانا ہے، جو تصوف کی بنیادی منازل میں سے ایک ہے۔ شاعر نے اپنی ذات کو

”نقشِ قدم“ سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ نقشِ قدم زمین پر پڑا رہتا ہے اور خود سے نہیں اٹھ سکتا، اس طرح یہاں واضح تشبیہ موجود ہے جو انکسار کو نمایاں کرتی ہے۔ ”فنا“ کا ذکر خالص صوفیانہ فکر کی نمائندگی کرتا ہے اور خود کو گراہوا کہنا شاعر کی روحانی انکساری کو ظاہر کرتا ہے۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوبِ حقیقی کا پیغام کسی ظاہری قاصد کے ذریعے نہیں آسکتا، کیونکہ یہ پیغام الفاظ اور واسطوں کا محتاج نہیں بلکہ براہِ راست دل میں اترتا ہے۔ ”قاصد“ یہاں زبان، عقل اور ظاہری ذرائع کا استعارہ ہے، جنہیں شاعر ناکافی قرار دیتا ہے۔ ”دل“ کو پیغام کا واحد وسیلہ قرار دینا صوفیانہ تصورِ معرفت کو ظاہر کرتا ہے، جہاں دل کو علمِ حقیقی کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح شعر میں علامتی انداز اور روحانی فکر باہم مربوط ہو کر سامنے آتے ہیں۔

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول نہ ہمار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یہ شعر نصیحت آمیز ہے اور شاعر ”غافل“ کہہ کر براہِ راست مخاطب ہوتا ہے، جس سے خطابیہ انداز پیدا ہوتا ہے اور تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی یاد میں اپنی ذات کو بھلا دینا ہی اصل کامیابی ہے۔ یہاں ”اپنے تئیں بھلا دے“ ”ترکِ نفس اور ترکِ خودی کی علامت ہے، جو تصوف کا بنیادی اصول ہے۔ ”بھول“ اور ”بھلا“ کی لفظی تکرار سے شعر میں صنعتِ تکرار پیدا ہوئی ہے جو معنی میں زور اور تاکید پیدا کرتی ہے اور نصیحت کو زیادہ اثر انگیز بنادیتی ہے۔

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

اس شعر میں شاعر عقل اور فہم کی محدودیت پر حیرت کا اظہار کرتا ہے اور اسے ایک ”طلسم“ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں ”طلسم“ عقل کی محدود دنیا کا استعارہ ہے، جس میں انسان خواہ کتنی ہی کوشش کرے، وہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ”دوڑے ہزار“ میں مبالغہ ہے جو عقل کی بار بار کی ناکام کوششوں کو شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ شعر صوفیانہ فکر کے اس اصول کو واضح کرتا ہے کہ عقل خدا کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی، وہاں عشق اور وجدان ہی رہنما ہوتے ہیں۔

گو بحث کر کے بات بٹھائی بھی کیا حصول
دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

یہاں شاعر منطق اور بحث کی بے ثمر حیثیت بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بحث سے کیا حاصل جب تک دل پر پڑا ہوا پردہ نہ ہٹے۔
’غلاف‘ دل پر چھائی ہوئی غفلت، جہالت اور نفسانی خواہشات کا استعارہ ہے۔ شاعر دراصل تنقید منطق کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ روحانی حقیقت
دل کی صفائی سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ محض عقلی استدلال سے۔ اس طرح شعر میں فکری گہرائی اور روحانی پیغام دونوں جمع ہو گئے ہیں۔

اطفائے نارِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

اس شعر میں شاعر عشق کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عشق کی آگ آنسوؤں کے پانی سے بھی نہیں بجھ سکتی، کیونکہ یہ عام آگ
نہیں بلکہ ایسی روحانی آگ ہے جو جتنی بجھانے کی کوشش کی جائے اتنی ہی تیز ہو جاتی ہے۔ آگ اور پانی کے درمیان واضح صنعتِ تضاد موجود ہے،
جو معنی کو قوت عطا کرتا ہے۔ عشق کی آگ کو ناقابلِ بجھاؤ قرار دینا مبالغہ بھی ہے، جو عشق کی شدت اور دوام کو نمایاں کرتا ہے۔

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردِ چاہے لائے بہ خود پر نہ لا سکے

آخری شعر میں شاعر عشق کو شراب سے تعبیر کرتا ہے، جو ایک خوبصورت استعارہ ہے اور عاشق کو اس شراب سے مست اور بے خود
قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مستی ایسی ہے کہ قیامت بھی اسے ہوش میں نہیں لاسکتی، یہاں ’حشر‘ کا ذکر آخرت کی طرف اشارہ ہے اور اس میں
واضح مبالغہ پایا جاتا ہے جو عشق کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں عشق کی آخری کیفیت بیان ہوئی ہے جہاں عاشق اپنی ذات سے بالکل بے خبر ہو جاتا
ہے اور یہی صوفیانہ جذب و استغراق کی معراج ہے۔

10.2.1 (غزل) جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا۔

جگ	میں	کوئی	نہ	ٹک	ہنسا	ہوگا
کہ	نہ	ہنستے	میں	رو	دیا	ہوگا

شاعر انسانی زندگی کی ایک گہری نفسیاتی سچائی کو بیان کرتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو پوری طرح بے فکر ہو کر ہنسا ہو۔ ہر خوشی کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی دکھ، محرومی یا اندیشہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ اس طرح ظاہری ہنسی اور باطنی رنج کے امتزاج سے انسانی شخصیت کی دوہری کیفیت سامنے آتی ہے۔ شعر میں ہنسا اور روناد و متضاد کیفیتیں ہیں جن کو ایک ہی لمحے میں جمع کر کے شاعر نے صنعت تضاد کا خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے اور یہی تضاد معنی میں گہرائی اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ پوری دنیا کے ہر انسان کی ہنسی کو غم آلود قرار دینا مبالغہ بھی ہے، جس کے ذریعے شاعر نے دکھ کی ہمہ گیری کو نمایاں کیا ہے۔

ان نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

اس شعر میں عاشق محبوب کی بے رخی اور سرد مہری کا شکوہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب نے اگر میری فریاد سنی بھی ہوگی تو جان بوجھ کر ان سنی کر دی ہوگی۔ اس طرح شاعر محبوب کے رویے کی ایک وجہ خود ہی متعین کرتا ہے، جس سے کلام میں حسن تعلیل پیدا ہوتا ہے یعنی کسی کیفیت کی ایک دلکش اور فنی علت بیان کی گئی ہے۔ ”سنا“ اور ”نہ سنا“ کی تکرار نہ صرف معنی کو زور دیتی ہے بلکہ محبوب کی بے توجہی کو نمایاں کر کے جذباتی شدت پیدا کرتی ہے، یوں تکرار لفظی و معنوی کا حسن پیدا ہوتا ہے۔ ”نالہ“ ”یہاں محض آواز نہیں بلکہ دل کی گہری فریاد کا کنایہ ہے، جو شعر کے جذباتی وزن کو بڑھاتا ہے۔

دیکھیے اب کے غم سے جی میرا
نہ بچے گا بچے کیا ہوگا

شاعر اپنے موجودہ غم کی شدت کو اس درجے پر محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنی زندگی کے باقی رہنے کی امید بھی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اس صدمے سے جان بچ بھی گئی تو وہ حقیقی زندگی نہ ہوگی۔ دوسرے مصرع میں سوالیہ انداز اختیار کیا گیا ہے، مگر یہاں سوال مقصود نہیں بلکہ ناامیدی کا اظہار ہے، اس لیے یہ استفہام انکاری ہے۔ غم کو جان لیوا قرار دینا مبالغہ کی صورت رکھتا ہے جو داخلی کرب کو شدت سے ظاہر کرتا ہے۔ ”بچے گا“ کی تکرار صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے اور خیال کو ذہن میں بٹھادیتی ہے، یوں کلام میں صوتی تاثیر بھی پیدا ہوتی ہے۔

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا جو رہ گیا ہوگا

اس شعر میں شاعر نے زمانے کو ایک ظالم اور حملہ آور قوت کے طور پر پیش کیا ہے جو دلوں کو زخمی کرتی ہے۔ ”زمانے کے ہاتھ“ کہنا دراصل ایک استعارہ ہے جس میں زمانے کو جاندار بنا کر دکھایا گیا ہے، یوں ہلکی سی تشخیص بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ انداز بیان شعر کو تصویری قوت دیتا ہے۔ شاعر کا یہ کہنا کہ شاید ہی کوئی دل سلامت بچا ہو، مبالغہ بھی ہے اور ایک اجتماعی تجربے کی ترجمانی بھی۔ اس سے شعر میں آفاقیت پیدا ہوتی ہے اور قاری اپنے تجربے کو اس میں شامل محسوس کرتا ہے۔

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

شاعر کہتا ہے کہ جب کہیں حسن یا خوشی کی کوئی جھلک دکھائی دیتی ہے تو اس کے دل کے پرانے زخم پھر تازہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ یہ منظر اسے اپنی محرومی یاد دلادیتا ہے۔ یہاں ”غنچہ“ محبوب، حسن یا مسرت کا استعارہ ہے، جو شعر کو علامتی وسعت دیتا ہے۔ غنچہ خوشی کی علامت ہے جبکہ زخم درد کی ان دونوں کو ساتھ لاکر شاعر نے تضاد کیفیت پیدا کیا ہے۔ سبب (غنچہ کھلنا) اور اثر (زخم تازہ ہونا) کے ربط سے شعر میں ایک لطیف داخلی منطق بھی قائم ہوتی ہے، جو فنی چٹنگی کی علامت ہے۔

10.2.2 غزل (اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں)

اس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

شاعر محبوب کی بے ثبات توجہی کا نہایت لطیف نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب نے شاید کسی لمحے مجھے یاد کیا، مگر فوراً ہی بھلا بھی دیا۔ اس ایک لمحاتی یاد نے میرے اندر ایسا ہلچل پیدا کی کہ میرا ذہنی توازن اور باطنی سکون بکھر گیا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ میں خود اپنی حالت، اپنی سوچ اور اپنی پہچان سے بھی بے خبر ہو گیا ہوں۔ گویا محبوب کی توجہ عاشق کے وجود کا مرکز ہے اور اسی سے اس کی خود آگہی وابستہ ہے۔ اس شعر میں یاد اور بھول کو ایک ساتھ لاکر صنعت تضاد پیدا کی گئی ہے، جو کیفیت کی ناپائیداری کو نمایاں کرتی ہے۔ محبوب کی ایک مختصر یاد کے اتنے بڑے اثر کو ظاہر کرنا مبالغہ ہے، جبکہ عاشق کی ذہنی پراگندگی کی تصویر کیفیت نگاری کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔

آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ
جیتا رہے گا کب تلک اے خضر مر کہیں

شاعر ایسی زندگی سے شدید بیزاری ظاہر کرتا ہے جو مسلسل کرب اور بے لطفی سے عبارت ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرح کی زندگی سے دل گھبرا اور اکتا گیا ہے۔ پھر حضرت خضرؑ کو خطاب کر کے، جو روایتاً آبِ حیات پی کر زندہ رہنے کی علامت ہیں، یہ سوال اٹھاتا ہے کہ آخر انسان کب تک جیتا رہے گا کبھی نہ کبھی تو موت بھی آئی ہے، بلکہ ایسی زندگی سے تو موت بہتر محسوس ہوتی ہے۔ اس شعر میں زندگی کے مسئلے کو محض ذاتی نہیں بلکہ وجودی اور فلسفیانہ سطح پر دیکھا گیا ہے۔ خضرؑ کا حوالہ تلخ ہے جو شعر کو تہذیبی پس منظر عطا کرتا ہے۔ زندگی کی طوالت کو بے معنی قرار دینا مبالغہ ہے، جبکہ جینا اور مرنا آمنے سامنے آکر مفہوم میں تضادی کشش پیدا کرتے ہیں۔

پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جا بہ جا
دیکھا نہ میری آہ نے روئے اثر کہیں

شاعر اپنی فریاد کی بے اثری کا دردناک شکوہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری آہ وزاری دنیا بھر میں بھٹکتی رہی، ہر سمت پھیلتی رہی، مگر کہیں بھی اس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ نہ محبوب کے دل پر اثر ہوا، نہ حالات بدلے، نہ قسمت نے ساتھ دیا۔ اس طرح عاشق کی بے بسی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ آہ کو ایک جیتی جاگتی ہستی کی طرح پیش کیا گیا ہے جو تڑپتی اور پھرتی ہے۔ پوری دنیا میں آہ کے پھرنے کا تصور مبالغہ ہے، جبکہ اثر نہ ہونے کا بیان شعر میں گہری یاسیت اور محرومی کی فضا قائم کرتا ہے۔

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے
جی میں ہے خوب رویئے اب بیٹھ کر کہیں

شاعر اپنی دوہری داخلی کیفیت بیان کرتا ہے کہ وہ مدتوں تک دنیا کے سامنے ہنستا مسکراتا رہا، اپنے غم کو چھپائے رکھا اور معاشرتی تعلق نبھاتا رہا، مگر اب دل چاہتا ہے کہ کسی تنہائی کے گوشے میں بیٹھ کر جی بھر کے رو لیا جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلسل ضبط بھی ایک حد کے بعد ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ شعر انسانی نفسیات کی نہایت سچی ترجمانی کرتا ہے کہ آدمی محفل میں خود کو سنبھالے رکھتا ہے مگر خلوت میں بکھر جاتا ہے۔ ہنسنے اور رونے کی متضاد کیفیتیں صنعتِ تضاد پیدا کرتی ہیں۔

یوں تو نظر پڑے ہیں دل افکار اور بھی
دل ریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں بہت سے غم زدہ اور زخمی دل دیکھے ہیں، مگر آپ جیسا شدید طور پر زخمی دل کہیں نظر نہیں آیا۔ یہاں مخاطب کی کیفیت کو سب سے بڑھ کر دکھایا گیا ہے، جس سے جذباتی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ انداز بیان محبت بھرا مبالغہ ہے جس سے تاثر میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ ”دل افکار“ اور ”دل ریش“ جیسی بلیغ تراکیب کلام کو ادبی حسن عطا کرتی ہیں اور حسن ترکیب کی مثال ہیں۔ ہم معنی الفاظ کے استعمال سے مفہوم میں زور اور صوتی ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی ہے۔

ظالم جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو ولے
پچھتاوے پھر تو آپ ہی ایسا نہ کر کہیں

شاعر محبوب سے شکوہ بھی کرتا ہے اور نرمی سے متنبہ بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم مجھ پر جتنا ظلم کرنا چاہو کرو، میں برداشت کر لوں گا، مگر ڈراس بات کا ہے کہ کہیں بعد میں تمہیں خود ہی اپنے رویے پر پچھتانا نہ پڑے۔ اس میں محبت بھی ہے اور درد بھرا طنز بھی۔ ”ظالم“ کا لفظ یہاں خالص گالی نہیں بلکہ محبت آمیز شکوہ ہے، جس سے لطیف طنز پیدا ہوتا ہے۔ محبوب کو بالواسطہ نصیحت کرنا نصیحت در پردہ کی صورت ہے۔ جفا اور پچھتاوے کے تعلق سے شعر میں ایک اخلاقی انجام کا تصور بھی ابھرتا ہے، جو مفہوم کو مزید گہرا کرتا ہے۔

10.2.3 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے خواجہ میر درد کی حیات اور ان کی غزل گوئی کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کر لیا ہے تو ذیل میں دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جانچنے کے لیے حصہ 10.8 سے رجوع کریں۔

1. سید خواجہ میر درد کا اصل نام _____ تھا۔

2. درد کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر _____ تھا۔

3. خواجہ میر درد کا تعلق ایک _____ خاندان سے تھا۔

4. درد کی شاعری میں _____ کا رنگ نمایاں ہے۔

10.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں آپ نے اردو کے ممتاز صوفی شاعر خواجہ میر درد کی زندگی، شخصیت اور شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ آپ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ درد صرف ایک شاعر نہیں بلکہ ایک بلند پایہ صوفی اور روحانی شخصیت بھی تھے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے تصوف اور روحانیت کو عام کیا۔ اس سبق میں آپ نے درد کے خاندانی پس منظر، ان کی روحانی تربیت اور دہلی کے ادبی ماحول کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ درد نے اپنے والد سے علوم حاصل کیے اور بعد میں سجادہ نشین بن کر روحانی خدمات انجام دیں۔

منتخب غزلوں کے مطالعے کے ذریعے آپ نے یہ بھی دیکھا کہ درد کی شاعری میں وحدت الوجود، عشق حقیقی، انسان دوستی اور اخلاقی پاکیزگی جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کے اشعار میں سادگی، معنوی گہرائی اور روحانی تاثیر پائی جاتی ہے۔ یوں یہ سبق آپ کو درد کی شاعری کے فکری اور فنی پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے اور اردو ادب میں ان کے بلند مقام کو واضح کرتا ہے۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ اب خواجہ میر درد کی زندگی اور ادبی خدمات کو بہتر طور پر بیان کر سکتے ہیں۔ آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ درد ایک صوفی شاعر تھے جن کی شاعری میں عشق الہی، روحانیت اور اخلاقی اقدار نمایاں ہیں۔ آپ درد کے خاندانی پس منظر، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کی سجادہ نشینی کے حالات کو بھی بیان کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ درد کی شاعری میں موجود تصوف، وحدت الوجود اور روحانی تجربات کی جھلک کو پہچان سکتے ہیں۔ منتخب غزلوں کی مدد سے آپ درد کے اسلوب کی خصوصیات، ان کے فکری مضامین اور شعری صنعتوں جیسے تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور تضاد کی مثالیں بھی بیان کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔

10.5 فرہنگ

لفظ	معنی
وسعت	پھیلاؤ/کشادگی
وحدت	یگانگت/ایک ہونا
فنا	خودی کا مٹ جانا
قاصد	پیغام لانے والا
غافل	بے خبر
آتش عشق	عشق کی آگ
مست	بے خود
نالہ	فریاد/آہ
دل افگار	زخمی دل
جفا	ظلم/بے وفائی

10.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. خواجہ میر درد کے خاندانی پس منظر اور روحانی ماحول کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

2. درد کی شاعری میں تصوف کے نمایاں عناصر کی وضاحت کیجیے۔

3. غزل، 'جگ' میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا" میں انسانی زندگی کے کس تجربے کی عکاسی کی گئی ہے؟

4. درد کی شاعری میں عشقِ حقیقی کے تصور کی وضاحت کیجیے۔

10.7 مشقی سوالات

1. خواجہ میر درد کی حیات اور ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. خواجہ میر درد کی شاعری کے صوفیانہ رجحانات اور فکری خصوصیات بیان کیجیے۔

10.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1) خواجہ میر درد کی حیات اور ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

خواجہ میر درد اردو کے ممتاز صوفی شاعر تھے۔ ان کا اصل نام سید خواجہ میر تھا اور ’درد‘ ان کا تخلص تھا۔ وہ 1720ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور 1781ء میں وہیں وفات پائی۔ ان کا تعلق ایک معزز صوفی خاندان سے تھا۔ ان کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب ایک بلند پایہ صوفی اور فارسی کے شاعر تھے۔ درد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ روحانی تربیت کے اثر سے ان کی طبیعت میں تصوف کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ انہوں نے جوانی میں دنیاوی مشاغل ترک کر دیے اور بعد میں سجادہ نشین بن گئے۔ درد کی شاعری میں عشق الہی، انسان دوستی اور روحانیت کے مضامین نمایاں ہیں۔ اردو ادب میں ان کا شمار اہم صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔

2) خواجہ میر درد کی شاعری کے صوفیانہ رجحانات بیان کیجیے۔

خواجہ میر درد کی شاعری میں تصوف کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی، فنا، توکل اور روحانی تجربات کی جھلک ملتی ہے۔ وہ دنیاوی محبت کے بجائے خدا سے تعلق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ان کی شاعری میں وحدت الوجود کا تصور بھی نمایاں ہے۔ وہ کائنات کے ہر ذرے میں خدا کی موجودگی کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سادگی اور معنوی گہرائی پائی جاتی ہے جو قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

10.8 جوابات سرگرمی

1. سید خواجہ میر
2. عندلیب
3. صوفی
4. تصوف

10.9 امدادی کتب

1. تاریخ ادبِ اردو ڈاکٹر جمیل جالبی
2. خواجہ میر درد قاضی جمال حسین
3. خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ڈاکٹر وحید اختر
4. اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ مولوی عبدالحق
5. شرح درد خواجہ محمد شفیع دہلوی
6. انتخاب کلام خواجہ میر درد نثار اعظمی

سبق نمبر ۱۱۔ میر تقی میرؒ

ساخت

- | | |
|--------|---|
| 11.0 | اغراض و مقاصد |
| 11.1 | تعارف |
| 11.2 | میر تقی میرؒ حیات اور غزل گوئی |
| 11.2.0 | ہستی اپنی حباب کی سی ہے |
| 11.2.1 | غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا |
| 11.2.2 | عشق میں، بے خوف و خطر چاہیے |
| 11.2.3 | اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا |
| 11.2.4 | سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں |
| 11.3 | عمومی جائزہ |
| 11.4 | آپ نے کیا سیکھا؟ |
| 11.5 | فرہنگ |
| 11.6 | نمونہ برائے امتحانی سوالات |
| 11.7 | مشقی سوالات |
| 11.7.0 | مشقی سوالات کے جوابات |
| 11.8 | جوابات سر گرمی |
| 11.9 | امدادی کتب |

11.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو میر تقی میر کی شخصیت، حیات اور شاعری سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ یہ جان سکیں گے کہ میر اردو غزل کے نہایت اہم اور بلند پایہ شاعر ہیں اور انہیں اردو شاعری میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس سبق کے مطالعے سے آپ کو میر کے عہد، ان کے حالات زندگی، دہلی اور لکھنؤ کے ادبی ماحول اور ان کے شعری سفر کے بارے میں معلومات حاصل ہوں گی۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ میر کی زندگی کے ذاتی تجربات، ہجرت، محرومی اور زمانے کے نشیب و فراز نے ان کی شاعری پر کس طرح گہرا اثر ڈالا۔

اس سبق کے ذریعے آپ میر کی غزل گوئی کی خصوصیات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ خاص طور پر آپ ان کی شاعری میں سوز و گداز، سادگی، اثر آفرینی، داخلیت، عشق، غم، انسانی احساسات اور زندگی کے المیوں کی جھلک کو محسوس کر سکیں گے۔ مزید یہ کہ اس سبق کے مطالعے سے آپ کو اردو غزل کے ارتقا میں میر کے کردار کا علم ہوگا۔ آپ یہ جان سکیں گے کہ میر نے اردو غزل کو جذباتی گہرائی، فکری وسعت اور فنی پختگی عطا کی اور کیوں انہیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔

11.1 تعارف

یہ سبق اردو کے مشہور شاعر میر تقی میر کی زندگی اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں میر کی شخصیت، ان کے عہد کے حالات اور ان کی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ میر کو اردو غزل کا سب سے اہم اور اثر انگیز شاعر سمجھا جاتا ہے اور انہیں اردو شاعری میں ”خدائے سخن“ کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ میر کی شاعری میں سوز و گداز، سادگی، گہرے انسانی جذبات اور زندگی کے تلخ تجربات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار میں عشق، غم، تنہائی اور انسانی احساسات کی نہایت مؤثر ترجمانی ملتی ہے۔ اس طرح یہ سبق آپ کو میر تقی میر کی شخصیت، ان کے شعری اسلوب اور اردو ادب میں ان کے مقام کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

11.2 میر تقی میر حیات اور غزل گوئی

میر تقی میر کا اصل نام میر محمد تقی تھا اور ”میر“ ان کا تخلص تھا۔ وہ 1722ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد علی تھے جو روحانی شخصیت کے طور پر معروف تھے اور علی متقی کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ میر کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی، جہاں انہیں مذہبی اور ادبی ماحول میسر آیا۔ تاہم ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے نے ان کی زندگی کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ والد کی وفات کے بعد گھر کے حالات سازگار نہ رہے۔ بڑے بھائیوں کے نامناسب رویے اور گھریلو مشکلات سے تنگ آکر میر کم عمر ہی میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ عرصہ در بدر رہنے کے بعد وہ واپس آئے، لیکن معاشی تنگی اور بے سروسامانی نے بالآخر انہیں دہلی کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ دہلی اس زمانے میں علم و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں انہیں سراج الدین علی خان آرزو اور میر جعفر سعادت علی خان جیسے اہل علم کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ انہی کی صحبت میں میر کی ادبی صلاحیتیں نکھریں اور ان کی شاعری میں پختگی پیدا ہوئی۔

دہلی میں قیام کے دوران میر کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور وہ اپنے عہد کے ممتاز شعراء میں شمار ہونے لگے۔ تاہم دہلی کی سیاسی ابتری اور مسلسل تباہی نے اہل علم و ادب کی زندگی کو متاثر کیا۔ اسی پس منظر میں نواب آصف الدولہ کی دعوت پر میر 1782ء میں لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ لکھنؤ میں ان کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ اگرچہ دربار سے ان کا تعلق زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا، لیکن یہاں ان کی باقی زندگی نسبتاً سکون اور آسودگی میں گزری۔ آخر کار 1810ء میں لکھنؤ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

میر تقی میر کو اردو غزل کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد آنے والے تقریباً تمام بڑے شعراء نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ میر کی زندگی طرح طرح کے دکھوں، محرومیوں اور مشکلات سے گزری، اسی لیے ان کی شاعری میں درد، غم، حزن اور یاس کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ ذاتی محرومیاں، معاشی تنگی، رشتہ داروں کی بے توجہی اور عشق کی ناکامیاں ان کے کلام میں شدت کے ساتھ جھلکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں سوز و گداز، داخلی کیفیت اور درد مندی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

میر نے ادب و انشا کی تعلیم سراج الدین آرزو اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ سعادت علی امر وہی کی ترغیب پر انہوں نے ریختہ یعنی اردو میں شاعری کا آغاز کیا۔ ان کی شاعری جلد ہی دہلی اور لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو گئی۔ مختلف امراء اور اہل ذوق نے ان کی حوصلہ افزائی کی، اور میر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شاعری کے لیے وقف کر دیا۔ معروف ادیب محمد حسین آزاد نے انہیں اردو زبان کا ”قدیم جوہری“ قرار دیا ہے۔ میر کی شاعری کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ ان کے معاصر اور بعد کے شعراء بھی ان کے مقام تک نہ پہنچ سکے۔ ان کی غزلوں کے سامنے دوسرے شعراء کا کلام مدھم محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا محمد رفیع سودا جیسے بڑے شاعر کو بھی میدان غزل میں میر کی برتری تسلیم کرنا پڑی۔ میر کی شاعری ایک وسیع اور گہرے سمندر کی مانند ہے جس میں جذبات، تجربات اور احساسات کی بے شمار لہریں موجود ہیں۔

میر کی شاعری میں غم و اندوہ کا رنگ اگرچہ نمایاں ہے، لیکن یہ غم صرف ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی احساس میں ڈھل جاتا ہے۔ قاری جب ان کے اشعار پڑھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا دکھ دراصل اس کا اپنا دکھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کی شاعری دلوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ اردو غزل میں میر کا مقام ویسا ہی ہے جیسا فارسی شاعری میں حافظ کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر انہیں ”شہنشاہ غزل“ اور ”خدائے سخن“ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

میر کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے، لیکن یہ محبت محض رسمی یا روایتی نہیں بلکہ ذاتی تجربات اور سچے جذبات کی ترجمان ہے۔ ان کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم عمری ہی میں کسی حسین شخصیت کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس عشق کے تجربات نے ان کی شاعری کو گہرائی اور سچائی عطا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت مجازی حدود سے نکل کر روحانی اور حقیقی محبت کے دائرے میں بھی داخل ہو گئی۔ میر کی فطرت نہایت حساس تھی، اس لیے عشق کی ناکامیاں اور محرومیاں ان کے دل پر گہرے اثرات چھوڑتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ایک گہری داخلی کیفیت اور درد مندی محسوس ہوتی ہے۔ ناقد فراق گور کھپوری نے میر کی اسی داخلی کیفیت کو ”بہتری چوٹ“ سے تعبیر کیا ہے۔

مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار دیکھیے:

جب نام تیرا لیجے تب آنکھ بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

میر کی شاعری میں صرف مجازی محبت ہی نہیں بلکہ تصوف کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ صبر و رضا، قناعت، درد مندی اور دنیا کی بے ثباتی جیسے مضامین ان کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں۔ وحدت الوجود اور بے خودی جیسے صوفیانہ تصورات بھی ان کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ میر کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ان کی سادگی اور خلوص ہے۔ وہ تکلف اور بناوٹ سے گریز کرتے ہیں، اسی لیے ان کے اشعار میں بے ساختگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب سادہ ہونے کے باوجود نہایت مؤثر اور دلنشین ہے۔ ان کے اشعار میں نرمی، روانی اور موسیقیت کا خاص عنصر پایا جاتا ہے۔ مترنم الفاظ، چھوٹی بحریں اور مناسب ردیف و قافیہ ان کی شاعری کو نغمگی عطا کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ الفاظ کی تکرار سے بھی آہنگ پیدا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر:

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

میر اپنی شاعری میں تشبیہ اور استعارے کا نہایت دلکش استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہیں بظاہر سادہ ہوتی ہیں مگر ان میں ایک تازگی اور تاثیر ہوتی ہے جو قاری کے ذہن میں زندہ تصویر پیدا کر دیتی ہے۔

مثلاً:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اردو کے کئی بڑے شعراء جیسے غالب، ذوق، ناسخ، مومن اور حسرت نے میر کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ شاعری میں واسوخت کا انداز بھی میر ہی کی ایجاد سمجھا جاتا ہے۔ ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ کلیات میر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں شامل ہیں:

- چھ اردو دیوان
- متعدد مثنویاں
- ذکرِ میر (خود نوشت سوانح)
- نکات الشعراء (تذکرہ شعرا)

مختصر آئیہ کہا جاسکتا ہے کہ میر تقی میر نے اردو شاعری کو ایک نئی گہرائی اور تاثیر عطا کی۔ ان کی شاعری میں موضوع، اسلوب اور زبان تینوں سطحوں پر انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اسی لیے انہیں خدائے سخن، شہنشاہِ غزل اور سرتاجِ شعرائے اردو جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں میر کا مقام ہمیشہ بلند اور نمایاں رہے گا۔

11.2.0 (غزل) ہستی اپنی حباب کی سی ہے					
ہستی	اپنی	حباب	کی	سی	ہے
یہ	نمائش	سراب	کی	سی	ہے

شاعر انسانی وجود اور دنیا کی حقیقت پر گہرا فلسفیانہ تبصرہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی ہستی پانی کے بلبلے کی طرح ہے جو لمحہ بھر بنتا ہے اور فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی ساری چمک دمک، رونق اور ظاہری جلوہ گری بھی سراب کی مانند ہے دور سے حقیقت معلوم ہوتی ہے مگر قریب جا کر فریب ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح شاعر انسانی غرور کو توڑتا اور بے ثباتی کا احساس دلاتا ہے۔ ہستی کو حباب اور دنیا کی نمائش کو سراب سے تشبیہ دے کر شاعر نے ناپائیداری اور فریب کے مفہوم کو نہایت مؤثر بنایا ہے، یوں دو واضح تشبیہیں شعر کا مرکزی حسن ہیں۔ حباب اور سراب کے باہمی تعلق سے مراعاتِ النظیر بھی پیدا ہوتی ہے، جبکہ مجموعی انداز میں گہرا فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ نمایاں ہے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

شاعر محبوب کے لبوں کی نزاکت، لطافت اور دلکشی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ گلاب کی ایک نازک پنکھڑی جیسے ہیں۔ اس بیان میں صرف جسمانی حسن نہیں بلکہ لطافتِ احساس بھی شامل ہے۔ گلاب کی پنکھڑی نرمی، تازگی اور خوشبو کی علامت ہے، اس لیے یہ تشبیہ محبوب کے

حسن کو ہمہ جہت بنا دیتی ہے۔
یہاں محبوب کے لبوں کو گلاب کی پٹھڑی سے تشبیہ دے کر تشبیہ بلیغ کا حسین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ فطرت کی لطیف ترین شے کو معیار بنا کر بیان کرنے سے کلام میں حسن انتخاب اور جمالیاتی تاثیر بڑھ گئی ہے۔ بیان میں لطافت اور نرمی کی فضا قائم ہوتی ہے۔

چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

شاعر نصیحت کرتا ہے کہ انسان صرف ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ باطنی بصیرت سے بھی دیکھے۔ دل کی آنکھ کھولنے کا مطلب حقیقت شناسی اور روحانی آگہی حاصل کرنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی حیثیت ایک خواب جیسی ہے وقتی، ناپائیدار اور دھوکا دینے والی۔ جب شعور بیدار ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب عارضی تھا۔ ”چشمِ دل“ یہاں استعارہ ہے باطنی بصیرت کا، جبکہ دنیا کی مدت کو خواب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شعر میں تصوفی فکر اور فلسفیانہ گہرائی نمایاں ہے اور ظاہر و باطن کے فرق کو مؤثر انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

شاعر محبوب کے در پر بار بار جانے کا ذکر کرتا ہے، جو عشق کی شدت اور بے اختیاری کو ظاہر کرتا ہے۔ مسلسل حاضری اور انتظار نے اس کے دل کی کیفیت کو بے چینی اور اضطراب میں بدل دیا ہے۔ گویا عشق نے سکون چھین کر دل کو مسلسل حرکت اور بے قراری میں مبتلا کر دیا ہے۔ عاشق کی بے چینی کی جو تصویر بنتی ہے وہ کیفیت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ ”بار بار“ کی تکرار سے عمل کی شدت ظاہر ہوتی ہے، جس سے ہلکا سا تاکید کی اسلوب پیدا ہوتا ہے۔ جذبے کی شدت دکھانے میں مبالغہ کارنگ بھی جھلکتا ہے۔

نقطہٴ خال سے ترا ابرو
بیت اک انتخاب کی سی ہے

شاعر محبوب کے خال کے نقطے اور ابرو کی خمیدگی کو ملا کر ایک شعری مصرع یا منتخب بیت سے تشبیہ دیتا ہے۔ گویا محبوب کا چہرہ خود ایک مکمل شعر بن گیا ہے۔ اس طرح حسن اور فن ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور جمالیات شاعری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں ابرو اور

خال کو منتخب بیت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نقطہ، بیت، انتخاب یہ سب شعری اصطلاحات ہیں، اس لیے یہاں مراعات النظر اور حسن تناسب پیدا ہوتا ہے۔ محبوب کے حسن کو شاعری کا استعارہ بنانا استعارہ جمال کی خوبصورت مثال ہے۔

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

شاعر کہتا ہے کہ جب میں نے کچھ کہا تو سننے والے نے فوراً پہچان لیا کہ یہ آواز اسی برباد حال عاشق کی ہے۔ یعنی شاعر کی شناخت اس کے درد، شکستگی اور بربادی سے جڑ چکی ہے۔ اس میں خود آگاہی بھی ہے اور تلخ مزاح بھی۔ ”خانہ خراب“ عاشقِ ناکام کا کنایہ ہے۔ اپنے حال پر ہلکا سا چھتا ہوا تبصرہ موجود ہے، جس سے طنز کا لطیف پہلو پیدا ہوتا ہے۔ اس میں خود کلامی اور داخلی شعور کی جھلک بھی ملتی ہے۔

دیکھیے ابر کی طرح اب کے
میری چشم پر آب کی سی ہے

شاعر اپنی آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو بادل کے پانی سے تشبیہ دیتا ہے۔ یعنی اس بار غم اس قدر زیادہ ہے کہ آنکھیں اشک سے لبریز ہیں۔ آنسوؤں کی کثرت کو قدرتی منظر کے ذریعے محسوس کرایا گیا ہے۔ آنکھ کو ابر اور آنسو کو آب سے جوڑنا واضح تشبیہ ہے۔ ابر، آب اور چشم کے الفاظ سے مراعات النظر پیدا ہوتی ہے۔ آنسوؤں کی بہتات کا بیان مبالغہ بھی ہے، جو جذباتی شدت کو بڑھاتا ہے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

شاعر محبوب کی نیم وا آنکھوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان میں ایسی سرشاری اور کشش ہے جیسے پوری شراب کی مستی سمٹ آئی ہو۔ یہ حسن نظر کی معراج اور عشق کی سرمستی کا بیان ہے۔ نیم باز آنکھیں غنودگی، ناز اور کشش کی علامت بھی ہیں۔ آنکھوں کی مستی کو شراب سے تشبیہ دے کر نہایت دلکش تشبیہ قائم کی گئی ہے۔ آنکھ اور شراب کا ربط کلاسیکی غزل کی معروف علامتی روایت سے جڑا ہے، اس لیے یہاں روایتی علامت نگاری بھی موجود ہے۔ شعر میں حسن و سرمستی کا جمالیاتی امتزاج پایا جاتا ہے۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

اس شعر میں شاعر اپنی پوری زندگی کو غم کے تجربے سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک سانس باقی رہی، غم بھی اس کے ساتھ وابستہ رہے۔ گویا زندگی اور غم لازم و ملزوم تھے اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے۔ مگر ان تمام غموں میں سب سے بڑھ کر دکھ دل کے ہاتھ سے چلے جانے کا تھا، یعنی عشق میں مبتلا ہو کر اپنا اختیار، سکون اور خودی کھو بیٹھنے کا صدمہ سب سے زیادہ گہرا تھا۔ یہاں ’دل کا جانا‘ صرف جذباتی ہار نہیں بلکہ عاشق کے مکمل وجود کی شکست کا استعارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق شاعر کے نزدیک محض جذبہ نہیں بلکہ ہمہ گیر تجربہ ہے۔ فنی طور پر لفظ غم کی تکرار شدتِ احساس کو بڑھاتی ہے اور غم کے تسلسل کو ظاہر کرتی ہے، اس طرح تکرارِ لفظی معنی کو مضبوط کرتی ہے۔ ’دم‘ اور ’غم‘ کی صوتی مناسبت شعر میں سوز بھری موسیقیت پیدا کرتی ہے۔ پوری زندگی کو غم سے عبارت قرار دینا مبالغہ ہے، مگر غزلیہ روایت میں یہ مبالغہ سچا محسوس ہوتا ہے۔

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

اس شعر میں شاعر محبوب کے حسن کی ہمہ گیری اور اثر آفرینی بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب کا حسن اس قدر دل فریب تھا کہ جب اس کے چہرے پر ’خط‘ نمودار ہوا جو عموماً حسن میں کمی کی علامت سمجھا جاتا ہے تب بھی حسن کی ایک نئی دنیا قائم رہی۔ یعنی حسن میں کمی نہیں آئی بلکہ ایک نئی دلکشی پیدا ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا حسن تغیر کے باوجود اپنی تاثیر برقرار رکھتا ہے۔ شاعر حسن کو جامد شے نہیں بلکہ بدلتی ہوئی مگر قائم رہنے والی کیفیت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لفظ خط میں ایہام ہے: اس سے چہرے کی باریک لکیر بھی مراد ہو سکتی ہے اور خطِ تحریر بھی اس دو معنویت سے شعر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ حسن کو ’عالم فریب‘ کہنا مبالغہ ہے۔ پہلے اور بعد کی کیفیت کو ساتھ رکھ کر شاعر نے لطیف تضاد بھی پیدا کیا ہے، جس سے معنی میں تازگی آتی ہے۔

دل نہ پہنچا گوشہ داماں تلک
قطرہ خوں تھا مژہ پر جم رہا

اس شعر میں شاعر اپنی بے بسی اور فریاد کی بے اثری کو نہایت تصویری انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آنکھ سے نکلا ہوا خون آلود آنسو محبوب کے دامن تک بھی نہ پہنچ سکا اور پلک ہی پر جم کر رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فریاد، اس کا درد اور اس کی قربانی محبوب تک اثر انداز نہ ہو سکی۔ گویا اظہارِ غم کا راستہ ہی بند ہو گیا۔ اس کیفیت میں محرومی، رکاوٹ اور ناکامی کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ آنسو کو قطرہٴ خوں کہنا استعارہ ہے جو غم کی شدت کو بڑھا دیتا ہے۔

سننے میں ہیں لیلیٰ کے خیمے کو سیاہ
اس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا

شاعر مشہور عشقیہ داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لوگ لیلیٰ کے خیمے کو بدنام کہتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہاں مجنوں کے درد، وفا اور قربانی کا ماتم برپا تھا۔ یعنی بدنامی کا سبب عشق کی شدت تھی، نہ کہ کوئی اخلاقی خرابی۔ اس طرح شاعر معاشرتی فیصلوں پر سوال اٹھاتا اور عشق کو تقدس عطا کرتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی طرف اشارہ تبلیغ ہے جو شعر کو تہذیبی گہرائی دیتا ہے۔ بدنامی کی نئی وجہ بیان کرنا حسنِ تعلیل ہے۔ ظاہر (بدنامی) اور باطن (وفا) کے فرق سے معنوی گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

جامہٴ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

یہ شعر تصوفی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زاہد کے ظاہری مذہبی لباس اور عبادت پر فریب نہ کھاؤ، کیونکہ وہ حرم میں موجود ہو کر بھی دل سے پاک نہ تھا۔ اس کا باطن خدا سے دور تھا۔ اس طرح شاعر ظاہر پرستی پر تنقید اور باطن کی سچائی پر زور دیتا ہے۔ احرام اور نامحرم کے الفاظ سے واضح تضاد پیدا ہوتا ہے۔ زاہد پر لطیف طنز موجود ہے۔ احرام ظاہری تقدس اور نامحرم باطنی دوری کی علامت ہے۔ علامتی نظام قائم ہوتا ہے۔ شعر میں اخلاقی اور روحانی تنبیہ نمایاں ہے۔

11.2.2 غزل (عشق میں، بے خوف و خطر چاہیے)

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے
جان کے دینے کو جگر چاہیے

شاعر عشق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عشق کوئی آسان اور نرم جذبہ نہیں بلکہ ایک پر خطر اور کٹھن راستہ ہے۔ اس راہ میں قدم رکھنے والے کو خوف، خطرات، رسوائی، محرومی اور قربانی سب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے محض زبانی دعویٰ کافی نہیں، بلکہ جان دینے کا حوصلہ اور باطنی

جرات بھی ضروری ہے۔ شاعر گویا عشق کو میدانِ آزمائش قرار دیتا ہے جہاں کمزور دل اور بزدل انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں عشق کو روحانی جہاد اور اخلاقی امتحان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لفظ جگر یہاں حقیقی عضو نہیں بلکہ حوصلہ، جرات اور مردانگی کا مجازی استعارہ ہے۔ خوف و خطر کا ذکر عشق کی فطری سختی کو نمایاں کرتا ہے۔ سادہ الفاظ میں گہرا مفہوم ادا کرنا سہل ممتنع کی خوبی ہے، جو اس شعر میں نمایاں ہے۔

قابل	آغوش	ستم	دیدگاں
اشک	سا	پاکیزہ	گہر
		چاہیے	

شاعر کہتا ہے کہ ظلم سہہ لینے والا ہر شخص گلے لگانے کے قابل نہیں ہوتا، بلکہ اصل قدر اس کی ہے جس کا دل دکھ سہہ کر پاکیزہ ہو گیا ہو۔ یعنی مصیبت اگر انسان کے باطن کو صاف اور شفاف بنادے تو وہ قیمتی ہو جاتا ہے۔ صرف ستم اٹھانا کافی نہیں، اس کے نتیجے میں دل کی تطہیر اور روحانی بلندی ضروری ہے۔ یہاں آنسو کو گہر (موتی) سے تشبیہ دی گئی ہے جو تشبیہ بلیغ ہے اور پاکیزگی و قیمت دونوں مفہوم پیدا کرتی ہے۔ ستم دیدگی کو روحانی صفائی سے جوڑنا میرسی داخلیت اور اخلاقی فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ اشک، پاکیزگی اور گہر کے باہمی ربط سے معنوی حسن پیدا ہوتا ہے۔

حال	یہ	پہنچا	ہے	کہ	اب	ضعف	سے
اٹھتے	پلک	ایک	پہر	چاہیے			

شاعر اپنی انتہائی کمزوری اور ناتوانی کا حال بیان کرتا ہے کہ اب پلک اٹھانے جیسا معمولی کام بھی بہت وقت لیتا ہے۔ یہ ضعف صرف جسمانی نہیں بلکہ روحانی اور جذباتی بھی ہے، جو مسلسل صدموں اور عشق کے کرب کا نتیجہ ہے۔ اس سے عاشق کی ٹوٹ پھوٹ اور تھکن کا اندازہ ہوتا ہے۔ پلک اٹھانے میں ایک پہر لگنے کا بیان واضح مبالغہ ہے، جو کیفیت کو مؤثر بناتا ہے۔ داخلی حالت کو خارجی عمل سے ظاہر کرنا میرسی اسلوب کی خاص پہچان ہے۔ اس میں کیفیت نگاری بہت نمایاں ہے۔

کم	ہے	شناسائے	زر	داغ	دل
اس	کے	پرکھنے	کو	نظر	چاہیے

شاعر کہتا ہے کہ دل کے زخم کی قدر پہچاننے والے لوگ بہت کم ہیں۔ ہر شخص دردِ دل کی قیمت نہیں جانتا۔ جس طرح سونے کی پہچان کے لیے ماہر نظر چاہیے، اسی طرح دل کے داغ کی قدر کے لیے بھی صاحبِ بصیرت ہونا ضروری ہے۔

سینکڑوں مرتے ہیں سدا پھر بھی یاں
واقعہ اک شام و سحر چاہیے

شاعر معاشرتی بے حسی پر طنز کرتا ہے کہ روز بہت لوگ مر جاتے ہیں مگر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا، جب تک موت کسی نمایاں واقعے یا خاص وقت سے وابستہ نہ ہو۔ عام دکھ خبر نہیں بنتا، خاص دکھ بنتا ہے۔ شام و سحر وقت کی علامت ہیں۔ شعر میں سماجی طنز اور تلخ حقیقت نگاری موجود ہے۔ کثرتِ اموات کا ذکر مبالغہ نما عمومی بیان ہے جو بے حسی کو نمایاں کرتا ہے۔

عشق کے آثار ہیں اے بواہوس
داغ بہ دل دست بسر چاہیے

شاعر سطحی عاشق (بواہوس) کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ عشق کی اصل نشانیاں دل کے زخم اور عاجزی و خود سپردگی ہیں۔ محض خواہش یا لطف اندوزی عشق نہیں۔ سچا عشق انسان کو جھکا دیتا ہے۔ داغِ دل اور دستِ بسر عشق کی علامتیں بن جاتے ہیں۔ شعر میں تصوفی رنگ نمایاں ہے۔

شرطِ سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

اس شعر میں شاعر ایک نہایت حکیمانہ اور تجرباتی نکتہ بیان کرتا ہے کہ زندگی کے ہر کام میں سلیقہ، فہم اور توازن ضروری ہے۔ کوئی بھی عمل خواہ وہ تعریف ہو یا تنقید بغیر شعور اور مہارت کے درست نہیں ہو سکتا۔ شاعر خاص طور پر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ کسی میں عیب نکالنا بھی ایک فن ہے، جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اکثر لوگ تنقید کے نام پر محض اعتراض کرتے ہیں، مگر سچی تنقید وہ ہے جو بصیرت، انصاف اور علم پر مبنی ہو۔ اس طرح شعر محض عشقیہ نہیں بلکہ فکری اور سماجی سطح پر بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ شعر حکمت آموز اور قولِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اختصار میں بڑی بات کہنا میر کے کمالِ بیان کو ظاہر کرتا ہے۔ ”سلیقہ“ اور ”ہنر“ کے الفاظ معنوی ربط رکھتے ہیں، جس سے داخلی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ سادہ زبان مگر گہرا مفہوم یہ سہلِ ممتنع کی نمایاں مثال ہے۔

جیسے جرس پارہ گلو کیا کروں
نالہ و افغاں میں اثر چاہیے

شاعر اپنی فریاد کی بے اثری کو تشبیہ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری حالت اس گھنٹی کی مانند ہے جو گلے میں اٹک گئی ہو آواز تو پیدا ہو رہی ہے مگر پوری طرح گونج اور تاثیر کے ساتھ باہر نہیں آ پارہی۔ یعنی میرا نالہ و افغاں صرف آواز بن کر رہ گیا ہے، اس میں وہ اثر اور تاثیر پیدا نہیں ہو رہی جو دلوں کو ہلادے۔ اس میں شاعر کا داخل کرب بھی ہے اور اظہار کی ناکامی کا احساس بھی۔ ”جرس پارہ گلو“ ایک نہایت خوبصورت اور نادر تشبیہ ہے جو بے اثر آواز کی مکمل تصویر کھینچ دیتی ہے۔ نالہ و افغاں غم کے استعارے ہیں، جبکہ ”اثر“ مقصدِ اظہار کی علامت ہے۔ اس طرح شعر میں استعارہ، تشبیہ، کیفیت نگاری تینوں جمع ہو گئے ہیں۔ صوتی طور پر بھی جرس، گلو، نالہ، افغاں سب آواز سے متعلق الفاظ ہیں، اس لیے معنوی مناسبت بھی قائم ہے۔

خوفِ قیامت کا یہی ہے کہ میر
ہم کو جیا بارِ دگر چاہیے

اس شعر میں میر اپنی زندگی کے مجموعی تجربے کا نچوڑ بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے قیامت کے دن کا خوف حساب و کتاب سے زیادہ اس بات کا ہے کہ کہیں مجھے دوبارہ یہی زندگی نہ جینی پڑ جائے۔ یعنی موجودہ زندگی اتنی دردناک، کربناک اور آزمائشوں سے بھری رہی ہے کہ اس کی تکرار ہی سب سے بڑا عذاب محسوس ہوتی ہے۔ یہ شعر شدید داخلی تھکن، وجودی بیزاری اور تجربہ حیات کی تلخی کا آئینہ دار ہے۔ فنی طور پر یہ شعر گہری وجودی فکر رکھتا ہے۔ قیامت کا ذکر تلمیحی پس منظر بھی رکھتا ہے۔

11.2.3 غزل (الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا)

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

شاعر اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے اپنی بیماریِ دل (یعنی عشق) کے علاج کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی، مگر کوئی بھی دوا اثر نہ کر سکی۔ آخر کار یہ بیماری اتنی بڑھ گئی کہ اس نے زندگی ہی ختم کر دی۔ یہاں عشق کو ایک ایسی مہلک بیماری کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ شاعر کی بے بسی اور عشق کی شدت اس شعر میں نمایاں ہے۔

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

شاعر کہتا ہے کہ اس نے اپنی جوانی روتے ہوئے گزار دی اور جب بڑھاپا آیا تو آنکھیں بند کر لیں یعنی موت آگئی۔ دوسرے مصرع میں زندگی کو رات اور موت کو صبح سے تشبیہ دی گئی ہے۔ گویا پوری زندگی دکھوں میں گزری اور سکون صرف موت کے بعد نصیب ہوا۔

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب نے اگرچہ پہلے ہی اسے مرنے کا پیغام بھیج دیا تھا (یعنی ناامیدی دے دی تھی)، لیکن اس میں محبوب کا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ شاعر محبوب کو الزام دینے کے بجائے اپنی تقدیر کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

شاعر کہتا ہے کہ ہم تو بے بس اور مجبور ہیں، مگر ہم پر اختیار (مختاری) کا الزام لگایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے محبوب کی مرضی سے ہوتا ہے۔ یہاں شاعر اپنے اختیار کی نفی کرتا ہے اور محبوب کی طاقت کو تسلیم کرتا ہے۔

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجد میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کے تمام رند، اوباش اور عاشق تیرے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ چاہے وہ کیسے ہی ہوں (بانکے، ٹیڑھے، ترچھے)، سب نے تجھے اپنا امام (مرشد) مان لیا ہے۔ محبوب کو ایک روحانی مرکز اور سب کا پیشوا دکھایا گیا ہے۔

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

شاعر کہتا ہے کہ ہم سے کبھی بے ادبی نہیں ہوئی، حتیٰ کہ دیوانگی کی حالت میں بھی ہم ادب کا خیال رکھتے رہے۔ ہم اس کے کوچے کی طرف جاتے ہوئے ہر قدم پر سجدہ کرتے رہے۔ یہ عاشق کی انتہائی عاجزی اور عقیدت کا اظہار ہے۔

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے کوچے میں رہنے والوں کے لیے کعبہ، قبلہ، حرم اور احرام کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی، کیونکہ ان کا سب کچھ محبوب ہی بن جاتا ہے۔ یہ ایک صوفیانہ کیفیت ہے جہاں عشق میں مذہبی ظواہر بھی پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جبہ خرقة کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

شاعر مذہبی پیشواؤں کی منافقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جو شیخ دن میں زاہد بنتا ہے، وہی رات کو مے خانے میں ہوتا ہے اور نشے میں اپنے مذہبی لباس (جبہ، خرقة، ٹوپی) بھی لٹا دیتا ہے۔ یہ معاشرتی ریاکاری پر سخت طنز ہے۔

کاش اب برقعہ منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

شاعر محبوب سے درخواست کرتا ہے کہ اب پردہ اٹھا دے، کیونکہ اگر آنکھیں بند ہوں تو دیدار کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں شاعر دیدار کی شدید خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

محبوب کو ایک ڈرے ہوئے ہرن سے تشبیہ دی گئی ہے، جو قابو میں نہیں آتا۔ شاعر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اسے قابو کیا، انہوں نے کوئی جادو یا کرامت دکھائی ہوگی۔ یہ محبوب کی بے نیازی اور نایابی کو ظاہر کرتا ہے۔

11.2.4 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے میر تقی میر کی حیات اور ان کی غزل گوئی کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کر لیا ہے تو ذیل میں دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیں۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جانچنے کے لیے حصہ 11.8 سے رجوع کریں۔

1. میر تقی میر کا اصل نام _____ تھا۔
2. میر آوار دو شاعری میں _____ کا لقب دیا گیا ہے۔
3. میر کی شاعری میں _____، _____ اور _____ جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔
4. میر کی زندگی میں _____، _____ اور _____ نے ان کی شاعری کو متاثر کیا۔
5. ”ہستی اپنی حباب کی سی ہے“ میں حباب سے مراد _____ ہے۔

11.3 عمومی جائزہ

اس سبق میں آپ نے میر تقی میر کی زندگی، شخصیت اور شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ آپ نے جاننا کہ میر آردو غزل کے نہایت اہم شاعر ہیں جنہوں نے اپنی داخلی کیفیت، سوز و گداز اور سادگی کے ذریعے اردو شاعری کو نئی بلندی عطا کی۔ اس سبق میں ان کی غزلوں کے منتخب اشعار کی تشریح کے ذریعے ان کے فنی محاسن، جیسے تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور تصوفی فکر کو سمجھا گیا۔ اس کے علاوہ میر کے حالات زندگی اور ان کے عہد کے اثرات کو بھی واضح کیا گیا۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا؟

- اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ یہ سیکھ چکے ہیں کہ:
- میر تقی میر آردو کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔
 - ان کی شاعری میں سوز، غم، عشق اور داخلیت نمایاں ہیں۔
 - ان کی زندگی کے حالات (ہجرت، محرومی، تنگدستی) نے ان کے کلام کو متاثر کیا۔

- میر کی زبان سادہ مگر نہایت مؤثر ہے۔
- ان کی شاعری میں تصوف، فلسفہ اور انسانی احساسات کی گہرائی موجود ہے۔
- انہوں نے اردو غزل کو فنی پختگی اور جذباتی وسعت عطا کی۔

11.5 فرہنگ

لفظ	معنی
حباب	پانی کا بلبہ
سراب	دھوکا، فریب
اضطراب	بے چینی
سوز و گداز	درد اور اثر
خانہ خراب	تباہ حال عاشق
جگر	حوصلہ، ہمت
بو الہوس	خواہشات کا غلام
احرام	عبادت کا لباس
نامحرم	ناواقف، غیر اہل
نالہ و فغاں	آہ و زاری

11.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. میر کو خدائے سخن کیوں کہا جاتا ہے؟

2. میرؑی شاعری میں سوز و گداز کی کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟

3. میرؑی غزلوں میں تصوفی عناصر کی وضاحت کریں۔

4. میرؑے اسلوب بیان کی خصوصیات بیان کریں۔

5. میر کے عہد کے حالات نے ان کی شاعری کو کیسے متاثر کیا؟

11.7 مشقی سوالات

1. میر تقی میر کی حیات اور ادبی خدمات پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔
2. میر کی شاعری کی خصوصیات بیان کریں۔

11.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1. میر تقی میر کی حیات اور ادبی خدمات پر تفصیلی نوٹ

میر تقی میر (1722ء-1810ء) اردو کے عظیم ترین غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا اصل نام میر محمد تقی تھا اور ’میرؔ‘ ان کا تخلص تھا۔ آپ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر محمد علی ایک روحانی شخصیت تھے جن کا اثر میر کی طبیعت پر بھی پڑا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، لیکن کم عمری میں والد کے انتقال نے ان کی زندگی میں شدید تبدیلی پیدا کی۔

گھریلو حالات کی خرابی اور معاشی تنگی کے باعث میر دہلی آ گئے، جو اس زمانے میں علم و ادب کا مرکز تھا۔ یہاں سراج الدین علی خان آرزو جیسے اساتذہ کی صحبت نے ان کی شاعری کو نکھارا۔ دہلی کی تباہی اور سیاسی ابتری کے بعد وہ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ منتقل ہو گئے، جہاں انہیں عزت و وقار حاصل ہوا۔

میر کی زندگی مسلسل دکھ، محرومی، ہجرت اور ناکامیوں سے عبارت رہی، اور یہی تجربات ان کی شاعری میں درد و سوز کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ان کی شاعری میں ذاتی غم اجتماعی احساس میں ڈھل جاتا ہے، جس سے قاری خود کو اس سے وابستہ محسوس کرتا ہے۔

ادبی خدمات کے اعتبار سے میرؔ نے اردو غزل کو نئی جہت عطا کی۔ انہوں نے زبان کو سادگی، خلوص اور اثر آفرینی دی۔ ان کے چھ دیوان ہیں جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف میں ذکرِ مسیر (خودنوشت) اور نکات الشعراء (تذکرہ) شامل ہیں۔ میرؔ نے اردو شاعری میں داخلیت، سوز و گداز، اور انسانی جذبات کی گہرائی کو فروغ دیا۔ اسی لیے انہیں ’خدائے سخن‘ اور ’شہنشاہِ غزل‘ کہا جاتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا مقام ہمیشہ بلند رہے گا۔

2. میرؔ کی شاعری کی خصوصیات

میرؔ تقی میرؔ کی شاعری کئی نمایاں خصوصیات کی حامل ہے:

(1) سوز و گداز:

میرؔ کی شاعری میں درد، غم اور حزن کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے اشعار دل پر براہِ راست اثر کرتے ہیں۔

(2) سادگی اور سلاست:

ان کی زبان نہایت سادہ، صاف اور عام فہم ہے، مگر اس میں گہری تاثیر موجود ہے۔ یہی ان کے اسلوب کا سب سے بڑا حسن ہے۔

(3) داخلیت: (Subjectivity)

میرؔ اپنی داخلی کیفیات، جذبات اور ذاتی تجربات کو شاعری میں پیش کرتے ہیں، جس سے ان کا کلام سچا اور پراثر بن جاتا ہے۔

(4) عشق کا حقیقی اظہار:

ان کی شاعری میں عشق محض رسمی نہیں بلکہ ایک حقیقی اور ذاتی تجربہ ہے، جس میں درد، ناکامی اور سچائی شامل ہے۔

(5) تصوفی رنگ:

میرؔ کے اشعار میں صبر، قناعت، وحدت الوجود اور دنیا کی بے ثباتی جیسے صوفیانہ خیالات ملتے ہیں۔

(6) فنی محاسن:

ان کی شاعری میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ، تلمیح اور مراعات النظر جیسے ادبی عناصر خوبصورتی سے استعمال ہوئے ہیں۔

(7) موسیقیت اور روانی:

ان کے اشعار میں نغمگی، ردیف و قافیہ کی خوبصورتی اور الفاظ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

11.8 جوابات سرگرمی

1. میر محمد تقی

2. خدائے سخن

3. عشق، غم، داخلیت
4. ہجرت، محرومی، معاشی تنگی
5. پانی کا بلبلہ

11.9 امدادی کتب

- | | |
|---------------------------|------------------------------|
| پروفیسر خواجہ احمد فاروقی | • میر تقی میر حیات اور شاعری |
| ڈاکٹر عبادت بریلوی | • میر تقی میر |
| پروفیسر مظفر حنفی | • مونو گراف میر تقی میر |
| مولوی عبدالحق | • انتخاب کلام میر |
| میر تقی میر | • کلیات میر |
| میر تقی میر | • ذکر میر |
| میر تقی میر | • نکات الشعراء |

سبق نمبر ۱۲۔ مرزا محمد رفیع سودا

ساخت

12.0	اغراض و مقاصد
12.1	تعارف
12.2	سودا کی حیات اور غزل گوئی
12.2.0	مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
12.2.1	ہر سنگ میں شراب ہے تیرے ظہور کا
12.2.2	دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
12.2.3	سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
12.3	عمومی جائزہ
12.4	آپ نے کیا سیکھا؟
12.5	فرہنگ
12.6	نمونہ برائے امتحانی سوالات
12.7	مشقی سوالات
12.7.0	مشقی سوالات کے جوابات
12.8	جوابات سر گرمی
12.9	امدادی کتب

12.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو مرزا رفیع سودا کی شخصیت، حیات اور شاعری سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ یہ جان سکیں گے کہ سودا آردو کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں جنہوں نے خصوصاً قصیدہ نگاری میں نمایاں مقام حاصل کیا اور اپنی شاعری میں زورِ بیان، فصاحت اور تخیل کی وسعت کو نمایاں کیا۔

اس سبق کے ذریعے آپ سودا کے خاندانی پس منظر، ان کی ادبی تربیت، دہلی کے سیاسی و سماجی حالات اور ان کے شعری سفر سے آگاہ ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ اس دور کے انتشار اور ہنگامہ خیزی نے ان کی شاعری کو کس طرح متاثر کیا اور کیوں ان کے کلام میں خارجی مشاہدہ، معاشرتی تصویر کشی اور تنوع پایا جاتا ہے۔

مزید یہ کہ آپ سودا کے اسلوبِ بیان، ان کی زبان کی پختگی، بندش کی چستی اور فنی محاسن جیسے تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور صنعتِ ہجو سے واقف ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ سودا کی شاعری میں قصیدہ، غزل اور ہجو کے مختلف اسالیب کس طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔

12.1 تعارف

یہ سبق اردو کے ممتاز شاعر مرزا رفیع سودا کی زندگی اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے حالاتِ زندگی، ادبی خدمات اور شعری خصوصیات کا جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مرزا رفیع سودا آردو شاعری میں ایک منفرد اور باوقار مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے جنہوں نے قصیدہ نگاری کو عروج پر پہنچایا۔ ان کے کلام میں زور، شوکت، فصاحت اور تخیل کی وسعت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں، معاشرتی حالات اور انسانی رویوں کی عکاسی ملتی ہے۔

اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ سودا کی شاعری کو صرف ایک صنف تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ انہوں نے قصیدہ، غزل، ہجو اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام اپنی فنی خصوصیات، زبان کی مضبوطی اور بیانیہ قوت کے باعث اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

12.2 مرزا محمد رفیع سودا حیات اور غزل گوئی

مرزا رفیع سودا آردو کے نامور شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش تقریباً 1706ء سے 1708ء کے درمیان ہوئی۔ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کا پیشہ سپہ گری تھا، تاہم ان کے والد تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ ابتدا میں سودا نے سلیمان علی خاں اور داؤد سے اصلاح لی، بعد ازاں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ اس کے علاوہ خان آرزو کی صحبت نے بھی ان کی شاعری کو جلا بخشی اور انہی کے مشورے سے انہوں نے اردو میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔

محمد شاہ کے عہد میں سودا کی شاعری کو خاص عروج حاصل ہوا اور دربار و امرا میں انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کئی رئیسوں نے ان کی سرپرستی کی، جن میں بسنت خاں اور مہربان خاں نمایاں تھے۔ تاہم جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں سے تباہی آئی تو سودا کو دہلی

چھوڑنا پڑا۔ وہ مختلف شہروں میں قیام کرتے رہے۔ متھرا، فرخ آباد اور فیض آباد اور آخر کار لکھنؤ میں سکونت اختیار کی، جہاں انہیں معقول وظیفہ بھی ملا اور زندگی نسبتاً آسودگی سے گزری۔ تقریباً 1781ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہ لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

ادبی اعتبار سے سودا نہایت ہمہ جہت شاعر تھے۔ ان کے کلام میں قصائد، ہجو، مرثیے، مثنویاں، رباعیات اور دیگر اصناف شامل ہیں۔ ان کی کلیات میں متعدد قصائد موجود ہیں جن میں انہوں نے مختلف امراء اور اہل بیت کی مدح کی ہے۔ نثر میں بھی انہوں نے کچھ رسائل تحریر کیے، جن میں تنقیدی پہلو نمایاں ہیں۔

سودا کی اصل شہرت ان کے قصائد کی وجہ سے ہے۔ اس میدان میں وہ بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے قصائد میں زور بیان، بلند آہنگی، پر شکوہ الفاظ اور نادر ترکیبیں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں تخیل کی وسعت اور اظہار کی طاقت نمایاں ہے، جس سے ان کا کلام سامع پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ اگرچہ سودا نے غزل بھی کہی، لیکن اس میدان میں ان کا انداز کچھ مختلف ہے۔ انہوں نے فارسی کے اساتذہ کی پیروی کرتے ہوئے نسبتاً مشکل زبان اور بھاری ترکیبیں استعمال کیں، جس کی وجہ سے ان کی غزل عام قارئین میں اتنی مقبول نہ ہو سکی۔ ان کی غزل میں قصیدے کی سی شان اور اسلوب پایا جاتا ہے، جو اس صنف کے لیے بعض اوقات موزوں نہیں سمجھا گیا۔

سودا کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کا موازنہ اکثر میر تقی میر سے کیا جاتا ہے، لیکن یہ موازنہ مکمل طور پر درست نہیں۔ میر کی شاعری داخلی احساسات اور غم و سوز سے بھرپور ہے، جبکہ سودا کی نظر خارجی دنیا پر ہے۔ وہ معاشرتی حالات، زندگی کے مختلف رنگوں اور انسانی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں تنوع اور وسعت زیادہ ہے۔

سودا کی ہجو گوئی بھی بہت مشہور ہے۔ انہوں نے اس میدان میں طنز و مزاح کو بھرپور انداز میں استعمال کیا، اگرچہ بعض مقامات پر ذاتیات اور مبالغہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں ظرافت، شوخی اور بیانیہ قوت نمایاں ہے۔

مجموعی طور پر سودا ایک بلند پایہ اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری میں خصوصاً قصیدہ نگاری کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان کا کلام زور بیان، فصاحت اور تخیل کی وسعت کا آئینہ دار ہے، اور اردو ادب میں ان کا مقام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

12.2.0 غزل (مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا)

مقدور	نہیں	اس	کی	تجلی	کے	بیاں	کا
جوں	شمع	سراپا	ہو	اگر	صرف	زباں	کا

شاعر کہتا ہے کہ اس محبوب حقیقی یا حسن مطلق کی تجلی اور جلوہ اس قدر عظیم، وسیع اور نورانی ہے کہ اس کو الفاظ میں پوری طرح بیان کرنا ممکن نہیں۔ انسان چاہے جتنا بھی فصیح و بلیغ ہو، اس حقیقت کے کامل اظہار سے عاجز رہتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر ایک نہایت خوبصورت مثال دیتا ہے کہ اگر انسان کا پورا جسم زبان ہی زبان بن جائے، یعنی وہ سراپا بیان بن جائے، تب بھی اس تجلی کی حقیقت کو مکمل طور پر ادا

نہیں کر سکتا۔ یہ شعر دراصل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بعض روحانی اور باطنی تجربات الفاظ کی گرفت میں نہیں آتے۔ انہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، مکمل طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس شعر میں تجلی صوفیانہ اصطلاح ہے، جو حق تعالیٰ کے نورانی ظہور کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شمع کا استعارہ بھی نہایت بلیغ ہے۔ شمع روشنی، اظہار اور سوز کی علامت ہے۔

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اس شعر میں شاعر انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اگر تو اپنے دل سے تعین اور محدودیت کے پردے ہٹا دے تو اس کائنات کے تمام بھید اور راز ایک لمحے میں تیرے سامنے آشکار ہو سکتے ہیں۔ ”تعین“ سے مراد وہ حدود و قیود ہیں جو انسان کو ظاہری دنیا تک محدود رکھتی ہیں۔ جب انسان اپنے باطن کو پاک کرتا ہے اور دل کے حجاب دور کرتا ہے تو اس پر حقیقت کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ ”طلسمات جہاں“ سے مراد دنیا کے پوشیدہ اسرار و رموز ہیں۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے ظاہری آنکھ نہیں بلکہ باطنی بصیرت درکار ہے۔ جب دل بیدار ہوتا ہے تو انسان دنیا کو صرف ظاہری صورت میں نہیں بلکہ اس کے باطنی مفہوم کے ساتھ دیکھتا ہے۔

نک دیکھ صنم خانہ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا

شعر میں شاعر ایک زاہد یا شیخ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے شیخ! ذرا عشق کے صنم خانے میں آکر بھی دیکھ۔ یہاں ایک عجیب کیفیت ہے کہ بتوں کے اندر بھی حرم کی شمع جیسا نور اور رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا عشق کی دنیا میں ظاہری تضاد باقی نہیں رہتا وہاں بت اور حرم، عشق اور عبادت، حسن اور تقدس ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں۔ شاعر یہاں اس تصور کو پیش کر رہا ہے کہ عشق ایسی قوت ہے جو ظاہری تقسیم کو مٹا دیتی ہے۔ جو چیز بظاہر معصیت یا نیا داری معلوم ہوتی ہے، عشق کی آنکھ سے دیکھنے پر اس میں بھی حق کا جلوہ نظر آسکتا ہے۔ یہ صوفیانہ وحدت نظر ہے۔

اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

اس شعر میں شاعر دنیا کو ”گلشن ہستی“ یعنی وجود کے باغ سے تعبیر کرتا ہے۔ بظاہر یہ دنیا بہت خوبصورت، دلکش اور رنگین معلوم ہوتی ہے، لیکن شاعر کہتا ہے کہ اس کی اصل حقیقت عجیب اور افسوس ناک ہے۔ جب پھول کی آنکھ کھلتی ہے، یعنی جب اسے اپنی حقیقت اور اپنے انجام

کا شعور حاصل ہوتا ہے، تب معلوم ہوتا ہے کہ خزاں کا موسم آپہنچا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی خوبصورتی عارضی ہے۔ شعور اور بیداری کے ساتھ ہی فنا اور زوال کا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کی رونق دیر پا نہیں، حسن اپنے عروج کے ساتھ زوال کا پیغام بھی رکھتا ہے۔ یہی دنیا کی بے ثباتی ہے جسے شاعر نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا

اس شعر میں شاعر نے حضرت یوسفؑ کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ مصر کا بازار حسن و جمال کی خرید و فروخت کے معروف پس منظر کے طور پر آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تمہیں مصر کے بازار میں لے بھی جایا جائے، تو وہاں بھی کوئی ایسی بیش قیمت جنس خریدنے کا خواہش مند نہیں۔ یہاں ”جنس گراں“ سے مراد یا تو اعلیٰ حسن ہے، یا حقیقت و معرفت جیسی قیمتی چیز۔ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ دنیا عموماً اصل قدروں کی قدر نہیں کرتی۔ لوگ بازار میں آتے ہیں، مگر بیش بہا چیزوں کے خریدار کم ہوتے ہیں۔ یعنی دنیا میں اہل ذوق، اہل نظر اور حقیقت شناس لوگوں کی کمی ہے۔ قیمتی متاع موجود ہوتی ہے مگر اس کی شناخت اور قدر کرنے والے کم ہوتے ہیں۔ ”مصر کا بازار“ میں واضح تلمیح ہے جو قصہ یوسفؑ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ”جنس گراں“ ایک خوبصورت استعارہ ہے، جس سے مراد حسن، عشق، معرفت یا انسانی کمال لیا جاسکتا ہے۔

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

اس شعر میں شاعر انسانی زندگی کی بے ثباتی اور انتہائی مختصر ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجود سے عدم تک، یعنی پیدا ہونے سے فنا ہونے تک، چند سانسوں ہی کا فاصلہ ہے۔ گویا زندگی بہت مختصر ہے انسان چند لمحوں کے لیے اس دنیا میں آتا ہے اور پھر رخصت ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا سے گزرنا ایسا سفر ہے جس کی کوئی پائیدار منزل نہیں۔ انسان اس دنیا میں مسافر کی طرح آتا ہے اور بہت جلد اسے آگے بڑھ جانا ہوتا ہے۔ یہ شعر زندگی کی ناپائیداری، دنیا کی عارضی حیثیت اور انسانی بے بسی کا نہایت گہرا اظہار ہے۔

سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جس دل کی فغاں کا

اس شعر میں شاعر خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے کہ اگر کبھی انسان ہمت اور توجہ کے ساتھ دل کی آواز سنے، تو اسے معلوم ہوگا کہ دل کی فریاد کا اصل مضمون یہی ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔ ”جرسِ دل“ سے مراد دل کی وہ مسلسل صدا ہے جو انسان کے باطن میں گونجتی رہتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے اشعار دراصل اسی داخلی صدائے درد کے ترجمان ہیں۔

یہ شعر پوری غزل کا حاصل بھی ہے۔ یعنی اس غزل میں جو دنیا کی بے ثباتی، عشق، تجلی، رازِ ہستی اور باطنی بصیرت کی باتیں کی گئی ہیں، وہ سب دل کی گہرائی سے اٹھنے والی فریاد ہیں۔

12.2.1 ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا

شاعر اس شعر میں خدا کی ہمہ گیری (Omnipresence) کا بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ، ہر پتھر خدا کے نور سے روشن ہے اور اس کے ظہور کی چنگاری اپنے اندر رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر خدا کا جلوہ دکھایا گیا تھا، لیکن شاعر کہتا ہے کہ وہ موسیٰ نہیں ہے کہ کسی خاص مقام پر جا کر خدا کا دیدار کرے۔ اس کے نزدیک خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہر شے میں اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اس شعر میں وحدت الوجود کا تصور نمایاں ہے۔

پڑھے درود حسن صبیح و صلیح پر
جلوہ ہر ایک پر ہے محمد کے نور کا

یہ شعر نعتیہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ شاعر حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ ﷺ حسن و جمال کا کامل نمونہ ہیں، اس لیے ان پر درود بھیجنا چاہیے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ حضور ﷺ کا نور پوری کائنات پر محیط ہے اور ہر چیز اسی نور سے روشن ہے۔ اس شعر میں عقیدتِ رسول ﷺ اور نورانیت کا تصور نمایاں ہے۔

توڑوں یہ آئینہ کہ ہم آغوشِ عکس ہے
ہووے نہ مج کو پاس جو تیرے حضور کا

یہاں ”آئینہ“ دل یا باطن کی علامت ہے، جس میں محبوب کا عکس نظر آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر مجھے محبوب کی حقیقی قربت حاصل نہیں تو اس آئینے کو توڑ دینا بہتر ہے جس میں صرف اس کا عکس نظر آتا ہے۔

یعنی شاعر کے نزدیک اصل حقیقت محبوب کے حضور میں ہونا ہے، نہ کہ اس کا عکس دیکھ کر تسلی کرنا۔

بیکس کوئی مرے تو چلے اس پہ دل مرا
گویا ہے یہ چراغِ غریباں کی گور کا

اس شعر میں شاعر اپنی حساسیت اور ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی بے سہارا اور غریب شخص مر جائے تو میرا دل اس کے لیے جل اٹھتا ہے۔ وہ اپنے دل کے اس درد کو اس چراغ سے تشبیہ دیتا ہے جو کسی غریب کی قبر پر جل رہا ہو۔

ساقی سے کہہ کہ ہے شبِ مہتاب جلوہ گر
دے بسمہ پوش ہو کے تو ساغرِ بلور کا

یہ ایک روایتی غزلیہ شعر ہے جس میں حسنِ فطرت اور سرورِ زندگی کا بیان ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج چاندنی رات ہے اور ماحول نہایت حسین ہے، اس لیے ساقی کو چاہیے کہ وہ خوبصورت انداز میں شراب کا جام پیش کرے۔

یہاں "ساقی" اور "شراب" صوفیانہ استعارے بھی ہو سکتے ہیں، جو روحانی سرور اور عشقِ الہی کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

سوداؒ کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو
آوازہ دہل ہے خوش آئند دور کا

اس شعر میں شاعر خود کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ واعظ (نصیحت کرنے والا) کی باتوں پر یقین نہ کرو، کیونکہ اس کی باتیں محض کھوکھلی اور سطحی ہوتی ہیں۔ آوازہ دہل "یعنی ڈھول کی آواز، جو سننے میں اچھی لگتی ہے مگر اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔"

12.2.2 غزل (دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا)

دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشکِ پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

اس شعر میں شاعر دل کو اشک سے تشبیہ دیتا ہے۔ شاعر اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے دل! آنکھ سے آنسو کی طرح نہ ٹپک، کیونکہ اگر تو ایک بار گر گیا تو پھر تجھے سنبھالنا یا واپس پانا ممکن نہیں ہوگا۔ یہاں "اشک" انسانی جذبات، درد اور محبت کی علامت ہے۔ جب آنسو زمین پر گر جاتا ہے تو اسے واپس نہیں لیا جاسکتا، اسی طرح اگر دل کسی کے عشق میں مکمل طور پر ٹوٹ جائے تو اسے دوبارہ حاصل کرنا یا جوڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ شعر انسانی جذبات کی نزاکت اور محبت کے انجام کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دل ایک قیمتی شے ہے، جسے بے احتیاطی سے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ شاعر ایک طرح سے خود کو بھی نصیحت کر رہا ہے کہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھے۔

رخصت ہے باغباں کہ تنک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

اس شعر میں شاعر زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دیتا ہے اور خود کو اس باغ کا مسافر سمجھتا ہے۔ وہ باغبان (نگہبانِ باغ) سے کہتا ہے کہ مجھے اجازت دو کہ میں اس باغ کو اچھی طرح دیکھ لوں، کیونکہ میں اس جگہ جا رہا ہوں جہاں سے واپس آنا ممکن نہیں۔ یہاں "چمن" دنیا کی علامت ہے اور "وہ جگہ" موت یا آخرت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شاعر کو اپنی زندگی کے خاتمے کا احساس ہے، اس لیے وہ دنیا کی خوبصورتی کو آخری بار دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ شعر زندگی کی ناپائیداری اور موت کی حقیقت کو نہایت سادہ مگر پراثر انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس میں ایک گہری اداسی اور حسرت بھی پوشیدہ ہے کہ انسان اس دنیا کو چھوڑ کر ایک ایسے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔

آنے سے فوج خط کے نہ ہو دل کو مخلصی
بندھوا ہے زلف کا یہ چھٹایا نہ جائے گا

اس شعر میں "فوج خط" سے مراد محبوب کے چہرے پر اگنے والی داڑھی یا بال ہیں، جو حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ان کے آنے سے دل کو کوئی نجات حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ دل تو پہلے ہی محبوب کی زلفوں کے جال میں گرفتار ہو چکا ہے۔ "زلف" عشق اور اسیری کی علامت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دل محبوب کی زلفوں میں اس طرح بندھ چکا ہے کہ اب اسے آزاد کرنا ممکن نہیں۔ یہ شعر عشق کی شدت اور اس کی گرفت کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک بار انسان محبت میں گرفتار ہو جائے تو پھر اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ محبوب کے حسن میں اضافہ بھی عاشق کی پریشانی کو کم نہیں کرتا بلکہ مزید بڑھا دیتا ہے۔

پہنچیں گے اس چمن میں نہ ہم داد کو کبھو
جوں گل یہ چاک جیب سلایا نہ جائے گا

اس شعر میں شاعر اپنی محرومی اور ناکامی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اس باغ (محبوب کی محفل یا کامیابی کی جگہ) میں کبھی نہیں پہنچ سکیں گے جہاں ہماری دادرسی ہو سکے۔

"چاک جیب" گریبان کے پھٹنے کو کہتے ہیں، جو غم اور مصیبت کی علامت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح پھٹا ہوا گریبان دوبارہ صحیح طرح نہیں سیا جاسکتا، اسی طرح ہماری حالت بھی سدھر نہیں سکتی۔ یہ شعر عاشق کی مایوسی، ناکامی اور اس کے دل کے زخموں کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کو یقین ہے کہ اس کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ محرومی کا شکار رہے گا۔

تغ جفائے یار سے دل سر نہ پھیرو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

اس شعر میں شاعر اپنے دل کو نصیحت کرتا ہے کہ محبوب کی بے وفائی اور ظلم (تغ جفا) سے منہ نہ موڑ، بلکہ اسے برداشت کر۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم نے محبوب کی بے وفائی سے منہ موڑ لیا تو پھر ہم وفاداری کا دعویٰ نہیں کر سکیں گے۔ یعنی سچی محبت وہی ہے جس میں تکلیف اور ظلم کو بھی برداشت کیا جائے۔ یہ شعر عشق کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے جہاں عاشق محبوب کی ہر زیادتی کو بھی محبت کا حصہ سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ اس میں وفاداری، صبر اور قربانی کا درس دیا گیا ہے۔

ظالم نہ میں کہا تھا کہ اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

اس شعر میں شاعر محبوب کو "ظالم" کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس خون (قتل) سے درگزر کرو، مگر تم نے میری بات نہ مانی۔

اب یہ قتل (عاشق کا دل توڑنا) چھپایا نہیں جاسکتا۔ یعنی محبوب کے ظلم سب پر ظاہر ہو جائیں گے۔ یہ شعر عاشق کے درد اور محبوب کی بے رحمی کو ظاہر کرتا ہے۔

دامان و داغ تنخ کو دھویا تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ دھلایا نہ جائے گا

یہ شعر غزل کا نہایت گہرا اور فکر انگیز شعر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنے دامن اور تلوار کے داغ دھو بھی لیے تو کیا ہوا، کیونکہ دنیا کے دلوں سے یہ داغ نہیں مٹایا جاسکتا۔ یہاں "داغ" ظلم، گناہ یا بدنامی کی علامت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ظاہری صفائی سے حقیقت نہیں بدلی جاسکتی، کیونکہ لوگوں کے دلوں پر جو اثر پڑتا ہے وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

یہ شعر انسانی اعمال کے دیر پا اثرات اور سچائی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

12.2.3 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آئیے ایک لمحے کے لیے رکیں۔ اب جبکہ آپ نے میرزا محمد رفیع سودا کی حیات اور ان کی غزل گوئی کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کر لیا ہے تو ذیل میں دی گئی مشق کو حل کرنے کے لیے کچھ وقت نکالیے۔ اپنے جوابات درست ہیں یا نہیں، یہ جانچنے کے لیے حصہ 12.8 سے رجوع کریں۔

1. میرزا محمد رفیع سودا کی پیدائش تقریباً _____ میں ہوئی۔
2. سودا نے سب سے زیادہ شہرت _____ نگاری میں حاصل کی۔
3. سودا کے استادوں میں _____ اور شاہ حاتم شامل ہیں۔
4. دہلی کی تباہی کے بعد سودا نے آخر کار _____ میں سکونت اختیار کی۔
5. سودا کی شاعری میں _____، فصاحت اور تخیل کی وسعت نمایاں ہے۔

12.3 عمومی جائزہ

میرزا محمد رفیع سودا اردو ادب کے ایک عظیم اور صاحب طرز شاعر ہیں جنہوں نے خصوصاً قصیدہ نگاری کو عروج بخشا۔ ان کی شاعری میں زور بیان، بلند آہنگی، فصاحت اور تخیل کی وسعت نمایاں ہے۔ انہوں نے نہ صرف قصیدہ بلکہ غزل، ہجو اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام میں معاشرتی حالات، انسانی رویے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں خارجی مشاہدہ زیادہ نمایاں ہے، جس کی وجہ سے ان کے ہاں وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرزا رفیع سودا آردو کے ایک نہایت اہم اور باوقار شاعر ہیں جنہوں نے اپنی فنی مہارت اور زورِ بیان کے ذریعے اردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ادب محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ معاشرت، تاریخ اور انسانی جذبات کی عکاسی کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ہم نے یہ بھی سیکھا کہ سودا نے قصیدہ نگاری میں غیر معمولی مقام حاصل کیا، جبکہ ان کی غزلوں میں بھی فکری گہرائی اور زبان کی چٹنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف، عشق، انسان دوستی اور زندگی کی حقیقتوں کا بیان ملتا ہے۔ مزید برآں، ان کے کلام سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان کو ظاہری دکھاوے کے بجائے حقیقت، خلوص اور گہرے شعور کو اپنانا چاہیے۔

12.5 فرہنگ

لفظ	معنی
تجلی	نور کا ظہور
تعیین	حد بندی
قفص	پنجرہ
چاک جیب	پھٹا ہوا گریبان
تنغ	تلوار
زاہد	پرہیزگار
ظہور	ظاہر ہونا
جرس	آواز / گھنٹی

12.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. مرزا رفیع سودا کی ادبی خدمات بیان کریں۔
2. سودا کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟
3. سودا کی قصیدہ نگاری پر ایک مفصل نوٹ تحریر کیجئے۔

12.7 مشقی سوالات

1. مرزا رفیع سودا کی حیات و خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیں۔

2. سودا کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کریں۔

3. سودا اور میر تقی میر کے اسلوب کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔

12.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

سوال 1: مرزا رفیع سودا کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالے۔

مرزا رفیع سودا کی پیدائش اٹھارویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے اساتذہ سے حاصل کی اور بعد میں شاہ حاتم کی شاگردی اختیار کی۔ دہلی کے سیاسی انتشار نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، جس کے باعث وہ مختلف شہروں میں منتقل ہوتے رہے اور آخر کار لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔

ادبی اعتبار سے سودا ایک ہمہ جہت شاعر تھے۔ انہوں نے قصیدہ، غزل، ہجو، مرثیہ اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن انہیں اصل شہرت قصیدہ نگاری سے ملی۔ ان کے قصائد میں زورِ بیان، بلند آہنگی اور فصاحت نمایاں ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی۔

سوال 2: سودا کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

میرزا محمد رفیع سودا اردو کے سب سے بڑے قصیدہ نگار سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے پہلی بار فارسی طرز پر قصیدہ لکھ کر اس صنف کو باقاعدہ ادبی وقار اور بلندی عطا کی۔ اگرچہ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بھی قصیدہ نگاری کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں سودا کو سبقت حاصل ہے۔ سودا نے نہ صرف قصیدہ کی روایت کو مضبوط کیا بلکہ اس میں نئے مضامین، خیالات اور وسعت پیدا کی۔ ان کے قصائد میں زورِ بیان، فصاحت، بلند آہنگی اور تخیل کی وسعت نمایاں ہے۔ ان کی کلیات میں بڑی تعداد میں مدحیہ اور ہجویہ قصائد ملتے ہیں، جن میں انہوں نے بادشاہوں، امرا اور بزرگانِ دین کی تعریف کی ہے۔

فنی اعتبار سے سودا کے قصائد نہایت معیاری ہیں۔ ان کے مطلعے دلکش اور اثر انگیز ہوتے ہیں، تشبیب میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے، اور گریز نہایت فطری انداز میں ہوتا ہے۔ مدح کے حصے میں وہ مدوح کی صفات کو مبالغہ آمیز مگر مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں، جبکہ اختتام (دعائیہ) میں روایتی انداز برقرار رکھتے ہیں۔

سودا کے قصائد کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں اپنے دور کے سماجی اور تاریخی حالات کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے ہاں تشبیہات، استعارات اور زبان کی پختگی اعلیٰ درجے کی ہے، جس سے ان کا کلام پر شکوہ اور جاندار بن جاتا ہے۔

اگرچہ ان کے ہاں مبالغہ زیادہ ہے، مگر یہ قصیدہ نگاری کا تقاضا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ سودا نے اردو قصیدہ نگاری کو ایک مضبوط بنیاد، وسعت اور عظمت عطا کی، اور اردو ادب میں ان کا مقام اس صنف کے امام کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رہے گا۔

سوال 3: سودا کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

میرزا محمد رفیع سودا اردو کے ایک بلند پایہ اور صاحبِ طرز شاعر ہیں جن کی شاعری اپنی فنی عظمت اور بیانیہ قوت کے باعث ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف زورِ بیان اور بلند آہنگی ہے۔ ان کے اشعار میں ایک خاص جلال، شان اور خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے جو قاری اور سامع دونوں کو متاثر کرتا ہے۔

سودا کی زبان نہایت فصیح، شستہ اور بلیغ ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنے خیالات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زبان کی پختگی اور بندش کی چستی نمایاں ہے، جس کی وجہ سے ان کا کلام مربوط اور مضبوط محسوس ہوتا ہے۔

ان کی شاعری میں تخیل کی وسعت بھی قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے خیالات کو جدت اور ندرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور عام مضامین کو بھی غیر معمولی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مبالغہ آرائی کا عنصر بھی نمایاں ہے، خاص طور پر قصائد میں، جہاں وہ مدوح کی تعریف میں بلند ترین صفات بیان کرتے ہیں، جو اس صنف کا تقاضا بھی ہے۔

سودا نے اپنے کلام میں تشبیہات اور استعارات کا نہایت خوبصورت اور مؤثر استعمال کیا ہے، جس سے ان کی شاعری میں حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں داخلی کیفیات کے بجائے خارجی مشاہدہ زیادہ نمایاں ہے۔ وہ اپنے دور کے معاشرتی حالات، انسانی رویوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں، جس سے ان کا کلام حقیقت سے قریب محسوس ہوتا ہے۔

مزید برآں، سودا ایک بہترین ہجو نگار بھی تھے۔ انہوں نے طنز و مزاح کے ذریعے معاشرتی برائیوں اور افراد کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا۔ تاہم ان کی اصل پہچان قصیدہ نگاری ہے، جس میں انہوں نے غیر معمولی مہارت حاصل کی اور اس صنف کو اردو ادب میں ایک مضبوط اور باوقار مقام عطا کیا۔

مختصر آئیہ کہا جاسکتا ہے کہ سودا کی شاعری زورِ بیان، فصاحت، تخیل کی بلندی، مبالغہ، اور فنی مہارت کا حسین امتزاج ہے، جس نے انہیں اردو ادب میں ایک نمایاں اور منفرد مقام عطا کیا۔

12.8 جوابات سرگرمی

1. 1706ء تا 1708ء

2. قصیدہ

3. سلیمان علی خاں

4. لکھنؤ

5. طنز

12.9 امدادی کتب

- تاریخ ادبِ اردو
- انتخابِ کلامِ سودا
- ڈاکٹر جمیل جالبی
- ناشر رام نارائن لال بنی آلہ آباد

- مرزا محمد رفیع سودا
 - مونو گراف مرزا محمد رفیع سودا
 - مرزا محمد رفیع سودا
 - م مرزا محمد رفیع سودا تحقیقی و تنقیدی جائزے
- خلیق انجم
- مظہر احمد
- قاضی افصاؑ حسین
- پروفیسر نذیر احمد

سبق نمبر ۱۳۔ شیخ امام بخش ناسخ

ساخت

13.0	اغراض و مقاصد
13.1	تعارف
13.2	ناسخ کی حیات اور غزل گوئی
13.2.0	مراسینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
13.2.1	جب سے کہ بتوں سے آشنا ہوں
13.2.2	میں پوشیدہ تپِ عشق بُتاں رکھتے ہیں
13.2.3	سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
13.3	عمومی جائزہ
13.4	آپ نے کیا سیکھا؟
13.5	فرہنگ
13.6	نمونہ برائے امتحانی سوالات
13.7	مشقی سوالات
13.7.0	مشقی سوالات کے جوابات
13.8	جوابات سر گرمی
13.9	امدادی کتب

13.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو شیخ امام بخش ناسخ کی شخصیت، حیات اور شاعری سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ یہ جان سکیں گے کہ ناسخ اردو کے ایک بلند پایہ شاعر اور دبستان لکھنؤ کے اہم نمائندہ شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کو زبان کی صفائی، محاورے کی درستگی اور فنی نزاکت عطا کی۔

اس سبق کے ذریعے آپ ناسخ کے خاندانی پس منظر، ان کی ادبی تربیت، لکھنؤ کے تہذیبی و ادبی ماحول اور ان کے شعری سفر سے آگاہ ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ لکھنؤ کی تہذیب، شائستگی اور معاشرتی رنگارنگی نے ان کی شاعری پر کس طرح اثر ڈالا اور کیوں ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی، محاورے کی درستگی اور فنی حسن نمایاں نظر آتا ہے۔ مزید یہ کہ آپ ناسخ کے اسلوب بیان، زبان کی لطافت، بندش کی چستی اور فنی محاسن جیسے تشبیہ، استعارہ، رعایت لفظی اور صنعت ایہام سے واقف ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ ناسخ نے غزل کے مختلف موضوعات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا اور اردو شاعری میں اصلاح زبان اور تہذیبی شائستگی کی روایت کو مستحکم کیا۔

13.1 تعارف

یہ سبق اردو کے ممتاز شاعر شیخ امام بخش ناسخ کی زندگی اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے حالات زندگی، ادبی خدمات اور شعری خصوصیات کا جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

شیخ امام بخش ناسخ اردو شاعری میں ایک منفرد اور باوقار مقام رکھتے ہیں۔ وہ دبستان لکھنؤ کے اہم شاعر تھے جنہوں نے اردو غزل کو فنی لطافت، زبان کی پاکیزگی اور محاورے کی صحت عطا کی۔ ان کے کلام میں شائستگی، نزاکت، فصاحت اور تہذیبی رنگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی جذبات، عشق و محبت اور معاشرتی اقدار کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔

اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ناسخ کی شاعری صرف غزل تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے زبان و بیان کی اصلاح اور شعری روایت کی استواری میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا کلام اپنی فنی خصوصیات، زبان کی صفائی اور شعری وقار کے باعث اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔

13.2 ناسخ کی حیات اور غزل گوئی

شیخ امام بخش ناسخ 10 اپریل 1772ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی وہیں گزری اور وہیں ان کی تربیت ہوئی۔ بچپن ہی سے انہیں ورزش اور جسمانی مشقوں کا شوق تھا۔ ان کا جسم مضبوط، چال ڈھال پر جوش اور طبیعت میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ فیض آباد کے ایک دولت مند شخص محمد تقی کو ایسے نوجوانوں کی سرپرستی کا شوق تھا، چنانچہ انہوں نے ناسخ کو اپنے ساتھ ملازم رکھ لیا اور اسی تعلق کے باعث ناسخ لکھنؤ پہنچے۔

لکھنؤ میں ان کی وابستگی ایک رئیس میر کاظم علی سے ہوئی جنہوں نے انہیں نہایت محبت سے اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا۔ میر کاظم علی کے انتقال کے بعد ان کی خاصی جائیداد ناسخ کو ملی جس کے نتیجے میں انہیں مالی آسودگی حاصل ہو گئی۔ اس خوشحال زندگی نے انہیں یکسوئی کے ساتھ شعر و ادب کی طرف متوجہ ہونے کا موقع فراہم کیا اور انہوں نے لکھنؤ ہی کو اپنا مستقل مسکن بنالیا۔

ناسخ کسی استاد کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنی صلاحیت اور مطالعے کی بنیاد پر شعری مقام حاصل کیا۔ اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر نے انہیں دربار سے وابستہ کرنا چاہا لیکن ناسخ نے ملازمت قبول نہیں کی۔ ان کی طبیعت میں خودداری اور آزادی بہت نمایاں تھی۔ درباری اختلافات اور سیاسی حالات کے باعث انہیں بعض اوقات لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور وہ الہ آباد، بنارس، فیض آباد اور کانپور جیسے شہروں میں بھی رہے، لیکن آخر کار دوبارہ لکھنؤ واپس آ گئے۔

دکن کے مشہور دیوان چند لال نے بھی انہیں حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور اس مقصد کے لیے بڑی رقم بھی بھیجی، مگر ناسخ نے اپنا وطن اور ماحول چھوڑنا پسند نہ کیا۔

ادبی اعتبار سے ناسخ کو دبستان لکھنؤ کا پہلا بڑا معمار کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری نے لکھنؤ کے مخصوص ادبی رنگ کو فروغ دیا۔ ان کے شاگرد صرف لکھنؤ تک محدود نہیں رہے بلکہ دہلی کے شعرا نے بھی ان کے انداز سے اثر قبول کیا۔ زبان کی اصلاح، محاورے کی درستگی اور بیان کی نزاکت ناسخ کے دبستان کا اہم کارنامہ شمار کیے جاتے ہیں۔ لکھنؤی شاعری میں جو نازک خیالی، لفظی آرائش اور خیال بندی کی روایت ملتی ہے، اس کے فروغ میں ناسخ اور ان کے شاگردوں کا بنیادی کردار رہا ہے۔

ناسخ کا ادبی سرمایہ بھی خاصا وسیع ہے۔ ان کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ رباعیات، قطعات، تاریخی اشعار اور ایک مثنوی بھی شامل ہے۔ ان کی شاعری اردو ادب میں اپنی زبان کی صفائی، فنی مہارت اور اسلوبیاتی انفرادیت کے باعث ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ شیخ امام بخش ناسخ اردو غزل کی تاریخ میں ایک نہایت اہم اور اثر انگیز شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں دبستان لکھنؤ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ دراصل لکھنؤ اسکول کا ظہور صرف شعری تبدیلی نہیں تھا بلکہ یہ دہلی کی تہذیبی اور لسانی روایت سے الگ اپنی شناخت قائم کرنے کی ایک کوشش بھی تھی۔ اس زمانے میں اودھ سیاسی طور پر خود مختاری کی طرف بڑھ رہا تھا اور تہذیبی میدان میں بھی ایک نئی انفرادیت پیدا ہو رہی تھی۔

ناسخ سے پہلے لکھنؤ میں دہلی کے شعرا جیسے میر، سودا، سوز اور مصحفی کا اثر غالب تھا۔ یہ شعر ادہلی کے سیاسی انتشار سے تنگ آ کر لکھنؤ آئے تھے جہاں ان کی بڑی قدر کی گئی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اہل لکھنؤ میں اپنی الگ تہذیبی اور ادبی شناخت پیدا کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ ایسے ماحول میں ناسخ نے شاعری میں ایک نیا انداز اختیار کیا۔ انہوں نے دہلی کے روایتی لب و لہجے سے ہٹ کر ایسی زبان اور اسلوب اپنایا جس میں لکھنؤی تہذیب، نزاکت اور لفظی شان نمایاں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل لکھنؤ نے ان کے اس نئے انداز کو بے حد پسند کیا۔

اس دور میں آتش دہلی کے روایتی اسلوب کے سب سے بڑے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ناسخ اور آتش کے حلقوں میں ادبی رقابت پیدا ہوئی۔ اس مسابقت نے دونوں شاعروں کی فنی صلاحیتوں کو مزید نکھارا۔ تاہم وقت کے ساتھ ناسخ کے طرزِ شاعری نے ایک مستقل دبستان کی شکل اختیار کر لی۔ ان کے شاگردوں نے اس انداز کو فروغ دیا اور یوں دبستانِ لکھنؤ اردو شاعری کی ایک مضبوط روایت بن گیا۔ لکھنؤ اسکول کی نمایاں خصوصیات میں نازک خیالی، بلند آہنگ الفاظ، لفظی آرائش اور خارجی مناظر کی عکاسی شامل ہیں۔ ناسخ نے زبان کی صفائی، محاورے کی درستی اور لفظی صنعت گری پر خاص توجہ دی۔ ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارات اور نئے مضامین کی جستجو نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے اور بعض اوقات محض لفظی حسن سے ایسا تاثر پیدا کرتے تھے کہ قاری حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

ناسخ کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی طرح منفرد تھی۔ کم عمری میں والد کے انتقال کے بعد ایک مالدار شخص خدا بخش نے ان کی پرورش کی۔ انہیں اچھی تعلیم اور آسودہ زندگی میسر آئی۔ وہ مالی اعتبار سے خوشحال تھے اور دنیاوی پریشانیوں سے نسبتاً آزاد رہے۔ محمد حسین آزاد کے مطابق ناسخ کو تین چیزوں کا غیر معمولی شوق تھا: کھانا، ورزش اور شاعری۔ ورزش سے ان کی دلچسپی اتنی مشہور تھی کہ لوگ انہیں ”پہلوانِ سخن“ کہنے لگے۔ ناسخ نے اپنے شعری انداز کو کسی منصوبہ بندی یا درباری خوشنودی کے لیے اختیار نہیں کیا تھا بلکہ یہ ان کی فطری پسند تھی۔ وہ آزاد مزاج انسان تھے اور انہوں نے نواب کی طرف سے دیا جانے والا ”ملک الشعراء“ کا خطاب بھی قبول نہیں کیا۔ ان کی زندگی میں خودداری اور استقلال نمایاں تھا۔ اگرچہ ناسخ کی شاعری میں لفظی صناعی اور بلند آہنگی بہت نمایاں ہے، لیکن بعض ناقدین کے نزدیک ان کے ہاں جذبات کی گہرائی نسبتاً کم ہے۔ ان کے بعض اشعار محض لفظی بازی گری محسوس ہوتے ہیں۔ بعد کے دور میں ان کے بعض شاگردوں نے اس انداز کو حد سے زیادہ اختیار کیا جس سے لکھنوی شاعری پر تصنع اور مبالغہ آرائی کا الزام لگا۔ تاہم ناسخ کے کلام کا ایک حصہ نہایت سادہ، دلنشیں اور اثر انگیز بھی ہے جس میں خلوص اور سادگی پائی جاتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی تفریق کم ہوتی گئی، لیکن ناسخ کا نام اردو شاعری میں ہمیشہ ایک اہم اور عہد آفریں شاعر کے طور پر زندہ رہا۔ جدید دور میں ناقدین خصوصاً شمس الرحمن فاروقی نے ناسخ کی شاعری کو نئے زاویے سے دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناسخ اردو شاعری کی ایک اہم کڑی ہیں جنہوں نے زبان، بیان اور اسلوب کے میدان میں گہرے اثرات چھوڑے۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

شاعر اپنے داغِ فراق کی شدت کو نہایت شاندار اور کائناتی پیکر میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا سینہ جدائی کے داغ کے سورج کا مشرق ہے، یعنی داغِ ہجراں میرے دل میں اس طرح روشن اور نمایاں ہے جیسے سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ اس داغ کی تپش اور چمک مستقل ہے اور پورے وجود کو منور بلکہ مضطرب کیے ہوئے ہے۔ دوسرے مصرع میں وہ کہتا ہے کہ میرا گریبان اس طرح چاک ہے جیسے قیامت کی صبح طلوع ہو رہی ہو۔ یعنی میری بے قراری اور اضطراب اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں جو قیامت کی ہولناکی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ یوں ذاتی درد کو کائناتی منظر نامے سے جوڑ دیا گیا ہے۔

ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دل پر داغ کو کیوں کر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا

شاعر ایک تمثیلی دلیل کے ذریعے اپنے نکتے کو واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ طاؤس (مور) اور مار (سانپ) ازل سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اسی طرح دل کے داغ جو پہلے ہی جلن اور درد کی علامت ہے کو محبوب کی تیج دار زلف سے کیسے محبت ہو سکتی ہے، کیونکہ زلف بھی سانپ کی طرح لپٹنے، ڈسنے اور ہلاک کرنے والی شے کے طور پر جانی جاتی ہے۔ گویا ایک درد زدہ دل مزید خطرناک کشش سے کیسے مانوس ہو؟ اس میں عشق کی مہلک کشش اور خود تباہی کا پہلو نمایاں ہے۔ یہاں طاؤس اور مار ایک مکمل تمثیلی نظام بناتے ہیں۔

کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبح صادق ہے غبارِ اپنے بیاباں کا

شاعر کہتا ہے کہ آج میرے دل کی کشش نے ایک سورج چہرہ محبوب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اس کی آمد سے میری ویران زندگی جسے بیاباں سے تعبیر کیا گیا کا گرد و غبار بھی صبح صادق کے نور کی طرح روشن ہو گیا ہے۔ یعنی محبوب کی توجہ نے ویرانی کو روشنی اور امید میں بدل دیا۔ یہ داخلی انقلاب کا بیان ہے جہاں محبت زندگی کے منظر نامے کو بدل دیتی ہے۔

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

شاعر ایک خوبصورت تمثیل قائم کرتا ہے کہ جیسے بارش والے بادل میں بجلی کی چمک فطری طور پر شامل ہوتی ہے، ویسے ہی محبوب کے لیے رونے میں اس کے ہنستے ہوئے چہرے کا تصور بھی شامل ہونا چاہیے۔ یعنی خالص غم بھی محبوب کی یاد کے حسن سے خالی نہیں ہوتا۔ عاشق کا رونا بھی حسن کے تصور سے روشن رہتا ہے۔

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختہ تابوت پر تختِ سلیمان کا

شاعر کہتا ہے کہ جب اس حسین محبوب نے میرے جنازے کو کاندھا دیا تو میرا سادہ تابوت بھی یوں محسوس ہوا جیسے حضرت سلیمانؑ کا شاہانہ تخت ہو۔ یعنی محبوب کی نسبت نے موت کے منظر کو بھی عظمت اور شان عطا کر دی۔ یہ عاشقانہ مبالغہ محبوب کی شرکت کو سب سے بڑی عزت قرار دیتا ہے۔ سلیمانؑ کے تخت کی طرف اشارہ تلمیح بھی ہے۔ محبوب کی شرکت کو عظمت کی علت بنانا حسنِ تعلیل کا پہلو بھی رکھتا ہے۔

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا
نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا

شاعر اپنی خودداری اور تنہائی پسندی بیان کرتا ہے کہ اس وحشت بھرے جہان میں اس نے کسی سے دل نہیں لگایا اور نہ اپنے دامن کو کانٹوں میں الجھنے دیا۔ یعنی اس نے دانستہ طور پر وابستگیوں اور ذلت آمیز تعلقات سے خود کو بچائے رکھا۔ یہ عاشق کی انا اور ضبط کا بیان بھی ہو سکتا ہے۔

تہہ شمشیر قاتل کس قدر بشار تھا ناخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

ناخ آس آخری شعر میں ایک چونکا دینے والی تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قاتل تلوار چلاتے وقت اس قدر خوش اور مسرور تھا کہ ہر زخم کا منہ ہنستے ہوئے چہرے کی مانند معلوم ہوتا ہے۔ یعنی ظلم کی شدت کو الٹے استعارے سے بیان کیا گیا ہے۔

جب سے کہ بتوں سے آشنا ہوں
بیگانہ خدائی سے ہوا ہوں

اس شعر میں شاعر اپنے داخلی روحانی اور جذباتی انقلاب کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب سے میں حسن انسانی یعنی ”بتوں“ سے مانوس ہوا ہوں، میری توجہ خدا اور خدائی تعلق سے ہٹ گئی ہے۔ یہاں ”بت“ سے مراد پتھر کے بت نہیں بلکہ محبوبانِ حسن ہیں۔ شاعر دراصل یہ بتا رہا ہے کہ عشقِ مجازی نے اس کے دل و دماغ پر اس قدر قبضہ کر لیا ہے کہ عشقِ حقیقی کی طرف التفات کم ہو گیا ہے۔ اس میں ایک طرف عاشقانہ سرمستی ہے تو دوسری طرف ہلکی سی روحانی خلش بھی محسوس ہوتی ہے، جیسے شاعر خود اپنی تبدیلی پر حیران بھی ہے اور معترف بھی۔ اس شعر کو صوفیانہ تناظر میں دیکھیں تو یہ مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کے ابتدائی مرحلے کی بھی علامت بن سکتا ہے۔ فنی اعتبار سے ”بت“ محبوب کا استعارہ ہے جبکہ خدائی عشقِ حقیقی کی علامت ہے۔ بت اور خدائی کا باہمی تقابل واضح صنعتِ تضاد پیدا کرتا ہے۔ بیان میں سادگی ہے مگر مفہوم تہہ دار یہ سہلِ ممتنع کی خوبی ہے۔

کیوں کر کہوں عارفِ خدا ہوں
آگاہ نہیں کہ آپ کیا ہوں

شاعر یہاں معرفت کے دعوے کی نفی کرتا ہے اور عجز و انکسار کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں تو ابھی اپنی ذات کی حقیقت سے واقف نہیں، مجھے یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں کہ میں کیا ہوں، تو پھر خدا کی معرفت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں؟ اس شعر میں صوفیانہ فلسفہ جھلکتا ہے کہ خود شناسی کے بغیر خدا شناسی ممکن نہیں۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ سچی معرفت دعوے سے نہیں بلکہ حیرت اور عجز سے شروع ہوتی ہے۔

جب ہجر میں باغ کو گیا ہوں
میں آتش گل میں جل بجھا ہوں

شاعر کہتا ہے کہ جب میں جدائی کی حالت میں باغ کی سیر کو گیا تو وہاں کے پھول اور حسن کے مناظر میرے لیے تسکین کے بجائے جلنے کا سبب بن گئے۔ گویا باغ کی لطافت نے ہجر کے درد کو اور بھڑکا دیا۔ عام طور پر باغ خوشی، تازگی اور راحت کی علامت ہوتا ہے، مگر عاشق کے لیے وہی منظر عذاب بن گیا کیونکہ ہر پھول محبوب کی یاد دلاتا ہے۔ اس طرح خارجی حسن داخلی کرب کو تیز کر دیتا ہے۔ ”جل بجھنا“ اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ ”آتش گل“ نہایت خوبصورت استعارہ ہے جس میں پھول کو آگ کہا گیا ہے۔ باغ اور جلنے کا باہمی ربط تضادی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شعر میں قوی کیفیت نگاری اور پیکر تراشی ہے۔ قاری منظر اور احساس دونوں محسوس کرتا ہے۔

فرقت میں جو سر پٹک رہا ہوں
مشغول نماز کبریا ہوں

شاعر جدائی کی بے قراری کو ایک روحانی معنی عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہجر میں جو میں سر پٹک رہا ہوں، تڑپ رہا ہوں اور رو رہا ہوں یہی میری عبادت بن گئی ہے۔ گویا میرا اضطراب ہی میری نماز ہے۔ اس شعر میں عشق کو عبادت کے مرتبے تک بلند کیا گیا ہے۔ عاشق کی بے چینی کو محض نفسیاتی کیفیت نہیں بلکہ روحانی عمل قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح عشق اور بندگی کے درمیان حد مٹ جاتی ہے۔

منہ زرد ہے تنکے چن رہا ہوں
اے وحشت کیا میں کہہ رہا ہوں

شاعر اپنی دیوانگی اور اضطراب کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ زرد چہرہ کمزوری، غم اور مسلسل رونے کی علامت ہے۔ تنکے چننا مجنونانہ حرکت کی طرف اشارہ ہے یعنی عقل کا توازن باقی نہیں رہا۔ پھر وہ حیرت سے کہتا ہے: کیا میں کہہ رہا ہوں جو تنکے خود بخود میری طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں؟ اس میں خود پر طنز بھی ہے اور حیرت بھی۔ شاعر اپنی کیفیت کو باہر سے دیکھ کر سوال اٹھا رہا ہے۔

بیگانہ ہوں کیوں کر آشنا سے
بیگانوں سے میں بھی آشنا ہوں

شاعر تعلقات کے الٹ جانے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اپنے لوگوں سے بیگانہ ہو گیا ہوں اور اجنبی لوگوں سے مانوس ہو گیا ہوں۔ عشق انسان کی سماجی ترتیب بدل دیتا ہے پرانے رشتے کمزور اور نئے غیر متعلق لوگ قریب محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اس میں تنہائی اور بے سمتی دونوں جھلکتے ہیں۔

13.2.2 غزل (دل میں میں پوشیدہ تپ عشق بتاں رکھتے ہیں)

دل میں پوشیدہ تپ عشق بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کی مانند نہاں رکھتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے دل کے اندر محبوب کے عشق کی تپش چھپی ہوئی ہے۔ بظاہر ہم خاموش، سنجیدہ اور معمول کے انسان دکھائی دیتے ہیں، مگر باطن میں عشق کی آگ دہک رہی ہے۔ وہ اپنی کیفیت کو پتھر سے تشبیہ دیتا ہے جس میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے اور ضرب لگنے پر چنگاری نکلتی ہے۔ اسی طرح عاشق کے دل میں بھی عشق کی حرارت اندر ہی اندر موجود رہتی ہے، جو ہر کسی پر ظاہر نہیں ہوتی۔ اس شعر میں باطن اور ظاہر کے فرق کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے باہر سکون، اندر آگ۔

تازگی ہے سخنِ کہنہ میں یہ بعدِ وفات
لوگ اکثر مرے جینے کا گماں رکھتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ میری وفات کے بعد بھی میرے پرانے کلام میں ایسی تازگی اور تاثیر موجود ہے کہ لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ یعنی میری شاعری میں زندگی کی حرارت اور تازہ احساس اس قدر باقی ہے کہ وہ وقت کی قید سے آزاد محسوس ہوتی ہے۔ یہاں شاعر فن کی بقا اور تخلیق کی حیاتِ دوام کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جسم مرجاتا ہے مگر اچھا کلام زندہ رہتا ہے۔

بھا گئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ
نہ کمر رکھتے ہیں کافر نہ دہاں رکھتے ہیں

شاعر شوخیہ انداز میں کہتا ہے کہ آخر محبوب کی کون سی ادایا بات دل کو بھا گئی، ورنہ حقیقت میں نہ ان کی کمر ہے نہ منہ یعنی ان کا حسن اتنا نازک اور لطیف ہے کہ گویا جسمانی ساخت ہی نہیں۔ یہ عاشقانہ مبالغہ ہے جس میں حسن کو ماورائی بنا دیا جاتا ہے۔ اس میں تعریف بھی ہے اور لطیف شوخی بھی۔ یہاں محبوب کے حسن کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا واضح مبالغہ ہے۔

مثل پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے پاس دولت اور مال و زر کچھ نہیں، ہم پروانے کی طرح خالی ہاتھ ہیں، مگر ایک چیز ہے ”جان“ جسے ہم محبوب پر قربان کرنے کے لیے تیار رکھتے ہیں۔ یہاں عاشق اپنی مفلسی کو بھی فخر میں بدل دیتا ہے اور جان کی نذر کو سب سے بڑی دولت قرار دیتا ہے۔

محفلِ یار میں کچھ بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی محفل میں ہم کچھ بول نہ سکے، حالانکہ ہمارے پاس بولنے کو زبان موجود ہے۔ پھر اپنی زبان کو شمع سے تشبیہ دیتا ہے یعنی زبان موجود ہے مگر پگھلتی رہتی ہے، جلتی رہتی ہے، روشنی دیتی ہے مگر بول نہیں پاتی۔ اس میں عشق کی جھجک، ہیبت اور احترام کا عنصر ہے۔

عوض ملکِ جہاں ملکِ سخن ہے ناسخ
گو نہیں حکمِ رواں طبعِ رواں رکھتے ہیں

آخری شعر میں ناسخ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہمیں دنیا کی بادشاہی حاصل نہیں، مگر ہمیں سخن کی سلطنت حاصل ہے۔ ہم سیاسی حکمران نہیں مگر ہماری طبیعت اور تخلیقی قوت رواں اور مؤثر ہے۔ یعنی شاعر اپنی شاعری کو حقیقی اقتدار قرار دیتا ہے۔

13.2.3 سر گرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

یل میں دی گئی خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجیے:

1. شیخ امام بخش ناسخ کو دبستانِ _____ کا بانی شاعر کہا جاتا ہے۔
2. ناسخ کی شاعری میں زبان کی صفائی اور _____ کی درستی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔
3. ناسخ نے اپنی شاعری میں لفظی آرائش، نازک خیالی اور _____ پر زور دیا۔
4. ”دل میں پوشیدہ تپ عشقِ بتاں رکھتے ہیں“ میں شاعر نے دل کی کیفیت کو _____ سے تشبیہ دی ہے۔

13.3 عمومی جائزہ

شیخ امام بخش ناسخ اردو ادب کے اہم اور باوقار شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے دبستانِ لکھنؤ کو ایک مضبوط ادبی روایت کی صورت دی اور اردو غزل کو زبان کی صفائی، محاورے کی صحت اور لفظی حسن عطا کیا۔ ان کی شاعری میں نازک خیالی، بلند آہنگی، فنی صنایع اور خیال بندی نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔

ناسخ نے نہ صرف غزل گوئی میں اپنی انفرادیت قائم کی بلکہ زبان و بیان کی اصلاح میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے کلام میں عشق، ہجر، حسن، جذبات اور انسانی کیفیات کی دلکش ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک رخ سادگی اور اثر انگیزی کا حامل ہے جبکہ دوسرا رخ لفظی آرائش اور فنی اظہار سے عبارت ہے۔ اردو شاعری میں ان کا مقام ایک ایسے شاعر کا ہے جس نے لکھنوی تہذیب اور اسلوب کو ادبی شناخت بخشی۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ نے یہ جاننا کہ شیخ امام بخش ناسخ اردو ادب کے ایک اہم اور باوقار شاعر ہیں جنہیں دبستان لکھنؤ کا نمایاں نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے یہ بھی سیکھا کہ ناسخ نے اردو غزل میں زبان کی صفائی، محاورے کی صحت اور فنی نزاکت کو فروغ دیا۔ ان کی شاعری میں نازک خیالی، بلند آہنگی اور لفظی صنعت گری کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ اس سبق کے ذریعے آپ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوئے کہ ناسخ اور آتش کی ادبی رقابت نے لکھنؤ اسکول کی شعری روایت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مزید یہ کہ آپ نے ناسخ کی غزلوں میں عشق، ہجر، جذبات اور داخلی کیفیات کی خوبصورت عکاسی کا مطالعہ کیا اور ان کے کلام میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور صنعت تضاد جیسے فنی محاسن کو سمجھا۔

13.5 فرہنگ

لفظ	معنی
ہجراں	جدائی
آفتاب	سورج
چاک	پھٹا ہوا
طاؤس	مور
بیاباں	صحراء، ویرانہ
فرقت	جدائی
کبریا	عظمتِ الہی
طبع رواں	رواں اور مؤثر طبیعت
خیال بندی	نئے اور نازک مضامین پیدا کرنے کا انداز

13.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. شیخ امام بخش ناسخ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

2. دبستانِ لکھنؤ کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

3. ناسخِ شاعری میں زبان کی اصلاح کے پہلوؤں کا جائزہ لیجیے۔

4. ناسخِ شاعری میں لفظی صنعتِ گری کی مثالیں پیش کیجیے۔

13.7 مشقی سوالات

1. شیخ امام بخش ناسخ کی حیات اور ادبی خدمات پر مفصل مضمون لکھیے۔
2. ناسخ گود بستان لکھنؤ کا بانی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
3. ناسخ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔
4. ناسخ اور آتش کی ادبی رقابت کا اردو شاعری پر کیا اثر پڑا؟

13.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

- 1- شیخ امام بخش ناسخ کی حیات اور ادبی خدمات پر مفصل مضمون

شیخ امام بخش ناسخ اردو ادب کے ممتاز شاعر اور دبستان لکھنؤ کے اہم ستون شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ 10 اپریل 1772ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی وہیں گزری۔ بچپن ہی سے انہیں ورزش اور جسمانی مشقوں کا شوق تھا۔ ان کی شخصیت مضبوط، خوددار اور آزاد مزاج تھی۔ بعد میں وہ لکھنؤ منتقل ہوئے جہاں انہیں علمی اور ادبی ماحول میسر آیا۔ ایک رئیس میر کاظم علی نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا جس سے ناسخ گومالی آسودگی حاصل ہوئی اور وہ پوری توجہ کے ساتھ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔

ناسخ کسی باقاعدہ استاد کے شاگرد نہیں تھے بلکہ اپنی فطری صلاحیت، مطالعے اور ذوق شعری کی بنیاد پر بلند مقام تک پہنچے۔ اودھ کے حکمران غازی الدین حیدر نے انہیں دربار سے وابستہ کرنا چاہا مگر انہوں نے ملازمت قبول نہ کی۔ ان کی طبیعت میں خودداری اور آزادی بہت نمایاں تھی۔

ادبی اعتبار سے ناسخ گود بستان لکھنؤ کا بانی شاعر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اردو غزل میں زبان کی صفائی، محاورے کی درستی، نازک خیالی اور لفظی حسن کو فروغ دیا۔ ان کی شاعری میں فصاحت، بلاغت اور بلند آہنگی نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے لکھنوی تہذیب اور ثقافت کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے شاگردوں نے بھی ان کے اسلوب کو آگے بڑھایا جس سے دبستان لکھنؤ ایک مضبوط ادبی روایت بن گیا۔

ناسخ کے کلام میں غزل کے علاوہ رباعیات، قطعات اور دیگر اصناف سخن بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور صنعت تضاد جیسے فنی محاسن پائے جاتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

- 2- ناسخ گود بستان لکھنؤ کا بانی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

شیخ امام بخش ناسخ گود بستان لکھنؤ کا بانی شاعر اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نیا اسلوب متعارف کرایا جو دہلی کے روایتی انداز سے مختلف تھا۔ اس زمانے میں لکھنؤ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اپنی الگ شناخت قائم کر رہا تھا۔ ناسخ نے اپنی شاعری میں لکھنوی تہذیب، شائستگی، نازک خیالی اور لفظی آرائش کو نمایاں کیا۔

انہوں نے اردو زبان کی اصلاح، محاورے کی درستی اور بیان کی نزاکت پر خاص توجہ دی۔ ان کی شاعری میں بلند آہنگ الفاظ، خیال بندی اور فنی صنعت گری نمایاں تھی۔ ان کے شاگردوں نے ان کے اسلوب کو مزید فروغ دیا اور یوں ایک مستقل ادبی دبستان وجود میں آیا جسے دبستان لکھنؤ کہا جاتا ہے۔

ناسخ کے مقابلے میں آتش دہلی کے روایتی انداز کے نمائندہ تھے، مگر ناسخ کے نئے طرز بیان نے اہل لکھنؤ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اسی وجہ سے انہیں دبستان لکھنؤ کا سب سے اہم معمار اور بانی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

3۔ ناسخ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

ناسخ کی غزل گوئی اردو شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ان کی غزلوں کی سب سے اہم خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورے کی درستی ہے۔ انہوں نے الفاظ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیا اور اپنے کلام کو فصاحت و بلاغت سے مزین کیا۔

ان کی شاعری میں نازک خیالی اور خیال بندی نمایاں ہے۔ وہ معمولی بات کو بھی نئے اور دلکش انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے ہاں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور صنعت تضاد کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔

ناسخ کی غزلوں میں بلند آہنگی اور لفظی شان بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار میں عشق، ہجر، جذبات اور داخلی کیفیات کی عمدہ ترجمانی ملتی ہے۔ بعض اوقات وہ محض لفظی صنعت گری کے ذریعے قاری کو حیران کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں لکھنوی تہذیب، شائستگی اور نزاکت کی جھلک بھی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

4۔ ناسخ اور آتش کی ادبی رقابت کا اردو شاعری پر کیا اثر پڑا؟

ناسخ اور آتش کی ادبی رقابت اردو شاعری کی تاریخ میں بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ آتش دہلی کے روایتی اسلوب کے نمائندہ تھے جبکہ ناسخ نے لکھنوی طرز شاعری کو فروغ دیا۔ دونوں شعرا کے حلقوں میں فکری اور فنی اختلافات موجود تھے جس کی وجہ سے ادبی مقابلے کی فضا پیدا ہوئی۔ اس رقابت کا مثبت اثر یہ ہوا کہ اردو شاعری کے فنی معیار میں اضافہ ہوا۔ دونوں شعرا نے اپنے اپنے اسلوب کو بہتر بنانے کی کوشش کی جس سے زبان، بیان اور شعری اظہار میں نئی خوبیاں پیدا ہوئیں۔ ناسخ نے زبان کی اصلاح، لفظی نزاکت اور خیال بندی کو فروغ دیا جبکہ آتش نے سادگی، جذباتیت اور فطری انداز بیان کو اہمیت دی۔

اس ادبی مسابقت کے نتیجے میں دبستان لکھنؤ کو استحکام ملا اور اردو غزل کو نئے فنی امکانات حاصل ہوئے۔ یوں ناسخ اور آتش کی رقابت اردو ادب کی ترقی اور تنوع کا ایک اہم سبب بنی۔

13.8 جوابات سرگرمی

1. لکھنؤ

2. محاورے

3. خیال بندی

4. سنگ

13.9 امدادی کتب

- | | |
|----------------------------|---------------------------|
| 1. آبِ حیات | محمد حسین آزاد |
| 2. اردو ادب کی مختصر تاریخ | سید اعجاز حسین |
| 3. تاریخ ادبِ اردو | جمیل جالبی |
| 4. کلیاتِ ناسخ | مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور |
| 5. ناسخ | سید شبیہ الحسن |
| 6. انتخابِ غزلیاتِ ناسخ | کاظم علی خاں |

سبق نمبر ۱۴۔ خواجہ حیدر علی آتش

ساخت

14.0 اغراض و مقاصد

14.1 تعارف

14.2 آتش کی حیات اور غزل گوئی

14.2.0 سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟

14.2.1 تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں۔

14.2.2 یہ آرزو تھی تجھے گل کے رُوبہ رُو کرتے

14.2.3 حباب آسمان میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا

14.2.4 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

14.3 عمومی جائزہ

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

14.5 فرہنگ

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

14.7 مشقی سوالات

14.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

14.8 جوابات سر گرمی

14.9 امدادی کتب

14.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو خواجہ حیدر علی آتش کی شخصیت، حیات اور شاعری سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ یہ جان سکیں گے کہ آتش آرد و غزل کے ایک اہم اور منفرد شاعر تھے جنہوں نے اپنی شاعری میں سادگی، سوز، داخلی کیفیت اور جذبے کی صداقت کو نمایاں مقام دیا۔

اس سبق کے ذریعے آپ آتش کے خاندانی پس منظر، ان کی زندگی کے مختلف حالات، لکھنؤ کے ادبی ماحول اور ان کے شعری سفر سے آگاہ ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ آتش نے دبستان لکھنؤ سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنی شاعری میں دبستانِ دہلی کی داخلی کیفیت، جذباتی سچائی اور فطری اندازِ بیان کو کس طرح برقرار رکھا۔

مزید یہ کہ آپ آتش کے اسلوبِ بیان، زبان کی سادگی، محاورے کی صفائی، جذبے کی شدت اور فنی محاسن جیسے تشبیہ، استعارہ، صنعتِ تضاد اور حسنِ بیان سے واقف ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ آتش کی شاعری میں عشق، خودداری، قلندرانہ مزاج، رجائیت اور انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی کس انداز میں ملتی ہے۔

14.1 تعارف

یہ سبق اردو کے ممتاز شاعر خواجہ حیدر علی آتش کی زندگی اور شاعری سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے حالاتِ زندگی، ادبی خدمات، شعری خصوصیات اور فنی انفرادیت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش آرد و غزل کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے منفرد اندازِ بیان، سادگیِ زبان اور اثر انگیز طرزِ اظہار کے ذریعے اردو شاعری کو نئی جہت عطا کی۔ اگرچہ انہیں دبستان لکھنؤ کا شاعر کہا جاتا ہے، لیکن ان کی شاعری میں دبستانِ دہلی کی داخلی کیفیت، سوز و گداز اور جذباتی صداقت نمایاں طور پر موجود ہے۔

آتش کی شاعری میں عشق، انسانی جذبات، خودداری، رندی اور زندگی کی حرارت کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ ان کے کلام میں تصنع اور مبالغہ آرائی کے بجائے فطری انداز، محاورے کی صفائی اور جذبے کی سچائی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلیں اپنے سادہ مگر پُر اثر انداز کی وجہ سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

اس سبق کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ آتش صرف ایک غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ایسی ادبی شخصیت بھی تھے جنہوں نے اپنی آزادانہ طبیعت، قلندرانہ مزاج اور بلند فکری کے ذریعے اردو شاعری کو نئی وسعت عطا کی۔ ان کا کلام آج بھی اردو ادب کے شائقین کے لیے کشش اور اہمیت رکھتا ہے۔

14.2 آتش کی حیات اور غزل گوئی

خواجہ حیدر علی آتش اردو غزل کے ممتاز اور بلند پایہ شعر میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق بغداد سے تھا، جو روزگار کی تلاش میں پہلے دہلی آئے اور بعد میں نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد منتقل ہو گئے۔ آتش کی پیدائش 1778ء میں فیض آباد میں ہوئی۔ ابھی وہ کم سن ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے ان کی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ سرپرستی کے فقدان نے ان کی طبیعت میں آزاد روی، بانگین اور شوخ مزاجی پیدا کر دی۔

جوانی کے زمانے میں آتش نے نواب محمد تقی خاں کی ملازمت اختیار کی اور ان کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ نواب صاحب کو شاعری اور سپاہ گری دونوں سے دلچسپی تھی، جس کا اثر آتش کی شخصیت پر بھی پڑا۔ لکھنؤ کے ادبی ماحول، خصوصاً انشاء اور مصحفی کی ادبی معرکہ آرائیوں نے ان کے اندر شعر و ادب کا ذوق بیدار کیا۔ چنانچہ انہوں نے مصحفی سے اصلاح لینا شروع کی اور تقریباً نیتس برس کی عمر میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ نواب محمد تقی خاں کے انتقال کے بعد آتش نے کسی دربار یا رئیس کی ملازمت قبول نہیں کی۔ انہوں نے سادہ، خوددار اور آزادانہ زندگی بسر کی۔ اگرچہ مالی حالات ہمیشہ آسودہ نہ رہے، لیکن انہوں نے کبھی اپنی عزت نفس پر سمجھوتا نہیں کیا۔ نہ کسی بادشاہ کی خوشامد میں قصیدہ لکھا اور نہ کسی کی ہجو گوئی کو ذریعہ شہرت بنایا۔ ان کی زندگی میں درویشی، قلندرانہ شان اور سپاہیانہ بانگین نمایاں تھیں۔ بڑھاپے تک کمر میں تلوار باندھے رکھتے اور آزادانہ وضع کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔

آتش کو عام طور پر دبستان لکھنؤ کا شاعر کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں ان کی شاعری میں دہلی کے دبستان کی داخلی کیفیت اور جذباتی سچائی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ عشق و محبت کے شاعر تھے، مگر ان کے ہاں وہ تصنع اور ابندال نہیں ملتا جو بعض دوسرے لکھنوی شعرا کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، سوز، اثر آفرینی اور فطری پن نمایاں ہے۔

ان کے اشعار میں جذبے کی صداقت اور دل کی تپش موجود ہے۔ مثال کے طور پر:

شبِ	وصل	تھی	چاندنی	کا	سماں	تھا
بغل	میں	صنم	تھا	خدا	مہرباں	تھا

اور

کسی	نے	مول	نہ	پوچھا	دل	شکستہ	کا
کوئی	خرید	کے	ٹوٹا	پیالہ	کیا	کرتا	

ایسے اشعار ان کی داخلی کیفیت، سادگی اور اثر انگیزی کو ظاہر کرتے ہیں۔

آتش کے مزاج میں رندی، خودداری اور زندگی سے محبت نمایاں تھی۔ ان کی شاعری میں رجائیت، حوصلہ اور مردانگی کا احساس ملتا ہے۔ وہ غم اور یاس کے بجائے زندگی کی حرارت اور ولولے کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی لکار، جلال اور قوت اظہار پائی جاتی ہے۔ تصوف سے بھی انہیں گہرا شغف تھا۔ اگرچہ وہ مذہبی اعتبار سے اثنا عشری تھے، لیکن ان کی سوچ آزادانہ تھی۔ انہوں نے رسمی پیری مریدی سے دور رہ کر درویشانہ طرز زندگی اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں روحانیت، اخلاقی فکر اور قلندرانہ انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ آتش کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ ان میں دیا شکر نسیم، نواب مرزا شوق، واجد علی شاہ، میر وزیر علی صبا اور دوسرے کئی اہم شعرا شامل ہیں۔ ان کے شاگردوں نے اردو شاعری میں ان کے اسلوب کو آگے بڑھایا۔

ناسخ اور آتش کے درمیان ادبی رقابت بھی اردو شاعری کی تاریخ کا اہم باب ہے۔ ناسخ کے یہاں لفظی صنعت گری، مشکل مضامین اور نازک خیالی زیادہ تھی، جبکہ آتش سادگی، محاورے کی صفائی اور تاثیر کلام کے قائل تھے۔ اس رقابت نے اردو غزل کے فنی معیار کو بلند کیا اور دبستان لکھنؤ کو مزید استحکام بخشا۔

آتش کی شاعری میں زبان کی روانی، محاورے کی پاکیزگی اور جذبے کی سچائی ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے انہیں اردو غزل کے بڑے شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔

14.2.0 غزل (سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

اس شعر میں شاعر نے محبوب کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو "فسانہ" کے استعارے کے ذریعے بلند مقام پر رکھا ہے، جو قاری کو محبوب کی کشش اور جلال کا احساس دلاتا ہے۔ "غائبانہ" کا لفظ نہ صرف محبوب کی پردہ داری کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس کے اثر کی پوشیدگی اور اسرار کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے۔ یہاں ایجاز اور ایہام دونوں موجود ہیں، کیونکہ دو مصرعوں میں شاعر نے محبوب کی اہمیت، دنیا کی توجہ اور راز کی حالت کو مختصر مگر مؤثر انداز میں بیان کر دیا ہے۔

کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے
بخینہ طلب ہے سینہ صد چاک شانہ کیا

اس شعر میں شاعر نے عشق کی پیچیدگی کو زلفوں کے تار کے استعارے سے ظاہر کیا ہے، جہاں زلفیں نہ صرف محبوب کی کشش ہیں بلکہ عاشق کے دل کی الجھن کی علامت بھی ہیں۔ "سینہ صد چاک شانہ" میں شاعر نے مبالغہ کے ذریعے اپنے درد اور شدت جذبات کی انتہا دکھائی ہے۔ اس شعر

میں تضاد بھی نمایاں ہے، کیونکہ زلفوں کی پیچیدگی اور سینہ صد چاک شانہ کی شدت ایک دوسرے کے برعکس ہیں، جس سے عشق کی کشمکش اور محبت کی سختی قاری کے ذہن میں واضح ہو جاتی ہے۔

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

یہ شعر عشق اور محبت کی پوشیدہ قیمت کو ظاہر کرتا ہے۔ "گل سو زر بکف" کے ذریعے شاعر نے عشق یا حسن کی پوشیدہ قدر کا استعارہ پیش کیا ہے، جبکہ "خزانہ" لفظ معنوی اور دنیاوی قیمت دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ زیر زمین خزانہ اور راستے میں لٹایا جانا ایک تضاد پیدا کرتا ہے، جو عشق کی راہوں میں رکاوٹ اور مشکلات کی عکاسی کرتا ہے۔

اڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپ عمر
مہمیز کہتے ہیں گے کسے تازیانہ کیا

اس شعر میں شاعر نے زندگی کے سفر اور عشق کی کشمکش کو تصویر کیا ہے۔ "اسپ عمر" استعارہ ہے انسانی زندگی یا عشق کے سفر کے لیے، اور "مہمیز" محبت یا تجربے کی تحریک کی علامت ہے۔ شعر میں تضاد بھی موجود ہے، راحت منزل کے حصول کی خواہش اور تازیانہ یعنی مشکلات و رکاوٹیں۔

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشتِ خاک
بامِ بلندِ یار کا ہے آستانہ کیا

اس شعر میں شاعر نے اپنی ہستی کو "مشتِ خاک" کہہ کر نہایت عاجزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہاں خاک صرف مٹی نہیں بلکہ عاشق کی کم مائیگی، فنا اور بے بسی کی علامت بن گئی ہے، اس طرح یہ محض لفظ نہیں رہتا بلکہ پورا تصور بن جاتا ہے۔ اسی شعر میں "بامِ بلندِ یار" محبوب کے مکان کے بجائے اس کے مرتبے اور رفعت کی طرف اشارہ کرتا ہے، یوں یہاں معنوی بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں سوالیہ انداز دراصل سوال نہیں بلکہ عاشق کی ناامیدی اور اپنی حیثیت کے اعتراف کا اظہار ہے، جس سے شعر میں درد اور انکسار بڑھ جاتا ہے۔

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

اس شعر میں محبوب کے حسن کو ہر طرف پھیلا ہوا دکھایا گیا ہے، یعنی محبوب کسی ایک جگہ محدود نہیں۔ دل کو آئینے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ بات ابھرتی ہے کہ اصل مسئلہ دیکھنے کی جگہ نہیں بلکہ دیکھنے والے کی حالت ہے۔ یہاں شاعر نے یہ نکتہ نہایت لطیف انداز میں پیدا کیا ہے کہ اگر دل شفاف ہو تو محبوب کا جلوہ خود بخود نظر آ جاتا ہے۔

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

اس شعر میں پورا منظر علامتی ہے۔ بلبل کو پھول کی رگوں کے جال میں پھنسا ہوا دکھایا گیا ہے، یعنی عاشق اپنی ہی پسند کی چیز کے ذریعے قید ہو جاتا ہے۔ صیاد کا دام و دانہ چھپا کر دکھانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فریب ہمیشہ حسین شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہاں باغ، گل، بلبل اور صیاد مل کر عشق اور دنیا کے فریب کی مکمل تصویری تمثیل بناتے ہیں، جس سے شعر محض ذاتی تجربہ نہیں بلکہ آفاقی معنی اختیار کر لیتا ہے۔

طلبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

اس شعر میں شاعر نے اپنی محرومی کو کمزوری نہیں بلکہ طاقت بنا کر پیش کیا ہے۔ "طلبل و علم" سے مراد نام، غیرت اور شناخت ہے، جسے شاعر دولت اور اقتدار پر ترجیح دیتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں سوالیہ انداز کے ذریعے شاعر زمانے کو لکارتا ہے، یعنی زمانہ اگر مخالفت کرے بھی تو اس کے پاس کھونے کو کچھ نہیں۔

آتی ہے کس طرح سے مرے قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

شاعر اس شعر میں موت کے تصور کو ایک غیر معمولی اور تخلیقی زاویے سے پیش کرتا ہے۔ عام طور پر انسان موت سے خوف زدہ دکھایا جاتا ہے، مگر یہاں منظر الٹ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری روح قبض کرنے کے لیے موت خود جیسے کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے۔ گویا موت بھی متردد ہے اور فیصلہ نہیں کر پارہی کہ مجھے کس طرح اپنے قبضے میں لے۔ اس انداز سے شاعر نے اپنی بے نیازی، تھکنِ حیات یا جراتِ احساس کو ظاہر کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر یہ بتانا چاہتا ہو کہ اس نے زندگی کے دکھ اس قدر جھیل لیے ہیں کہ موت بھی اس پر آسانی سے غالب نہیں آ سکتی۔ فنی طور پر یہاں موت کو بااختیار مگر متفکر ہستی بنا کر پیش کیا گیا ہے، جو واضح تشخیص (Personification) ہے۔ سوالیہ انداز استفہام فکری پیدا کرتا ہے جو طنز اور فلسفیانہ گہرائی دونوں رکھتا ہے۔

ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی
رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا

اس شعر میں شاعر اپنے مخالف یا مدعی پر طنز کرتا ہے اور خود اعتمادی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا حریف اتنا کمزور ہے کہ میرا ذکر سن کر ہی زرد پڑ جاتا ہے، یعنی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے حال یا کارنامے کو رستم جو بہادری کی علامت ہے کی داستاں کے برابر قرار دیتا ہے۔ گویا میرا قصہ معمولی نہیں بلکہ بہادری اور عظمت کا قصہ ہے۔ اس طرح شاعر نے خود کو قوت، جرات اور شوکت کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ رستم کا حوالہ واضح تلمیح ہے جو شعر کو تہذیبی اور اساطیری طاقت دیتا ہے۔ نامرد / رستم کا تقابل تضاد پیدا کرتا ہے۔ اپنے فسانے کو داستاں رستم کہنا مبالغہ اور فخریہ اسلوب کی مثال ہے۔

ترجھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے تو اڑے گا نشانہ کیا

شاعر محبوب کی نگاہ کو تیر اور دل کو پرندہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب کی ترجھی نگاہ ہی دل کو زخمی کرنے کے لیے کافی تھی دل پہلے ہی شکار ہو چکا۔ اب اگر تیر بھی ٹیڑھا چلے تو نشانہ کیسے بچے گا؟ یعنی بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں۔ اس میں عاشق کی بے بسی اور عشق کی حتمی گرفت ظاہر ہوتی ہے۔ محبوب کی ایک ادا کو قاتلانہ قوت دے دی گئی ہے۔ دل کو طائر اور نگاہ کو تیر کہنا خوبصورت استعارہ ہے۔

صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیرِ باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

اس شعر میں عاشق و محبوب کے تعلق کو صیاد اور بلبل کی تمثیل میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب (صیاد) تو باغ کی سیر کر رہا ہے، حسن دکھا رہا ہے، مگر عاشق (بلبل) قفس میں قید ہے اور اپنے آشیانے کو یاد کر رہا ہے۔ یہ منظر شدید تضاد پیدا کرتا ہے ایک طرف آزادی اور جلوہ، دوسری طرف قید اور محرومی۔ اس سے عشق کے رشتے میں عدم مساوات اور ناانصافی نمایاں ہوتی ہے۔

بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں
مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا

شاعر دل کی بے چینی کی وجہ بیان کرتا ہے کہ ہمارا غم زدہ دل اس لیے بیتاب ہے کہ اسے معلوم ہے جسم محض ایک سرائے (مسافر خانہ) ہے اور روح اس کی مہمان۔ ایک دن اسے یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ اس طرح زندگی کی عارضی حیثیت اور موت کی یقینی آمد کو نہایت سادہ مگر گہرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ دل کی بے قراری کو وجودی شعور سے جوڑ دیا گیا ہے۔

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشِ غزل یہ تو نے کبھی عاشقانہ کیا

مقطع میں شاعر اپنے حسد کرنے والے ناقد (مدعی) کی بے اعتنائی کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ تعریف نہیں کرتا تو نہ کرے۔ اس سے غزل کی قدر کم نہیں ہوتی۔ پھر اپنے تخلص کے ساتھ وہ اپنی غزل کے عاشقانہ رنگ پر اعتماد ظاہر کرتا ہے۔ یہ خود آگہی اور فنی اطمینان کا اظہار ہے۔

14.2.1 غزل (تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں)

تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

اس شعر میں شاعر نے محبوب کی غیر موجودگی کو تخیل کے ذریعے موجودگی میں بدل دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ برسوں سے محبوب سے گفتگو کر رہا ہے، مگر یہ گفتگو حقیقت میں نہیں بلکہ تصور میں ہے۔ یہاں محبوب کی "تصویرِ خیالی" کو روبرو بٹھا کر باتیں کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عشق میں تخیل حقیقت سے زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ یہاں محبوب کا کوئی جسمانی وجود نہیں، مگر پھر بھی شاعر کے سامنے وہ زندہ اور متحرک ہے۔ اس طرح شاعر نے ذہنی کیفیت کو خارجی منظر کی صورت دے دی ہے، جس سے شعر میں نفسیاتی گہرائی اور تنہائی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔

ہوا مہمان آ کر رات بھر وہ شمع رو برسوں
رہا روشن مرے گھر کا چراغِ آرزو برسوں

اس شعر میں شاعر نے محبوب کی آمد کو مہمان کے طور پر پیش کیا ہے، مگر یہ مہمانوازی بھی حقیقی نہیں بلکہ وقتی اور خواب ناک ہے۔ محبوب کو "شمع رو" کہنا اس کے حسن اور روشنی کا اظہار ہے اور شمع کا تصور خود بخود روشنی، حرارت اور جلنے کے معنی پیدا کرتا ہے۔ محبوب کی ایک رات کی موجودگی شاعر کے دل میں امید کی ایسی آگ جلا دیتی ہے کہ چراغِ آرزو برسوں روشن رہتا ہے۔ یہاں ایک لمحاتی واقعہ کو طویل عرصے کی روحانی

روشنی میں بدل دیا گیا ہے۔ اس شعر میں وقتی وصل اور دائمی امید کے درمیان ایک حسین ربط قائم ہو جاتا ہے، جو عشق کی فطرت کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کرتا ہے۔

برابر جان کے رکھا ہے اس کو مرتے مرتے تک
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

اس شعر میں شاعر نے اپنی آرزو کو جیتا جاگتا کردار بنادیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس نے اس آرزو کو جان کے برابر رکھا، یعنی زندگی بھر اسے اپنے وجود کا حصہ بنائے رکھا۔ دوسرے مصرعے میں آرزو کو قبر پر روتے ہوئے دکھایا گیا ہے، گویا شاعر کے مرنے کے بعد بھی اس کی خواہشات زندہ رہیں گی۔ یہاں ایک نہایت دردناک کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ انسان ختم ہو جاتا ہے مگر اس کی تمنائیں اس کے ساتھ دفن نہیں ہوتیں۔ اس انداز سے شعر میں وفاداری، ناکام عشق اور انسانی بے بسی کا گہرا نقش ابھرتا ہے، اور آرزو ایک علامتی وجود اختیار کر لیتی ہے۔

چمن میں جا کے بھولے سے میں خستہ دل کراہا تھا
کیا کی گل سے بلبل شکوہ دردِ گلو برسوں

اس شعر میں شاعر نے باغ کا منظر تخلیق کیا ہے، مگر یہ محض قدرتی منظر نہیں بلکہ دل کی کیفیت کا عکس ہے۔ شاعر کا خستہ دل کراہنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کا درد لاشعوری طور پر باہر آ گیا۔ بلبل کا گل سے برسوں کا شکوہ کرنا دراصل شاعر کے اپنے دل کی آواز ہے، جسے اس نے فطرت کے کرداروں میں منتقل کر دیا ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے ذاتی دکھ کو کائناتی دکھ بنادیا ہے، جس سے شعر میں وسعتِ معنی پیدا ہو گئی ہے۔ برسوں کا ذکر اس درد کے تسلسل اور گہرائی کو اور زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔

اگر میں خاک بھی ہوں گا تو آتشِ گرد باد آسا
رکھے گی مجھ کو سرگشتہ کسی کی جستجو برسوں

اس شعر میں شاعر نے اپنی انتہائی فنا کی حالت کو بھی حرکت اور بے قراری سے بھر دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ خاک میں بھی بدل جائے تب بھی وہ گرد گرد باد کی طرح سرگرداں رہے گا۔ یہاں خاک سکون اور اختتام کی علامت ہے، مگر گرد باد حرکت اور اضطراب کی۔ اس تضاد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعر کی طلب اور جستجو

موت کے بعد بھی ختم نہیں ہوگی۔ دوسرے مصرعے میں کسی کی جستجو کو ایسا طاقتور عنصر بنا دیا گیا ہے جو خاک کو بھی بے چین رکھتی ہے۔ اس طرح عشق کو فنا پر غالب دکھا کر شاعر نے شعر میں شدت جذبہ اور ابدیت کا تصور پیدا کیا ہے۔

14.2.2 غزل (یہ آرزو تھی تجھے گل کے رُوبہ رو کرتے)

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رُوبہ رو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

اس شعر میں شاعر اپنی جمالیاتی خواہش اور ذوقِ حسن پرستی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری یہ شدید آرزو تھی کہ محبوب کو پھول کے بالمقابل لا کر کھڑا کرتا تاکہ حسن کے دو مظاہر ایک ساتھ سامنے ہوتے ایک فطری حسن (گل) اور ایک انسانی حسن (محبوب) اور پھر میں اور بے قرار بلبل اس حسن کے بارے میں گفتگو کرتے۔ اس میں محض تعریف نہیں بلکہ ایک تخیلاتی منظر آفرینی ہے جہاں شاعر خود کو حسن کا ناقد اور بلبل کو شریکِ ذوق بنا دیتا ہے۔ بلبل کی بیتابی دراصل عاشق کے دل کی بے قراری کی علامت ہے، اس طرح گفتگو بھی دراصل حسن پر ایک عاشقانہ تبصرہ بن جاتی ہے۔ فنی طور پر گل اور بلبل کلاسیکی غزل کا مضبوط علامتی نظام ہیں۔ محبوب کو گل کے مقابل لانا واضح مبالغہ ہے جو محبوب کے حسن کو فطرت سے برتر دکھاتا ہے۔ شعر میں قوی پیکر تراشی اور جمالیاتی فضا موجود ہے، جبکہ بیتاب بلبل عاشق کے دل کا استعارہ بھی بن جاتی ہے۔

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

شاعر کہتا ہے کہ اچھا ہوا کوئی قاصد یا پیغام پہنچانے والا میسر نہ آیا، کیونکہ عشق اور آرزو کا بیان کسی غیر کی زبان سے کروانا مناسب نہیں۔ محبت کا اصل تقاضا یہ ہے کہ جذبات براہِ راست ادا ہوں، نہ کہ کسی واسطے سے۔ اس شعر میں عاشق کی خودداری، غیرتِ عشق اور رازداری تینوں جھلکتی ہیں۔ وہ اپنے جذبے کو اتنا نجی اور مقدس سمجھتا ہے کہ اسے کسی تیسرے شخص کی زبان پر لانا اس کی توہین کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح شاعر عشق کو ایک ذاتی، براہِ راست اور بے واسطہ تجربہ قرار دیتا ہے۔

مری طرح سے مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

شاعر اپنی کیفیت کو کائناتی سطح پر پھیلا دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح میں محبوب کی تلاش میں آوارہ اور سرگرداں ہوں، اسی طرح سورج اور چاند بھی مسلسل گردش میں ہیں گویا وہ بھی کسی محبوب کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ اس طرح ذاتی عشق کو کائناتی حرکت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ

محض مبالغہ نہیں بلکہ ایک تخیلاتی کائناتی ہم آہنگی ہے جس میں عاشق اپنی کیفیت کو پوری کائنات میں منعکس دیکھتا ہے۔ اس سے عاشق کا درد ذاتی نہ رہ کر آفاقی بن جاتا ہے۔

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

شاعر وقت کی بے ثباتی اور تغیرِ زمانہ کو ایک نہایت سادہ مگر مؤثر مثال سے واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمانے کا رنگ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے جیسے آخر کار سفید بال سیاہ بالوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یعنی جوانی بڑھاپے میں بدل جاتی ہے، تازگی زوال میں، اور قوت کمزوری میں۔ اس طرح انسانی زندگی کی پوری گردش کو بالوں کے رنگ کی تبدیلی میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

لٹاتے دولتِ دنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغرِ مے نفرتی سبوت کرتے

اس شعر میں شاعر رندانہ مزاج، دنیا سے بے نیازی اور سرمستیِ عشق کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہمارے پاس دنیا کی دولت اور خزانہ ہوتا تو ہم اسے مے خانے میں خرچ کر دیتے یعنی دنیاوی مال کو عیش، سرور اور ذوق پر قربان کر دیتے۔ سنہری جام اور چاندی کی صراحی بنوانے کا ذکر دراصل اس بات کی علامت ہے کہ شاعر کے نزدیک اصل قدر لذتِ دل، کیفیتِ سرور اور صحبتِ یار کی ہے، نہ کہ دولت کی ذخیرہ اندوزی۔ اس میں ایک طرح کی فکری بغاوت بھی ہے جو دنیا پرستی کے مقابل ذوق پرستی کو ترجیح دیتی ہے۔

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفوت کرتے

شاعر اپنی مسلسل بے قراری اور اظہارِ غم کی شدت بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ہمیشہ جوشِ عشق اور کربِ دل میں اپنا گریبان چاک کیا، اور درزی (رفوگر) ساری عمر اسے سیٹے ہی رہے۔ یعنی میرا اضطراب وقتی نہیں بلکہ دائمی تھا جتنا غم کم کیا گیا اتنا ہی پھر بڑھ گیا۔

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ محبوب کی زلفوں کی زنجیر کا منظر دیکھ لیتے، وہ آزادی کے باوجود قید ہونے کی تمنا کرتے۔ یعنی اس حسن کی گرفت ایسی دلکش ہے کہ قید بھی نعمت محسوس ہوتی ہے۔ یہاں اسیری کو تکلیف نہیں بلکہ سعادت بنا دیا گیا ہے۔ عشق کی قید کو آزادی سے بہتر قرار دینا عاشقانہ فکر کا خاص پہلو ہے۔

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مقطع میں شاعر اپنی بد قسمتی کا شکوہ کرتا ہے کہ ہم نے بارش کی آرزو کی مگر آگ برسی، یعنی امید کے بدلے عذاب ملا۔ یہ ناکامی تقدیر کا شدید اور ڈرامائی بیان ہے۔

14.2.3 غزل (حب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا)

حب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

شاعر اپنی ہستی اور اپنی محبت دونوں کو نہایت لطیف اور فلسفیانہ استعارے میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں تیری آشنائی پر اس طرح فخر اور زندگی محسوس کرتا ہوں جیسے پانی کا بلبلہ (حب) لمحہ بھرا بھر کر سانس لیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ جیسے ایک قطرہ دریا سے جدا ہو کر بے قرار اور غم زدہ ہوتا ہے، ویسے ہی مجھے جدائی کا شدید دکھ ہے۔ گویا آشنائی زندگی ہے اور جدائی فنا۔ اس شعر میں عاشق اپنی ہستی کو قطرہ اور محبوب کو دریا قرار دیتا ہے یعنی اصل، وسعت اور بقا محبوب کے ساتھ وابستہ ہے۔

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی کا

شاعر کہتا ہے کہ اے دوست! تیرے عشق میں صرف عاشق ہی قید نہیں بلکہ معشوق بھی ایک طرح کی گرفت میں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عاشق کی زنجیر لوہے کی ہے — یعنی سخت، تکلیف دہ — جبکہ معشوق کی زنجیر سونے کی ہے یعنی حسین، دلکش اور قیمتی۔ اس میں عشق کے دو طرفہ اثر کی بات کی گئی ہے کہ تعلق دونوں کو باندھتا ہے، مگر کیفیت الگ الگ ہے۔ یہاں زنجیر عشق کا استعارہ ہے۔ آہنی / طلائی کا تقابل واضح صنعتِ تضاد پیدا کرتا ہے۔ ایک ہی شے (قید) کو دو مختلف کیفیتوں میں دکھانا حسنِ تقسیم ہے۔ شعر میں تعلق کی نفسیات بیان ہوئی ہے۔

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا نا گوارا ہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

شاعر کہتا ہے کہ مجھے جسم سے وابستگی پسند نہیں، میرا جھکاؤ روحانی تعلق کی طرف ہے۔ دنیا کے جسمانی اور وقتی رشتے مجھے ناگوار لگتے ہیں کیونکہ یہاں تعلقات چند دن کے ہوتے ہیں اور پھر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس میں دنیا کی ناپائیداری اور روحانی رشتے کی برتری کا تصور نمایاں ہے۔ شاعر جسمانی وجود کے مقابل روحانی حقیقت کو ترجیح دیتا ہے۔ روح/جسد کا تقابل واضح فلسفیانہ تضاد ہے۔ چار دن کی آشنائی دنیا کی ناپائیداری کی تمثیل ہے۔ شعر میں مضبوط تصوفی فکر اور وجودی شعور موجود ہے۔

فراقِ یار میں مر مر کے آخر زندگانی کے
رہا صدمہ ہمیشہ روح و قالب کی جدائی کا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی میں بار بار مرنے جیسی کیفیت سے گزرتے ہوئے آخر کار زندگی ایک مستقل صدمے میں بدل گئی اور وہ صدمہ روح اور جسم کی جدائی جیسا تھا۔ یعنی ہجر کو موت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس میں عشق کی تکلیف کو وجودی سطح تک اٹھادیا گیا ہے۔

ہوئی منظور محتاجی نہ تجھ کو اپنی سائل کی
بنایا کاسہ سر واژگوں کاسہ گدائی کا

شاعر محبوب سے شکوہ کرتا ہے کہ تو نے اپنے سوالی (عاشق) کی محتاجی قبول نہ کی یعنی اس کی درخواست اور عاجزی کو رد کر دیا۔ پھر کہتا ہے کہ میں نے اپنا سر ہی الٹا کر کے کاسہ گدائی بنا لیا یعنی انتہائی عاجزی اختیار کر لی۔ سر کو کاسہ کہنا انتہائی درجہ کی سپردگی اور انکسار کی تصویر ہے۔

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے جدائی کا

شاعر کہتا ہے کہ مجھے ہر طرف چہرے ہی چہرے اور صورتیں ہی صورتیں نظر آتی ہیں — گویا پوری دنیا آئینوں کا گھر بن گئی ہے۔ مگر یہ حسن و صورت کی کثرت خوشی کا سبب نہیں بلکہ جدائی کا کارخانہ ہے، کیونکہ ہر چہرہ محبوب کی یاد دلاتا ہے اور فراق کے دکھ کو تازہ کرتا ہے۔ اس طرح کثرت صورت بھی وحدتِ یاد میں بدل جاتی ہے۔ ہر عکس اصل کی کمی کا احساس دلاتا ہے۔ شاعر کا ذہن اس حد تک محبوب کے تصور سے بھرا ہوا

ہے کہ خارجی دنیا آئینہ خانہ بن گئی ہے۔

وصالِ یار کا وعدہ ہے فردائے قیامت پر
یقین مجھ کو نہیں ہے گور تک اپنی رسائی کا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب نے وصال کا وعدہ قیامت کے دن کے لیے ٹال دیا ہے یعنی انتہائی دور مستقبل کے لیے۔ مگر مجھے تو یہ یقین بھی نہیں کہ میں قبر تک صحیح سلامت پہنچ سکوں گا۔ اس میں محبوب کے وعدے پر طنز بھی ہے اور اپنی ناتوانی کا اعتراف بھی۔ شاعر محبوب کے وعدے کو غیر عملی اور غیر یقینی قرار دیتا ہے۔
فردائے قیامت تلیمی حوالہ ہے۔ وعدہ وصال کو قیامت تک مؤخر کرنا واضح مبالغہ ہے۔ گور تک رسائی پر شک وجودی بے یقینی کو ظاہر کرتا ہے۔
شعر میں طنزیہ درد موجود ہے۔

بھروسہ آہ پر ہر گز نہیں اے یار عاشق کو
شکار اب تک کہیں دیکھا نہیں تیر ہوئی کا

شاعر کہتا ہے کہ عاشق کو محض آہ و فریاد پر بھروسہ نہیں — کیونکہ کبھی ہوا میں چلنے والا تیر شکار نہیں کرتا۔ یعنی صرف بے اثر فریاد سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اصل اثر کے لیے ٹھوس عمل یا براہ راست اثر چاہیے۔ یہ عشق کی عملی نفسیات کا بیان ہے۔

دکھایا حسن سے اعجازِ موسیٰ کلکِ قدرت نے
یدِ بیضا بنایا چور انگشتِ حنائی کا

اس شعر میں شاعر محبوب کے حسن کو بیان کرنے کے لیے مذہبی معجزے کی سطح کا استعارہ اختیار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدرت کے قلم نے محبوب کے حسن میں ایسا کمال دکھایا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے معجزہ یدِ بیضا کی یاد دلاتا ہے۔ یدِ بیضا وہ معجزہ تھا جس میں ہاتھ روشن اور نورانی ہو جاتا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی مہندی لگی انگلی جو عام طور پر سرخی اور زینت کی علامت ہے۔ قدرت نے اس طرح چکا دی کہ وہ معجزاتی نور کا پیکر بن گئی۔ گویا حسن کو معجزے کے درجے پر پہنچا دیا گیا ہے۔ یہاں محبوب کا جسمانی حسن روحانی نورانیت میں بدل جاتا ہے۔ اس شعر میں اعجازِ موسیٰؑ اور یدِ بیضا واضح تلمیحات ہیں جو شعر کو تہذیبی اور مذہبی گہرائی دیتی ہیں۔ انگلی کو یدِ بیضا کہنا نہایت قوی مبالغہ اور استعارہ ہے۔ ”ملکِ قدرت“ بھی ایک بلیغ

استعارہ ہے جس میں تخلیق حسن کو خدائی تحریر کہا گیا ہے۔ مذہبی معجزے کو جمالیاتی حسن سے جوڑنا کلاسیکی غزل کی جراتِ تخیل اور وسعتِ بیان کی نمایاں مثال ہے۔

نہیں مٹی ہے پتھر کی لکیر احباب کہتے ہیں
رہے گا پائے بت پر نقش اپنی جہہ سائی کا

شاعر یہاں اپنے عشق اور بندگی کی پائیداری کا اعلان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوستوں کا قول ہے کہ پتھر پر کھنچی ہوئی لکیر نہیں مٹی اسی طرح محبوب کے قدموں پر میری پیشانی کے سجدوں کا نشان بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔ یعنی میری محبت وقتی جذبہ نہیں بلکہ دائمی نقش ہے۔ یہاں سجدہ محض ظاہری عمل نہیں بلکہ انتہائی درجہ کی سپردگی اور عشق کا استعارہ ہے۔ شاعر اپنے تعلق کو ناقابلِ مٹاؤ اور ابدی ثابت کر رہا ہے۔

نکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درست اس سے
توجہ میں تری اے یار اثر ہے مومیائی کا

اس شعر میں شاعر محبوب کی توجہ اور التفات کو شفا بخش قوت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوستوں کے ٹوٹے ہوئے دل تیری توجہ سے درست ہو جاتے ہیں یعنی تیری ایک نگاہ مرہم کا کام کرتی ہے۔ ”مومیائی“ ایک قدیم طبی مرہم تھی جسے زخم بھرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ شاعر نے محبوب کی توجہ کو مومیائی کے اثر سے تشبیہ دے کر اسے علاج اور شفا کا درجہ دے دیا۔ اس طرح محبت کو نفسیاتی اور روحانی شفا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

دل اپنا آئینہ سا صاف عشقِ پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

شاعر کہتا ہے کہ سچا اور پاک عشق دل کو آئینے کی طرح شفاف اور بے غبار رکھتا ہے۔ جب دل صاف ہو جاتا ہے تو حسن خود اس میں اپنا جلوہ دیکھتا ہے یعنی عاشق کا دل محبوب کے حسن کا آئینہ بن جاتا ہے۔ یہ نہایت گہرا صوفیانہ تصور ہے کہ پاک دل میں حقیقتِ حسن منعکس ہوتی ہے۔ اس میں عاشق کو محض چاہنے والا نہیں بلکہ مظہرِ حسن بنا دیا گیا ہے۔

کفِ افسوس ملواتی ہے تیری پاک دامانی
پہنا کر شاہدِ عصمت کو جامہٴ پارسائی کا

شاعر محبوب کی پاک دامنی کو اس قدر بلند دکھاتا ہے کہ اس پر حیرت اور افسوس سے ہاتھ ملنے کو جی چاہتا ہے — یعنی ایسی پاکیزگی نایاب ہے۔ وہ محبوب کو، ”شاہدِ عصمت“ یعنی پاکیزگی کے جیتے جاگتے پیکر کے طور پر پیش کرتا ہے، جسے پارسائی کا لباس پہنایا گیا ہے۔ یہاں محبوب کا کردار جسمانی حسن سے بڑھ کر اخلاقی و روحانی حسن تک پہنچ جاتا ہے۔

نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھ کو دعویٰ ہے خدائی کا

شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ میں نے تجھے ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا، مگر دل کی آنکھ سے پہچان لیا ہے۔ اور اے صنم! تیرا خدائی کا دعویٰ بھی بجا ہے یعنی تیرا حسن اس قدر غالب اور کامل ہے کہ تجھے معبود مان لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ عشق کی انتہا درجے کی عقیدت اور سرسپردگی کا بیان ہے جہاں محبوب معبود کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔

14.2.4 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

خالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجیے

1. خواجہ حیدر علی آتش کی پیدائش _____ میں ہوئی۔
2. آتش نے _____ سے اصلاحِ سخن حاصل کی۔
3. آتش کا شمار دبستان _____ کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔
4. آتش کی شاعری میں زبان کی سادگی، محاورے کی صفائی اور _____ نمایاں ہے۔
5. آتش اور _____ کے درمیان ادبی رقابت اردو شاعری کی تاریخ کا اہم باب ہے۔

14.3 عمومی جائزہ

خواجہ حیدر علی آتش اردو غزل کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ ان کا شمار دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا میں ہوتا ہے، تاہم ان کی شاعری میں دبستانِ دہلی کی سادگی، سوز و گداز اور جذباتی صداقت بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی خودداری، آزاد روی اور قلندرانہ شان کے ساتھ گزاری اور کبھی درباری شاعری کو ذریعہٴ معاش نہیں بنایا۔

آتش کی شاعری عشق، انسانی جذبات، خودداری، رجائیت، روحانیت اور زندگی کے ولولے کی ترجمان ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی سادگی، محاورے کی صفائی، فطری اندازِ بیان اور اثر آفرینی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انہوں نے عشق کو محض ظاہری حسن تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے روحانی اور فکری سطح پر بھی پیش کیا۔

زیرِ مطالعہ غزلوں میں عشق، ہجر و وصال، تخیل، آرزو، انسانی بے بسی، روحانیت اور حسن کے مختلف پہلو نہایت مؤثر انداز میں سامنے آتے ہیں۔ آتش کے کلام میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح، صنعتِ تضاد اور تشخیص جیسی فنی خوبیاں بھی نمایاں ہیں۔

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ نے سیکھا کہ:

- خواجہ حیدر علی آتش اردو غزل کے اہم شاعر تھے۔
- آتش کا تعلق دبستانِ لکھنؤ سے تھا، لیکن ان کی شاعری میں دبستانِ دہلی کی خصوصیات بھی ملتی ہیں۔
- ان کی شاعری میں عشق، خودداری، سوز، روحانیت اور رجائیت نمایاں عناصر ہیں۔
- آتش نے سادہ، رواں اور محاوراتی زبان استعمال کی۔
- ان کے کلام میں جذبے کی صداقت اور فطری اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔
- آتش کی غزلوں میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح، تضاد اور تشخیص جیسے فنی محاسن موجود ہیں۔
- ناسخ اور آتش کی ادبی رقابت نے اردو غزل کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔
- آتش کی شاعری میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں کے آثار ملتے ہیں۔

14.5 فرہنگ

لفظ	معنی
غائبانہ	غیر موجودگی میں
شانہ	کنگھی
مہمیز	گھوڑے کو تیز چلانے کا آلہ
تازیانہ	کوڑا
مشتِ خاک	مٹی کا ذرہ، حقیر وجود

لفظ	معنی
عندلیب	بلبل
صیاد	شکاری
حاب	پانی کا بلبہ
سبو	صراحی
رفوگر	کپڑا سینے والا
برگشتہ طالعی	بد قسمتی
سائل	سوال کرنے والا
جُبہ سائی	پیشانی رگڑنا، سجدہ کرنا
یدِ بیضا	حضرت موسیٰ کا معجزاتی روشن ہاتھ
مومیائی	زخم بھرنے والی دوا
شاہدِ عصمت	پاکیزگی کا پیکر
فردائے قیامت	قیامت کا دن

14.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. خواجہ حیدر علی آتش کے حالاتِ زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2. آتش کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

3. آتش اور ناسخ کی شاعری کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

4. آتش کی شاعری میں عشق اور روحانیت کے عناصر کی وضاحت کیجیے۔

14.7 مشقی سوالات

1. خواجہ حیدر علی آتش کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

2. آتش کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

3. آتش کی شاعری میں عشق، خودداری اور قلندرانہ مزاج کا مطالعہ کیجیے۔

4. آتش اور ناسخ کی ادبی رقابت کی اہمیت واضح کیجیے۔

14.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1. خواجہ حیدر علی آتش کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

خواجہ حیدر علی آتش اردو غزل کے ممتاز اور بلند پایہ شعر امین شمار ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش 1778ء میں فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے آباؤ اجداد بغداد سے تعلق رکھتے تھے جو روزگار کی تلاش میں پہلے دہلی اور بعد میں فیض آباد آکر آباد ہوئے۔ آتش ابھی کم عمر ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، جس کے باعث ان کی باقاعدہ تعلیم ادھوری رہ گئی، لیکن فطری ذہانت، مشاہدے اور مطالعے نے ان کی علمی اور ادبی شخصیت کو نکھار دیا۔ جوانی میں آتش نواب محمد تقی خاں کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں کے ادبی ماحول اور خصوصاً انشاء اور مصحفی کی ادبی سرگرمیوں نے ان کے اندر شعری ذوق کو جلا بخشی۔ انہوں نے مصحفی سے اصلاحِ سخن حاصل کی اور جلد ہی اردو غزل کے اہم شاعر بن گئے۔ آتش نے کبھی درباری زندگی کو پسند نہیں کیا۔ نواب محمد تقی خاں کی وفات کے بعد انہوں نے کسی بادشاہ یا رئیس کی ملازمت اختیار نہ کی اور خودداری کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان کی شخصیت میں درویشی، قلندرانہ شان اور سپاہیانہ بانگن نمایاں تھا۔ ادبی اعتبار سے آتش نے اردو غزل کو سادگی، فطری پن اور جذبے کی صداقت عطا کی۔ ان کی شاعری میں عشق، خودداری، انسانی جذبات، روحانیت اور رجائیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ انہوں نے زبان کی سادگی، محاورے کی صفائی اور مؤثر طرزِ اظہار کے ذریعے اردو شاعری کو نئی وسعت بخشی۔

ان کے شاگردوں میں دیاشکر نسیم، مرزا شوق، واجد علی شاہ اور صبا جیسے شعر ا شامل ہیں۔ آتش نے 1847ء میں وفات پائی، لیکن ان کا کلام آج بھی اردو ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

2۔ آتش کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

خواجہ حیدر علی آتش بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزل گوئی اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اگرچہ ان کا تعلق دبستانِ لکھنؤ سے تھا، لیکن ان کی شاعری میں دبستانِ دہلی کی سادگی، داخلی کیفیت اور جذباتی سچائی بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ آتش کی غزلوں کا سب سے بڑا وصف جذبے کی صداقت ہے۔ ان کے اشعار تصنع اور مصنوعی پن سے پاک ہیں۔ وہ عشق کو نہایت فطری اور انسانی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کی حرارت، خودداری، حوصلہ، امید اور مردانگی کے جذبات نمایاں ہیں۔

زبان کے اعتبار سے آتش نے سادہ، رواں اور محاوراتی زبان استعمال کی ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ کی بناوٹ سے زیادہ معنی کی تاثیر کو اہمیت حاصل ہے۔ تشبیہ، استعارہ، تلمیح، تضاد اور تشخیص جیسی صنعتوں کا استعمال بھی ان کے ہاں نہایت فطری انداز میں ملتا ہے۔

آتش کی غزلوں میں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ روحانی اور صوفیانہ رجحانات بھی موجود ہیں۔ ان کا انداز بیان دل نشین اور اثر انگیز ہے، جس کی وجہ سے ان کی غزلیں اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہیں۔

3۔ آتش کی شاعری میں عشق، خودداری اور قلندرانہ مزاج کا مطالعہ کیجیے۔

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری میں عشق بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے ہاں عشق محض محبوب کے حسن کی تعریف تک محدود نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر جذبہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق کی وارفتگی، جدائی کا درد، وصال کی آرزو اور محبوب سے قلبی وابستگی کا نہایت مؤثر اظہار ملتا ہے۔

آتش کی شخصیت اور شاعری میں خودداری نمایاں وصف ہے۔ انہوں نے زندگی بھر درباری وابستگی اور خوشامد سے گریز کیا۔ یہی خودداری ان کے اشعار میں بھی جھلکتی ہے۔ ان کا عاشق کمزور اور بے وقعت نہیں بلکہ عزت نفس رکھنے والا، باوقار اور باہمت انسان ہے۔ قلندرانہ مزاج بھی آتش کی شخصیت اور شاعری کا اہم پہلو ہے۔ وہ دنیاوی جاہ و حشمت کے بجائے سادگی، آزادی اور درویشی کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے اشعار میں زندگی سے محبت، بلند حوصلگی، روحانی آزادی اور بے نیازی کے جذبات نمایاں ہیں۔ یہی عناصر ان کی شاعری کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔

5۔ آتش اور ناسخ کی ادبی رقابت کی اہمیت واضح کیجیے۔

آتش اور امام بخش ناسخ کی ادبی رقابت اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ دونوں شعرا دبستان لکھنؤ کے نمایاں نمائندے تھے، لیکن ان کے شعری رجحانات میں نمایاں فرق تھا۔

ناسخ زبان کی اصلاح، لفظی نزاکت، صنعت گری اور فنی باریکیوں پر زور دیتے تھے، جبکہ آتش جذبے کی صداقت، سادگی زبان اور اثر آفرینی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ناسخ کے ہاں فن کی چمک زیادہ ہے جبکہ آتش کے ہاں دل کی گرمی اور احساس کی شدت نمایاں ہے۔ ان دونوں شعرا کی ادبی رقابت نے اردو غزل کے معیار کو بلند کیا۔ اس مقابلے کے نتیجے میں زبان کی اصلاح، شعری اظہار کی وسعت اور فنی شعور کو فروغ ملا۔ دونوں کے شاگردوں نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا، جس سے اردو شاعری مزید ترقی یافتہ اور مستحکم ہوئی۔

14.8 جوابات سرگرمی

1. فیض آباد
2. مصحفی
3. لکھنؤ
4. جذبے کی صداقت
5. ناسخ

14.9 امدادی کتب

1. آبِ حیات محمد حسین آزاد
2. مقدمہ کلامِ آتش خلیل الرحمن اعظمی
3. اردو شاعری کا فنی ارتقا فرمان فتح پوری
4. تاریخِ ادبِ اردو جمیل جالبی
5. خواجہ حیدر علی آتش حیات اور شاعری ڈاکٹر شعب رائی
6. انتخاب کلامِ آتش ولی الحق انصاری
7. دبستانِ آتش شاہ عبدالسلام

سبق نمبر ۱۵۔ مرزا اسد اللہ خان غالب

ساخت

15.0 اغراض و مقاصد

15.1 تعارف

15.2 غالب کی حیات اور غزل گوئی

15.2.0 نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا۔

15.2.1 آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔

15.2.2 بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔

15.2.3 ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا

15.2.4 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

15.3 عمومی جائزہ

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

15.5 فرہنگ

15.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.7 مشقی سوالات

15.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

15.8 جوابات سر گرمی

15.9 امدادی کتب

15.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو مرزا اسد اللہ خان غالب کی شخصیت، حیات، ادبی خدمات اور شاعرانہ عظمت سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ جان سکیں گے کہ غالب اردو ادب کے ایسے عظیم شاعر تھے جنہوں نے اردو غزل کو نئی فکری وسعت، معنوی گہرائی اور فلسفیانہ جہت عطا کی۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ غالب کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، ادبی سفر اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات سے واقف ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ غالب نے کس طرح اردو شاعری کو روایتی مضامین سے نکال کر انسانی زندگی، کائنات، تصوف، فلسفے اور وجودی مسائل کی طرف متوجہ کیا۔

مزید یہ کہ آپ غالب کی شاعری کے مختلف فکری اور فنی پہلوؤں، مثلاً تصوف، عشق، طنز و ظرافت، تصورِ غم، جدتِ فکر، معنی آفرینی، تہہ داری اور ان کے منفرد اندازِ بیان کا مطالعہ کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ غالب کی ادبی خدمات، ان کی نثری تصانیف اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ غالب کے منتخب اشعار کی تفہیم اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت بھی حاصل کریں گے اور اردو شاعری کی فکری روایت میں ان کی اہمیت کا ادراک کر سکیں گے۔

15.1 تعارف

یہ سبق اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی زندگی، شخصیت، ادبی خدمات اور شاعرانہ خصوصیات سے متعلق ہے۔ غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے، لیکن اردو غزل میں ان کا مقام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو فکری گہرائی، فلسفیانہ بصیرت اور معنوی وسعت عطا کی اور اسے محض جذباتی اظہار سے آگے بڑھا کر انسانی شعور کی ترجمان بنادیا۔

غالب ایک ایسے دور میں سامنے آئے جب ہندوستان سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ ان حالات نے ان کی فکر اور شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کے کلام میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل، انسانی نفسیات، تصوف، تقدیر، کائنات اور حقیقتِ وجود جیسے موضوعات بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

غالب کی شاعری کا ایک اہم وصف اس کی فکری گہرائی اور معنوی تہہ داری ہے۔ ان کے اشعار بیک وقت کئی معنوں کے حامل ہوتے ہیں اور قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان منفرد، دلکش اور اثر انگیز ہے، جس کی وجہ سے وہ اردو ادب کے مقبول ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سبق میں غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، ان کی ادبی خدمات اور شاعری کی نمایاں خصوصیات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ ان کے فن اور شخصیت کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں اور اردو ادب میں ان کے مقام کا صحیح ادراک حاصل کر سکیں۔

15.2 غالب کی حیات اور غزل گوئی

انیسویں صدی کا ابتدائی دور برصغیر کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی میں بڑی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی اور پرانی تہذیبی روایات کمزور پڑ رہی تھیں۔ ایسے نازک دور میں اردو ادب کو چند ایسے نابغہ روزگار شعرا میسر آئے جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ادب کو نئی زندگی بخشی۔ ان میں سب سے نمایاں نام مرزا اسد اللہ خان غالب کا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو محض جذبات اور عشقیہ مضامین تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے فکری گہرائی، فلسفیانہ وسعت اور ذہنی بالیدگی عطا کی۔

مرزا اسد اللہ خان غالب کی پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم عام طور پر 1797ء کو ان کی ولادت کا سال تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا تعلق ترک نژاد خاندان سے تھا جس کے آباؤ اجداد وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تھے۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ خان فوجی خدمات سے وابستہ تھے، لیکن غالب ابھی بچپن ہی میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بعد ازاں ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان کی کفالت کی، مگر چند برس بعد وہ بھی وفات پا گئے۔ یوں غالب کی پرورش ان کے نانا خواجہ غلام حسین خان کے زیر سایہ ہوئی۔

ابتدائی تعلیم آگرہ میں حاصل کی۔ فارسی زبان و ادب سے انہیں خاص شغف تھا اور انہوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ کم عمری ہی میں شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ ابتدا میں "اسد" تخلص اختیار کیا، لیکن بعد میں "غالب" کے نام سے شہرت پائی۔ صرف تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی، جو نواب الہی بخش خان معروف کی صاحبزادی تھیں۔ شادی کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی اس زمانے میں علم و ادب کا مرکز تھی، چنانچہ یہاں کا ادبی ماحول ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے فروغ کا سبب بنا۔ غالب کی زندگی مالی مشکلات، پینشن کے مقدمات اور ذاتی مصائب سے عبارت رہی۔ انہوں نے اپنی پینشن کی بحالی کے لیے کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے، لیکن ان تمام حالات کے باوجود ان کی تخلیقی قوت متاثر نہ ہوئی۔

1849ء میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے انہیں "نجم الدولہ"، "دبیر الملک" اور "نظام جنگ" جیسے اعزازات سے نوازا۔ بعد میں وہ شاہی دربار سے وابستہ ہوئے اور ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن بالآخر ان کی پینشن بحال کر دی گئی۔

غالب کا انتقال 15 فروری 1869ء کو دہلی میں ہوا۔ وہیں ان کا مزار واقع ہے، جو اردو ادب کے شائقین کے لیے عقیدت کا مرکز ہے۔

غالب کی شاعری کے نمایاں اوصاف

فکری وسعت

غالب نے اردو غزل کو نئی فکری جہت عطا کی۔ ان سے پہلے غزل زیادہ تر حسن و عشق کے روایتی مضامین تک محدود تھی، لیکن غالب نے زندگی، کائنات، انسان، تقدیر اور وجود کے مسائل کو بھی شاعری کا حصہ بنایا۔ ان کے اشعار قاری کو سوچنے اور غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

تصوف اور فلسفہ

غالب کی شاعری میں صوفیانہ اور فلسفیانہ عناصر نمایاں ہیں۔ انہوں نے وحدت الوجود، حقیقتِ ہستی، فنا و بقا اور انسان و کائنات کے باہمی تعلق جیسے موضوعات پر گہری بصیرت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا۔ ان کے اشعار میں سوال، تجسس اور فکری جستجو کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

عشق و محبت

اگرچہ غالب ایک فلسفی شاعر ہیں، لیکن عشق ان کی شاعری کا بنیادی موضوع بھی ہے۔ ان کے ہاں عشق صرف جذباتی کیفیت نہیں بلکہ انسانی وجود کا ایک اہم تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ محبوب کے حسن، جدائی کے کرب، وصال کی آرزو اور انسانی احساسات کی مختلف صورتیں ان کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔

طنز و مزاح

غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ظرافت کا عنصر موجود ہے۔ وہ زندگی کی تلخیوں کو بھی مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں شائستگی، ذہانت اور فکری گہرائی پائی جاتی ہے۔

غم کا شعور

غالب کی زندگی مسلسل آزمائشوں سے گزری، جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ ان کے کلام میں غم عشق، غم روزگار، غم ہستی اور انسانی محرومیوں کا گہرا احساس ملتا ہے۔ تاہم یہ غم مایوسی نہیں بلکہ فکری آگہی پیدا کرتا ہے۔

معنی آفرینی اور تہہ داری

غالب کے اشعار کی ایک اہم خصوصیت ان کی تہہ داری ہے۔ ان کا ایک شعر مختلف سطحوں پر مختلف معانی پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی نئی تعبیرات آج بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔

جدت اور انفرادیت

غالب نے روایتی شاعری کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی نئے مضامین پیدا کیے۔ ان کی تخیل آفرینی، نازک خیالی اور فکری ندرت نے اردو شاعری کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ انہوں نے اپنی الگ راہ بنائی اور کسی کی تقلید پر اکتفا نہیں کیا۔

اندازِ بیان

غالب کا اسلوب اردو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں سادگی اور پیچیدگی، فلسفہ اور جذبات، شوخی اور سنجیدگی ایک ساتھ ملتے ہیں۔ ان کی زبان نہایت دلکش، بلیغ اور معنی خیز ہے، جس نے انہیں اردو کا لازوال شاعر بنادیا۔

ادبی خدمات

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں قابل قدر سرمایہ چھوڑا۔ ان کی اہم تصانیف میں "دیوانِ غالب"، "اردوئے معلّٰی"، "عودِ ہندی"، "قاطعِ برہان"، "دستنبو" اور ان کے خطوط شامل ہیں۔ ان کے خطوط اردو نثر کی ترقی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مرزا غالب اردو ادب کی تاریخ کی ایک ایسی عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے شاعری کو نئی فکری بلندیوں سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری میں فلسفہ، عشق، تصوف، طنز، غم اور انسانی تجربات کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو انہیں اردو کا ایک لازوال شاعر بناتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اہمیت میں کمی نہیں آئی بلکہ ان کے فن کی معنویت اور بھی بڑھتی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب آج بھی اردو ادب کے سب سے زیادہ پڑھے اور سمجھے جانے والے شاعروں میں شامل ہیں۔

15.2.0 غزل (نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا)

نقش	فریادی	ہے	کس	کی	شوخی	تحریر	کا
کاغذی	ہے	پیرہن	ہر	پیکر	تصویر	کا	

یہ شعر مرزا غالب کی اس غزل کا افتتاحیہ ہے جو قاری کو ابتدا ہی میں وجود، فن، تخلیق اور جبرِ ہستی کے سوالات میں داخل کر دیتا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ بظاہر ایک نہایت سادہ سی تصویری علامت (نقش اور تصویر) سے گفتگو شروع کرتے ہیں، مگر اس کے بطن میں انسانی تقدیر، فنکار اور تخلیق کے رشتے کا ایک گہرا اور پیچیدہ فلسفہ پوشیدہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ نقشِ فریادی ہے یعنی جو تصویر، جو وجود، جو شکل و صورت ہمارے سامنے ہے، وہ خود فریاد کر رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ فریاد کس کی شوخیِ تحریر کا نتیجہ ہے؟ یہاں، "شوخیِ تحریر" محض لکھنے کی شوخی نہیں بلکہ خالق کی بے نیازی، لاپرواہی یا جمالیاتی تجل کی علامت ہے۔ غالب اشارہ کرتے ہیں کہ شاید تخلیق کرنے والے نے حسن، نزاکت اور ظرافت کے شوق میں ایسی مخلوق بنادی جو خود اپنی ناتوانی اور بے بسی پر فریاد کرنے لگی۔ یہ فریاد کسی بیرونی ظلم کی نہیں، بلکہ اپنے بنائے جانے کے عمل پر ہے۔ گویا انسان یا نقش یہ سوال کر رہا ہے کہ مجھے اس نازک، کمزور اور فانی قالب میں کیوں ڈھالا گیا؟

دوسرے مصرعے میں غالب اس سوال کا جواب بھی خود دے دیتے ہیں کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا، یہ مصرعہ محض تصویر کے کاغذ پر بنے ہونے کی اطلاع نہیں دیتا، بلکہ ایک وجودی اعلان ہے۔ کاغذی پیرہن کا مطلب ہے: ناپائیداری، نازکی، معمولی سی ضرب سے فنا ہو جانے والی ہستی۔ یہاں تصویر دراصل انسان ہے اور کاغذی لباس انسانی جسم، انسانی وجود، اور انسانی زندگی کی علامت ہے۔ غالب کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کا وجود بظاہر ایک مکمل صورت رکھتا ہے، مگر اس کی بنیاد نہایت کمزور ہے۔ ذرا سا وقت، ذرا سی تقدیر، یا ایک معمولی حادثہ اور یہ پورا پیکر بکھر جاتا ہے۔

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

یہ شعر غالب کے داخلی کرب اور تنہائی کے تجربے کا نہایت گہرا اور دردناک اظہار یہ ہے۔ پہلے شعر میں شاعر نے وجود کی ناپائیداری اور تخلیق کی بے رحمی پر سوال اٹھایا تھا، اب دوسرے شعر میں وہ اسی وجود کے اندر تنہائی کے عذاب کو موضوع بناتا ہے۔ یہاں غالب سمحض ذاتی غم بیان نہیں کرتے بلکہ تنہائی کو ایک ہمہ گیر انسانی تجربہ بنا دیتے ہیں۔

پہلے مصرعے میں لفظ ”کاو کاو“ قاری کو چونکا دیتا ہے۔ یہ محض تکرار نہیں بلکہ ایک صوتی کیفیت (auditory effect) پیدا کرتا ہے۔ اس لفظ میں ایک مسلسل، تھکانے والی، اعصابی کھد بکاہٹ موجود ہے، جیسے کوئی دل یا دماغ کسی بات پر بار بار اٹک گیا ہو۔ یہ لفظ خود تنہائی کی بے چینی کو آواز میں بدل دیتا ہے۔ غالب یہاں کہتے ہیں کہ تنہائی کی سخت جانی یعنی اس کا ضدی، بے رحم، نہ ختم ہونے والا پن قابل بیان نہیں۔ ”نہ پوچھ“ کہہ کر شاعر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ تجربہ لفظوں سے ماورا ہے۔

”سخت جانی“ کا استعمال نہایت معنی خیز ہے۔ عام طور پر یہ لفظ زندگی، جان یا کسی مضبوط شے کے لیے آتا ہے، مگر یہاں تنہائی کو سخت جان کہا گیا ہے۔ اس سے تنہائی ایک جاندار، دشمن اور مقابل قوت بن جاتی ہے جو انسان کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔ غالب کسی تنہائی وقتی نہیں بلکہ مستقل ہے، ایسی جو وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر تنہائی کے اس تجربے کو ایک انتہائی مشکل عمل سے تشبیہ دیتا ہے: ”صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا“ یہاں غالب نے ایک عام روزمرہ عمل صبح کا شام میں بدلنا۔۔۔ کو غیر معمولی حد تک مشکل بنا کر پیش کیا ہے۔ عام انسان کے لیے وقت کا گزر نافطری عمل ہے، مگر تنہائی میں مبتلا انسان کے لیے ہر لمحہ ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ ”جوئے شیر“ فارسی روایت میں ایک محاورہ ہے جو کسی ناممکن یا انتہائی دشوار کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ غالب اس محاورے کو محض زیب زبان کے لیے نہیں لاتے بلکہ تنہائی کے تجربے کو اس درجے تک پہنچا دیتے ہیں کہ وقت کا بہاؤ ہی معطل محسوس ہونے لگتا ہے۔

یہ شعر دراصل وقت کے نفسیاتی تجربے کی عکاسی ہے۔ تنہائی میں وقت نہ صرف سست ہو جاتا ہے بلکہ ایک افیت بن جاتا ہے۔ صبح سے شام تک کا سفر، جو عام حالات میں بے دھیانی میں طے ہو جاتا ہے، یہاں ایک نہ ختم ہونے والی آزمائش بن چکا ہے۔ غالب اس طرح انسانی شعور کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جہاں وقت خارجی حقیقت نہیں رہتا بلکہ ذہنی عذاب بن جاتا ہے۔

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یہ شعر مرزا غالب کی شاعری میں جذبہ، اختیار، جبر اور حیات و موت کے فلسفے کا نہایت بلند اور گہرا اظہار یہ ہے۔ پہلے دو اشعار میں شاعر نے وجود کی ناپائیداری اور تنہائی کی افیت کو موضوع بنایا تھا؛ یہاں وہ اس داخلی کیفیت کو ایک خطرناک اور فیصلہ کن مرحلے تک لے آتا ہے۔ پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں: ”جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے“ یہاں شاعر قاری کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے لیکن کسی خارجی منظر کی نہیں، بلکہ ایک داخلی کیفیت کی۔ ”جذبہ“ اور ”شوق“ دونوں ہی انسانی باطن کی قوتیں ہیں، مگر غالب نے ان کے ساتھ ”بے اختیار“ کا اضافہ کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ وہ کیفیت ہے جو عقل، تدبیر اور احتیاط کے دائرے سے باہر ہوتی ہے۔ یہ شوق ایسا نہیں جسے انسان چاہے تو روک لے، بلکہ یہ وہ قوت ہے جو انسان کو خود اپنے خلاف کھڑا کر دیتی ہے۔ یہاں ”دیکھا چاہیے“ کہنا بھی معنی خیز ہے۔ غالب آس جذبہ کو قابلِ فہم یا قابلِ بیان نہیں بلکہ قابلِ مشاہدہ قرار دیتے ہیں۔ گویا یہ کیفیت لفظوں میں پوری طرح سمٹ نہیں سکتی، اسے محسوس کرنا ہی اس کا اصل اور اک ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر اس جذبے کی شدت کو ایک نہایت جرات مندانہ اور چونکا دینے والی تمثیل میں ڈھال دیتا ہے: ”سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا“ یہ مصرعہ اپنی ظاہری ساخت میں ہی قاری کو چونکا دیتا ہے۔ شمشیر عموماً قتل کا آلہ ہے، مگر یہاں وہ خود ایک جسم رکھتی ہے، سینہ، اور اس سینے میں دم یعنی سانس، جان، زندگی پوشیدہ ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ شوق کی شدت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ شمشیر کا دم، اس کی جان، اس کے اپنے سینے سے باہر آگئی ہے۔

یہاں معنی یہ بنتا ہے کہ جب جذبہ بے اختیار ہو جائے تو زندگی اور موت کے درمیان قائم تمام فاصلوں کو توڑ دیتا ہے۔ شمشیر جو دوسروں کی جان لیتی ہے، وہ خود بھی اس جذبے کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ یوں غالب انسانی شوق کو ایسی طاقت بنا دیتے ہیں جو موت کے استعارے پر بھی غالب آ جاتی ہے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یہ شعر مرزا غالب کی شاعری میں زبان اور معنی کے تعلق پر ایک بنیادی فکری بیان ہے۔ یہاں شاعر عشق یا تنہائی سے ہٹ کر علم، فہم اور اظہار کے مسئلے کو موضوع بناتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ انسان جو کچھ کہنا چاہتا ہے، وہ اکثر زبان کی گرفت میں نہیں آ پاتا۔ پہلے مصرعے میں غالب کہتے ہیں: ”آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے“ یہاں ”آگہی“ کو محض علم یا شعور کے معنی میں نہیں لینا چاہیے، بلکہ یہ انسانی عقل، فہم، تنقید اور تجزیے کی مجموعی قوت کی علامت ہے۔ غالب آس آگہی کو ایک صیاد کی طرح پیش کرتے ہیں جو ”دام شنیدن“ یعنی سننے کا جال بچھاتا ہے۔ گویا انسان جتنا چاہے سننے، سمجھنے اور جاننے کے وسائل پیدا کر لے کتابیں، تقریریں، منطق، فلسفہ یہ سب سننے کے جال ہی تو ہیں۔

لیکن اس مصرعے میں ایک لطیف طنز بھی پوشیدہ ہے۔ ”جس قدر چاہے“ کہہ کر شاعر یہ اشارہ دیتا ہے کہ آگہی کی کوشش لامحدود ہو سکتی ہے، مگر اس کی کامیابی مشکوک ہے۔ سننے کے دام بچھانا اس بات کی ضمانت نہیں کہ حقیقت خود کو پکڑ وادے گی۔ دوسرے مصرعے میں غالب آس ناکامی کا

سبب بتاتے ہیں: ”مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا“ ”مدعا“ وہ اصل بات ہے جو شاعر کہنا چاہتا ہے، وہ گہرا مفہوم جو دل اور ذہن میں موجود ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ یہ مدعا عنقا ہے یعنی ایسا پرندہ جو وجود رکھتا ہے مگر دکھائی نہیں دیتا، جس کا ذکر تو ہے مگر مشاہدہ ممکن نہیں۔ یہاں غالب زبان اور اظہار کی حد کو واضح کر دیتے ہیں۔ شاعر کا مدعا اس کی اپنی تقریر کی دنیا میں بھی نایاب ہے۔ یعنی شاعر بولتا ہے، الفاظ استعمال کرتا ہے، مگر جو بات کہنا چاہتا ہے وہ انہی الفاظ میں پوری طرح سمٹ نہیں پاتی۔ اس طرح یہ شعر اظہار کی المیہ ناکامی کا اعلان بن جاتا ہے

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

یہ شعر مرزا غالبؔ کی شخصیت، مزاج اور فکری سرشت کا نہایت نمائندہ بیان ہے۔ پہلے اشعار میں شاعر نے وجود کی ناپائیداری، تنہائی، شوق کی بے اختیاری اور اظہار کی ناکامی جیسے مسائل پر گفتگو کی تھی، اب وہ ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں جسمانی اسیری کے مقابل باطنی آزادی کا تصور پوری قوت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

پہلے مصرعے میں غالبؔ کہتے ہیں کہ وہ اسیری کی حالت میں بھی ”آتش زیرِ پا“ ہیں۔ اس ترکیب میں غیر معمولی شدت اور معنی کی کثافت موجود ہے۔ اسیری عام طور پر بے بسی، جمود اور شکست کی علامت سمجھی جاتی ہے، مگر غالبؔ اس تصور کو الٹ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قید میں بھی ان کے قدموں کے نیچے آگ ہے یعنی ان کا باطن ابھی تک گرم، متحرک اور سرکش ہے۔ یہاں ”آتش زیرِ پا“ محض غصے یا جوش کی علامت نہیں بلکہ ایک انقلابی اور تخریبی توانائی کی نشانی ہے، جو جبر کے باوجود ختم نہیں ہوئی۔ دوسرے مصرعے میں شاعر اس تصور کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے: ”موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا“ ”یہاں زنجیر کے حلقے کو“ ”آتش دیدہ“ ”کہنا نہایت معنی خیز ہے۔ آگ میں جلا ہوا بال عام طور پر کمزور اور بے جان ہو جاتا ہے، مگر غالبؔ کے ہاں یہ بال بھی آگ دیکھ چکا ہے یعنی وہ بھی تجربہ، سوز اور حرارت سے گزر چکا ہے۔ گویا وہ زنجیر جو شاعر کو قید کیے ہوئے ہے، وہ بھی شاعر کے اندرونی آتش شوق اور سرکشی کے اثر سے محفوظ نہیں رہی۔ اس طرح غالبؔ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسیر ہونے کے باوجود وہ اپنے قید خانے پر اثر انداز ہو رہے ہیں، نہ کہ قید خانہ ان پر۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

اس شعر میں مرزا غالب نے عشق کی شدت، اس کے تدریجی اثر اور محبوب کے حُسن کی ہلاکت خیزی کو نہایت گہرے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشق کی آہ یا سسکی اتنی معمولی چیز نہیں کہ فوراً اثر دکھادے، بلکہ اس کے اثر پذیر ہونے کے لیے ایک پوری عمر درکار ہوتی ہے۔ عشق میں دکھ، حسرت اور تڑپ فوراً شمر آور نہیں ہوتیں بلکہ زندگی بھر کے تجربات، صبر اور جلنے کے بعد کہیں جا کر اثر دکھاتی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں محبوب کی زلف کو استعارہ بنا کر عشق کی جان لیوا کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔ زلف یہاں محض بال نہیں بلکہ پیچیدگی، گرفت، اسارت اور مہلک حسن کی علامت ہے۔ شاعر سوالیہ انداز میں کہتا ہے کہ آخر کون ہے جو محبوب کی زلف کے پھندے میں آکر زندہ بچ سکا ہو؟ گویا عشق کا انجام فنا ہے اور اس راستے میں بقا ممکن نہیں۔

یہاں آہ کو عمر طلب اثر بتایا جانا مبالغہ نہیں بلکہ عشق کی داخلی گہرائی کا بیان ہے۔ سوالیہ انداز استفہام انکاری پیدا کرتا ہے جو معنی میں زور پیدا کرتا ہے۔ زلف کا استعارہ، عمر کا تصور، آہ کی تجسیم اور زندگی و موت کا فلسفہ مل کر شعر کو فکری بلندی عطا کرتے ہیں۔ شعر میں عاشق کی بے بسی، عشق کی مہلت طلبی اور حسن کی قاتلانہ تاثیر نہایت فنکاری سے یکجا ہو گئی ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

اس شعر میں غالب نے زندگی، تقدیر اور جدوجہد کو سمندر کے استعارے میں سمودیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سمندر کی ہر موج میں ایک جال بچھا ہوا ہے اور ہر جال میں سینکڑوں آرزوؤں والا مگر خطرناک نہنگ (مگر مچھ) موجود ہے۔ یعنی زندگی کے ہر مرحلے پر آزمائش، خطرہ اور ناکامی کا امکان پوشیدہ ہے۔

دوسرے مصرعے میں قطرہ اور گہر (موتی) کے استعارے کے ذریعے ارتقا کا تصور سامنے آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایک معمولی قطرے پر کیا گزرتی ہے جب تک وہ صدف میں رہ کر موتی بنتا ہے۔ گویا عظمت، بلندی اور کمال تک پہنچنے کا سفر آسان نہیں بلکہ شدید آزمائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ قطرہ انسان کی علامت ہے اور گہر اس کے کمال یا مرتبے کی۔ سمندر زندگی ہے، موجیں حالات ہیں، دام مشکلات ہیں اور نہنگ طاقتور رکاوٹیں۔ اس شعر میں استعارہ، تمثیل اور علامت اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ایک مکمل فلسفہ حیات سامنے آ جاتا ہے۔ شاعر نے زندگی کی جدوجہد کو ایک کائناتی عمل بنا دیا ہے جہاں ہر کامیابی قربانی اور صبر کی مرہونِ منت ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

یہ شعر عشق کے داخلی تضاد کو نہایت خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشقی صبر مانگتی ہے جبکہ تمنا فطری طور پر بے چین ہوتی ہے۔ یعنی عشق کی بنیاد ہی ایک ایسے تضاد پر ہے جہاں دل صبر کی تلقین کرتا ہے اور خواہش بے قراری پر اصرار کرتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر دل کے رنگ بدلنے کی بات کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ دل خونِ جگر بن جائے۔ خونِ جگر انتہائی رنج، کرب اور قربانی کی علامت ہے۔ گویا عشق میں دل کو بدلنے کے لیے محض جذبات کافی نہیں بلکہ جگر کا خون بن جانا ضروری ہے۔ یہاں دل اور جگر کا تقابل، صبر اور تمنا کا تضاد اور رنگ بدلنے کی ترکیب نہایت بلیغ ہے۔ عشق کو ایک مسلسل امتحان کے طور پر دکھایا گیا ہے جہاں جذباتی شدت اور ضبط نفس ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ شعر عاشق کے نفسیاتی کرب اور عشق کی روحانی قیمت کو نمایاں کرتا ہے۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

اس شعر میں غالب نے محبوب کی بے نیازی اور عاشق کی بے بسی کو دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ تم دانستہ لاپرواہی نہیں کرو گے، مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ جب تمہیں ہماری حالت کی خبر ہو گی، ہم خاک ہو چکے ہوں گے۔ یہاں خاک ہونا فنا، موت اور مکمل بے قدری کی علامت ہے۔ شعر میں انتظار کی اذیت، وقت کی سنگدلی اور محبوب کی تاخیر کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تضاد اس بات میں ہے کہ محبوب کی نیت پر شک نہیں مگر اس کی بے خبری کا انجام ہلاکت ہے۔ اس شعر میں سادگی کے ساتھ درد، تاخیر کا المیہ اور عاشق کی ناگفتہ فریاد شامل ہے۔ یہ غالب کی وہ خاص ادا ہے جہاں شکایت بھی ہے اور شکوہ بھی نہیں۔

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

اس شعر میں غالب نے فنا اور بقا کے فلسفے کو نہایت لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ سورج کی روشنی شبنم کو فنا ہونے کا درس دیتی ہے، کیونکہ شبنم سورج کی کرنوں سے پگھل کر ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر خود کو شبنم سے تشبیہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بھی ایک عنایت کی نظر تک قائم ہوں۔ یعنی جیسے شبنم سورج کی نظر پڑتے ہی فنا ہو جاتی ہے، ویسے ہی عاشق محبوب کی توجہ پڑتے ہی مٹ جانے کو تیار ہے۔ یہاں پر تو خور، شبنم، فنا اور عنایت سب علامتی ہیں۔ شعر عشق میں خود سپردگی، فانی المحبوب اور صوفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہوتے تک

اس شعر میں زندگی کی ناپائیداری اور لمحاتی حیثیت کو بیان کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی کی فرصت ایک نگاہ سے زیادہ نہیں۔ انسان غفلت میں مبتلا ہے مگر وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ گرمی بزم کو رقص شرر کہنا نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ شرر یعنی چنگاری جو لمحہ بھر کو چمکتی ہے اور بجھ جاتی ہے۔ زندگی بھی اسی طرح لمحاتی اور عارضی ہے۔ یہ شعر وقت کی تیزی، انسانی غفلت اور زندگی کی بے ثباتی کو ایک تصویری پیکر میں سمو دیتا ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

مقطع میں غالب (اسد) زندگی کے غم کا آخری حل موت کو قرار دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی کے غم کا علاج موت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ دوسرے مصرعے میں شمع کو انسان کی علامت بنایا گیا ہے جو مختلف حالتوں میں جلتی رہتی ہے مگر آخر کار سحر تک جل کر ختم ہو جاتی ہے۔ شمع کی جلنا، روشنی دینا اور آخر میں فنا ہونا انسانی زندگی کا مکمل استعارہ ہے۔ یہ شعر فلسفہ حیات، ناگزیریت مرگ اور انسانی کرب کو نہایت وقار کے ساتھ سمیٹتا ہے اور غزل کو فکری تکمیل عطا کرتا ہے۔

15.2.2 غزل (بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا)						
بسکہ	دشوار	ہے	ہر	کام	کا	آساں
آدمی	کو	بھی	میسر	نہیں	انساں	ہونا

یہ شعر غالب کی فکری شاعری کا بنیادی اعلان ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں کسی کام کا آساں ہو جانا اس قدر مشکل ہو چکا ہے کہ خود انسان کے لیے انسان بن جانا بھی ممکن نہیں رہا۔ یہاں آدمی اور انساں کا فرق محض لفظی نہیں بلکہ معنوی اور اخلاقی ہے۔ آدمی جسمانی وجود کا نام ہے جبکہ انساں اخلاقی شعور، ہمدردی، انصاف اور انسانی قدروں کا پیکر ہے۔ غالب اس شعر میں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان تو کثرت سے موجود ہیں مگر انسانیت ناپید ہو چکی ہے۔ شعر میں طنز کی ایک دبیز تہہ موجود ہے۔ شاعر کسی فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرتی نظام کو کٹھنرے میں کھڑا کرتا ہے۔ ہر کام کا آساں ہونا یہاں زندگی کے توازن اور اخلاقی سادگی کا استعارہ ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔ اس شعر میں ایجاز

کا کمال ہے، صرف دو مصرعوں میں تہذیبی زوال، سماجی بے حسی اور انسانی ناکامی کا مکمل فلسفہ سمو دیا گیا ہے۔ آدمی اور انساں کے تضاد سے حسنِ معنی پیدا ہوا ہے جو شعر کو فکری گہرائی عطا کرتا ہے۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

اس شعر میں غالبؔ نے باطنی ویرانی کو خارجی منظر کے ذریعے پیش کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا رونا میرے گھر کی بربادی چاہتا ہے کیونکہ میرے کاشانے کی حالت ایسی ہو چکی ہے کہ اس کے در و دیوار سے ویرانی ٹپک رہی ہے۔ کاشانہ یہاں محض مکان نہیں بلکہ دل اور باطن کا استعارہ ہے۔ دل اس قدر اجڑ چکا ہے کہ اب اس میں آباد ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

در و دیوار سے بیاباں ہونا ٹپکنا ایک نہایت مؤثر پیکر تراشی ہے جس میں مبالغہ بھی ہے اور تصویریت بھی۔ بے جان اشیا کو کیفیت عطا کر کے تشخیص کی صنعت پیدا کی گئی ہے۔ گریہ یہاں سبب بھی ہے اور علامت بھی — غم کی شدت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آنسو بھی ویرانی کے طالب ہیں۔ شعر داخلی کرب اور خارجی منظر کو اس طرح یکجا کرتا ہے کہ قاری شاعر کے دل کی اجڑی ہوئی دنیا کو دیکھ لیتا ہے۔

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

یہ شعر عشق کی جنونی کیفیت کا نفسیاتی مرقع ہے۔ شاعر اپنی دیوانگی پر حیرت اور افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ میں خود ہی کسی سمت چل پڑتا ہوں اور پھر خود ہی حیران رہ جاتا ہوں کہ یہاں کیوں آگیا۔ یہ عشق کی وہ حالت ہے جہاں عقل، ارادہ اور سمت سب مٹ جاتے ہیں۔

آپ حباں اور آپ ہی حیراں ہونا کی تکرار خود کلامی کا تاثر پیدا کرتی ہے، جو جنون کی شدت کو بڑھا دیتی ہے۔ یہاں عاشق اور معشوق کی دوئی ختم ہو جاتی ہے؛ عاشق خود ہی اپنا رہنما بھی ہے اور خود ہی اپنی حیرانی کا سبب بھی۔ شعر میں نفسیاتی گہرائی، داخلی انتشار اور جذبے کی بے سستی پوری شدت سے ظاہر ہوتی ہے۔

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مرثاں ہونا

اس شعر میں غالبؔ محبوب کے حسن کی شدت کو ایک نادر تخیلی پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا جلوہ اس قدر دید طلب ہے کہ نگاہ مسلسل دیکھنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر آئینے میں بھی شعور ہوتا تو وہ بھی پلکیں مانگتا تاکہ حسن کو بار بار دیکھ سکے۔

یہاں جوہر آئینہ کو انسانی خواہش عطا کر کے تشخیص کی صنعت پیدا کی گئی ہے۔ مبالغہ اپنی اعلیٰ ترین سطح پر ہے، مگر مبالغہ حسن کو مجروح نہیں کرتا بلکہ اسے بڑھاتا ہے۔ مثرگاں ہونا حسن کی اس شدت کا علامتی اظہار ہے جو دیکھنے والے کو بھی دیکھنے کے قابل بنانا چاہتی ہے۔ یہ شعر غالب کے تخیل کی ندرت اور اسلوب کی بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ شعر عشق کے اس تصور کو پیش کرتا ہے جہاں فنا ہی بقا بن جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اہلِ تمنا کی قتل گاہ کی خوشی مت پوچھو؛ محبوب کی ننگی تلوار دیکھنا ہی ان کے لیے عید کا منظر ہے۔ یہاں قتل گاہ اور عشرت، عید اور شمشیر جیسے متضاد تصورات کو یکجا کر کے عشق کی انتہا دکھائی گئی ہے۔ شمشیر محبوب کے ظلم اور بے رحمی کا استعارہ ہے، مگر عاشق کے لیے یہی ظلم مسرت کا سبب ہے۔ تضاد کی صنعت یہاں شعر کی روح بن گئی ہے، جس سے عشق کا وہ فلسفہ سامنے آتا ہے جس میں اذیت بھی نعمت بن جاتی ہے۔

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

اس شعر میں عاشق کی محرومی اور محبوب کی بے نیازی کا درد ناک تقابل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری خوشیوں کی تمام تمنائیں خاک میں مل گئیں، جبکہ تم زندہ ہو اور خود ہی سورتوں کا گلستاں بنے ہوئے ہو۔ حناک اور گلستاں کا تقابل شدید تضاد پیدا کرتا ہے۔ داغِ تمنا ناکام خواہشات کا کنایہ ہے جو عاشق کی پوری زندگی کا حاصل بن چکی ہیں۔ شعر میں حسرت، محرومی اور بے انصافی کا احساس پوری شدت سے موجود ہے، مگر شکوہ چیخ بن کر نہیں بلکہ وقار کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ غالب کا خاص وصف ہے۔

عشرتِ پارہ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریش جگر غرقِ نمکداں ہونا

شاعر کہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے کا زخمی ہونا ہی عاشق کی خوشی ہے اور جگر کے زخم پر نمک پڑ جانا ہی اس کے لیے لذت ہے۔ یہاں درد اور سرور، زخم اور عشرت ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ ریش جگر شدید روحانی اذیت کا کنایہ ہے اور نمکداں میں غرق ہونا مبالغے کے ساتھ اس اذیت کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ شعر عشق کے اس غیر عقلی مگر روحانی منطق کو بیان کرتا ہے جس میں دکھ ہی اصل سرمایہ بن جاتا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیمیاں کا پشیمیاں ہونا

اس شعر میں غالبؔ نے تاخیرِ احساس کا المیہ بیان کیا ہے۔ محبوب نے عاشق کے قتل کے بعد ظلم سے توبہ کی۔ شاعر افسوس کرتا ہے کہ یہ توبہ جلدی تو کی گئی مگر وقت گزر جانے کے بعد۔ یہاں طنز نہایت نرم مگر کاری ہے۔ قتلِ عشق کی انتہا کا کنایہ ہے اور زود پشیمیاں کہہ کر شاعر محبوب کی نیکی کو بھی بے معنی بنا دیتا ہے۔ شعر میں حسرت، طنز اور درد ایک ساتھ موجود ہیں۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ شعر طنز، مزاح اور عشق کی شدت کا حسین امتزاج ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ اس کپڑے کی قسمت پر افسوس ہے جو عاشق کا گریبان بن جائے، کیونکہ عشق میں گریبان چاک ہونا لازم ہے۔ یوں کپڑے کو بھی عشق کی تباہ کاری کا شکار بنا دیا گیا ہے۔ کپڑے کو قسمت دینا تشخیص کی صنعت ہے، جبکہ گریباں چاک عشق کے جنون کا کنایہ ہے۔ شعر ہلکے طنز کے ساتھ عشق کی شدت کو یادگار بنا دیتا ہے اور غزل کو ایک فکری مگر دلکش انجام عطا کرتا ہے۔

15.2.3 غزل (ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا)

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

اس شعر میں مرزا غالبؔ سحشوق کی ایک نہایت تلخ اور نفسیاتی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب پری وش کا ذکر کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کا حال بیان کیا گیا تو انجام یہ ہوا کہ جو شخص رازدار تھا، وہی آخر کار رقیب بن بیٹھا۔ یہاں شاعر انسانی فطرت کے ایک نازک پہلو کو بے نقاب کرتا ہے کہ محبت کے راز جب دوسروں تک پہنچتے ہیں تو حسد، رقابت اور دشمنی جنم لیتی ہے۔ پری وش کا لفظ محبوب کے حسن، نزاکت اور ماورائیت کو ظاہر کرتا ہے۔ رازداں کا رقیب بن جانا محض ایک شخصی تجربہ نہیں بلکہ ایک آفاقی سچائی ہے کہ عشق کے معاملات میں اعتماد اکثر نقصان کا باعث بنتا ہے۔ شعر میں داخلی کرب بھی ہے اور خارجی تجربے کی تلخی بھی۔

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یا رب
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

اس شعر میں شاعر محبوب کی بے اعتنائی اور اپنی محرومی کو سوالیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ شاعر خدا سے شکوہ کرتا ہوا کہتا ہے کہ محبوب غیر کی محفل میں اس قدر شراب کیوں نوش کر رہے ہیں؟ کیا آج ہی انہوں نے ہمیں آزمانا منظور کیا ہے؟ بزم غیر محبوب کی دوری، بیگانگی اور بے وفائی کی علامت ہے، جبکہ مے عشق، سرمستی اور بے پروائی کا استعارہ ہے۔ شاعر کے لیے محبوب کا غیر کی محفل میں بے خود ہونا ایک شدید ذہنی اذیت کا باعث ہے، کیونکہ یہ عمل عاشق کے صبر اور وفا کا امتحان بن جاتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

اس شعر میں غالب نے حسرت، ناممکن آرزو اور تخیل کی پرواز کو نہایت بلند سطح پر پیش کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہمارا مسکن عرش سے بھی آگے ہوتا تو ہم اس بلندی سے ایک منظر تخلیق کر سکتے تھے۔ یہ دراصل تخلیقی قوت اور فکری بلندی کی خواہش کا اظہار ہے۔ عرش کائنات کی بلند ترین حد کی علامت ہے۔ اس سے آگے مکاں ہونے کی آرزو شاعر کی اس خواہش کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ معمولی حدود میں قید نہیں رہنا چاہتا۔

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب جتنی چاہے ذلت دے، ہم اسے ہنسی میں اڑا دیں گے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ جسے ہم نے اپنا سمجھا تھا، وہی محبوب کا محافظ نکلا۔ ذلت کو ہنسی میں ٹالنا عاشق کے ضبط، وقار اور اندرونی قوت کی علامت ہے۔ پاسباں کا آشنا نکلنا اعتماد کے ٹوٹنے اور تعلقات کی تلخی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ شعر انسانی تعلقات میں دھوکے اور غلط فہمیوں کی ایک تلخ تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں طنز نہایت شائستہ ہے، شکوہ بھی ہے مگر خود ترسی نہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ ذلت کو بھی فکری برتری میں بدل دیتے ہیں۔

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں نگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

اس شعر میں شاعر تخلیق کے عمل کو جسمانی افیت سے جوڑ دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کب تک دل کا درد لکھتا ہوں؟ کیوں نہ خود جا کر محبوب کو دکھا دوں کہ میری انگلیاں زخمی ہیں اور قلم خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ خامہ کا خونچکا ہونا تحریر کی شدت اور درد کی گہرائی کا استعارہ ہے۔ انگلیوں کا ونگار ہونا مسلسل لکھنے، برداشت اور قربانی کی علامت ہے۔ یہ شعر فنکار کی افیت، تخلیق کی قیمت اور اظہار کی بے بسی کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہاں تجسیم بھی ہے، مبالغہ بھی اور علامتی اظہار بھی۔ شعر ادب اور عشق کے مشترکہ دکھ کو ایک پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
نگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستان اپنا

اس شعر میں غالبؔ نے عشق کی انتہا اور عبادت کی علامتوں کو استعمال کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا سر سجدے میں گھستے گھستے مٹ جاتا، مگر آپ نے بلا وجہ میرے سجدے کے نگ کو اپنے آستانے کے پتھر سے بدل دید۔ نگِ سجدہ عاشق کی عاجزی، وفاداری اور خود سپردگی کی علامت ہے، جبکہ سنگِ آستان محبوب کی سختی اور بے حسی کا نشان ہے۔ شعر میں عاشق کی عقیدت اور محبوب کی بے اعتنائی کا شدید تضاد موجود ہے۔

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

شاعر کہتا ہے کہ دوست کی شکایت میں ہم نے دشمن کو ہم زبان بنا لیا تاکہ وہ راز افشا نہ کرے۔ یہ شعر انسانی تعلقات کی پیچیدگی، سیاست اور احتیاط کو ظاہر کرتا ہے۔ دوست اور دشمن کی روایتی تعریف الٹ جاتی ہے۔ غمازی یعنی راز فاش کرنا یہاں سب سے بڑا خطرہ ہے۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے تجربے کو ایک آفاقی حکمت میں بدل دیتے ہیں۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

مقطع میں غالبؔ اپنی ذات پر طنز کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نہ تو عقل مند تھے اور نہ کسی ہنر میں یکتا، پھر بھی نجانے کیوں آسماں ہمارا دشمن بن گیا۔ آسماں تقدیر، زمانہ اور حالات کی علامت ہے۔ بے سبب دشمنی کا تصور انسانی بے بسی اور کائناتی نا انصافی کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے تقدیر پر طنزیہ سوال اٹھاتا ہے۔

15.2.4 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

عزیز طلبہ و طالبات! آپ نے مرزا غالب کے بارے میں تفصیل سے پڑھا۔ اب ذیل کے جملوں میں خالی جگہیں پُر کیجیے:

1. مرزا اسد اللہ خان غالب کا تخلص ابتدا میں _____ تھا۔
2. غالب کی پیدائش _____ میں ہوئی۔
3. بہادر شاہ ظفر نے غالب کو _____ کا خطاب عطا کیا۔
4. غالب کی مشہور نثری تصنیف _____ اردو نثر کا اہم سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔
5. غالب کی شاعری میں _____ اور فلسفے کے عناصر نمایاں ہیں۔

15.3 عمومی جائزہ

مرزا اسد اللہ خان غالب اردو ادب کے عظیم ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو فکری گہرائی، فلسفیانہ وسعت اور معنوی بلندی عطا کی۔ غالب کی زندگی مختلف نشیب و فراز، مالی مشکلات اور ذاتی مصائب سے عبارت تھی، لیکن ان حالات نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید نکھارا۔ ان کی شاعری میں عشق، تصوف، فلسفہ، طنز و مزاح، غم ہستی اور انسانی تجربات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو محض جذباتی اظہار سے نکال کر فکر و شعور کی نئی دنیا سے روشناس کرایا۔ ان کا منفرد انداز بیان، معنی آفرینی اور تہہ داری انہیں اردو ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ مرزا اسد اللہ خان غالب کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے۔ آپ نے جانا کہ غالب اردو ادب کے ایک عظیم شاعر تھے جنہوں نے اردو غزل کو نئی فکری وسعت، فلسفیانہ گہرائی اور معنوی بلندی عطا کی۔ آپ نے ان کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، ازدواجی زندگی، دہلی کے ادبی ماحول اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز کا مطالعہ کیا۔ آپ نے یہ بھی سیکھا کہ غالب نے اردو شاعری کو روایتی عشقیہ مضامین سے آگے بڑھا کر انسانی زندگی، کائنات، تقدیر، وجود، تصوف اور فلسفے جیسے اہم موضوعات سے روشناس کرایا۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ فکر و دانش، سوال و تجسس اور انسانی شعور کی گہرائی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

اس سبق کے ذریعے آپ غالب کی شاعری کے مختلف فکری اور فنی پہلوؤں، مثلاً تصوف، فلسفہ، عشق، طنز و مزاح، تصور غم، معنی آفرینی، تہہ داری، جدت فکر اور انفرادیت اسلوب سے آگاہ ہوئے۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ غالب کے اشعار اپنے اندر متعدد معنوی جہات رکھتے ہیں اور قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

مزید برآں آپ نے غالب کے منفرد اندازِ بیان، زبان کی دلکشی، نازک خیالی، فکری گہرائی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مطالعہ کیا۔ آپ ان کی اہم تصانیف، خصوصاً دیوانِ غالب، اردوئے معلیٰ اور ان کے خطوط کی ادبی اہمیت سے بھی واقف ہوئے۔ اس سبق نے آپ کو غالب کے فن اور شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے اور اردو ادب میں ان کے عظیم مقام و مرتبے کا ادراک کرنے میں مدد فراہم کی۔

15.5 فرہنگ

لفظ	معنی
فکری وسعت	خیالات کی کشادگی
وحدت الوجود	کائنات میں ایک ہی حقیقتِ مطلق کا تصور
تہہ داری	متعدد معنوی پرتوں کا ہونا
معنی آفرینی	نئے اور گہرے معانی پیدا کرنا
نازک خیالی	باریک اور لطیف خیالات
متلون	بدلتے مزاج والا
رسالدار	فوجی افسر
ظرافت	خوش مزاجی اور لطیف مزاح
فنا و بقا	مٹنے اور باقی رہنے کا صوفیانہ تصور

15.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. مرزا غالب کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

2. غالب سى زندگى كے اہم حالات بيان كيجيے۔

3. غالب سى شاعرى ميں فكرى وسعت سے كيا مراد ہے؟

4. غالب سى شاعرى ميں تصوف كے عناصر كى وضاحت كيجيے۔

5. غالب کے اندازِ بیان کی نمایاں خصوصیات بیان کیجیے۔

15.7 مشقی سوالات

1. مرزا غالب کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. غالب کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔
3. غالب کی شاعری میں تصوف اور فلسفے کے عناصر پر بحث کیجیے۔
4. غالب کے اندازِ بیان، معنی آفرینی اور تہہ داری کی وضاحت کیجیے۔
5. اردو ادب میں غالب کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

15.7 مشقی سوالات کے جوابات

- 1۔ مرزا غالب کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
مرزا اسد اللہ خان غالب اردو ادب کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش آگرہ میں 1797ء میں ہوئی۔ ان کا تعلق ایک معزز ترک خاندان سے تھا۔ بچپن ہی میں والد اور پھر چچا کے انتقال کے باعث انہیں مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان حالات نے ان کے عزم اور تخلیقی صلاحیتوں کو کمزور نہیں کیا۔ ابتدائی تعلیم آگرہ میں حاصل کی اور کم عمری ہی میں شعر گوئی شروع کر دی۔ ابتدا میں "اسد" تخلص اختیار کیا، بعد ازاں "غالب" کے نام سے مشہور ہوئے۔
تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی اور وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی کا ادبی ماحول ان کی شاعرانہ نشوونما کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ غالب کی زندگی مالی مشکلات، پینشن کے مقدمات اور ذاتی مصائب سے عبارت رہی، لیکن ان تمام حالات کے باوجود انہوں نے ادب و شاعری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔
1849ء میں بہادر شاہ ظفر نے انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا کیے۔ ذوق کے انتقال کے بعد وہ بادشاہ کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ 1857ء کے بعد کے سیاسی حالات نے انہیں شدید متاثر کیا، مگر انہوں نے اپنے مشاہدات کو ادب کا حصہ بنادیا۔

غالب سکی ادبی خدمات نہایت وسیع ہیں۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں گراں قدر سرمایہ چھوڑا۔ ان کی مشہور تصانیف میں دیوانِ غالب، اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی، دستنبو اور خطوطِ غالب شامل ہیں۔ خصوصاً خطوطِ غالب نے اردو نثر کو سادگی، روانی اور بے تکلفی عطا کی۔ غالب نے اردو غزل کو نئی فکری وسعت، فلسفیانہ گہرائی اور معنوی بلندی عطا کی، جس کے باعث انہیں اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

2۔ غالب سکی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔

غالب سکی شاعری فکری اور فنی دونوں اعتبار سے بے مثال ہے۔ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف فکری وسعت ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو محض حسن و عشق کے روایتی مضامین تک محدود نہیں رکھا بلکہ زندگی، انسان، کائنات، تقدیر اور وجود جیسے گہرے موضوعات کو بھی شاعری کا حصہ بنایا۔

فکری اعتبار سے غالب کے یہاں فلسفہ، تصوف، انسان دوستی، تجسس اور غور و فکر کی روایت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نئے زاویہ نظر فراہم کرتے ہیں۔

فنی اعتبار سے غالب سکی شاعری معنی آفرینی، تہہ داری، جدتِ خیال، نازک خیالی اور بلند تخیل کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے اشعار میں ایک ہی وقت میں متعدد معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے استعارے، تشبیہات، علامتوں اور تلمیحات کا نہایت مؤثر استعمال کیا ہے۔

غالب کا اندازِ بیان بھی منفرد ہے۔ ان کے یہاں سادگی اور پیچیدگی، جذبات اور فلسفہ، شونہ اور سنجیدگی ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ یہی فکری گہرائی اور فنی عظمت ان کی شاعری کو اردو ادب کا لازوال سرمایہ بناتی ہے۔

3۔ غالب سکی شاعری میں تصوف اور فلسفے کے عناصر پر بحث کیجیے۔

غالب سکی شاعری میں تصوف اور فلسفہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے وحدت الوجود، فنا و بقا، حقیقتِ ہستی، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق جیسے موضوعات پر گہرے انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے اشعار میں خدا، انسان اور کائنات کے رشتے پر مسلسل غور و فکر نظر آتا ہے۔

غالب رسمی تصوف کے بجائے فکری اور فلسفیانہ تصوف کے قائل تھے۔ وہ کائنات کے رازوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مختلف سوالات کے ذریعے حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے اشعار میں شک، تجسس، حیرت اور جستجو کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں انسان کی بے بسی، زندگی کی ناپائیداری، موت کی حقیقت اور وجود کے اسرار پر گہری سوچ ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر اور فلسفی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔

4۔ غالب کے اندازِ بیان، معنی آفرینی اور تہہ داری کی وضاحت کیجیے۔

غالب کا انداز بیان اردو شاعری میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان کی زبان نہایت دلکش، بلیغ اور معنی خیز ہے۔ انہوں نے الفاظ کے انتخاب، تراکیب کی جدت اور اظہار کی انفرادیت کے ذریعے اردو شاعری کو نئی شان عطا کی۔

معنی آفرینی غالب کے فن کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ وہ معمولی خیال کو بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اس میں نئے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے اشعار قاری کو بار بار پڑھنے اور نئے مفہیم تلاش کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

تہہ داری بھی ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ ان کا ایک شعر بیک وقت کئی سطحوں پر معنی پیدا کرتا ہے۔ ظاہری مفہوم کے علاوہ اس میں فلسفیانہ، نفسیاتی اور صوفیانہ معانی بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے اشعار کی نئی تشریحات آج بھی سامنے آرہی ہیں اور ان کا کلام ہر دور میں تازگی محسوس ہوتا ہے۔

5۔ اردو ادب میں غالب کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

مرزا غالب اردو ادب کے سب سے عظیم اور مؤثر شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو فکری بلندی، فلسفیانہ گہرائی اور معنوی وسعت عطا کی۔ ان کی شاعری نے اردو ادب کی روایت کو ایک نئی سمت دی اور آنے والے شعرا کے لیے نئے امکانات پیدا کیے۔

غالب صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مفکر، فلسفی اور بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ ان کے خطوط نے اردو نثر میں سادگی، بے تکلفی اور روانی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں عشق، تصوف، فلسفہ، طنز، مزاح اور انسانی تجربات کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو اردو ادب میں کم ہی نظر آتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ غالب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کے اشعار آج بھی علمی و ادبی حلقوں میں تحقیق و تنقید کا موضوع ہیں۔ ان کی تخلیقات اردو زبان و ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور وہ اردو شاعری کے نقطہ عروج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے غالب کو اردو ادب کا لازوال شاعر اور اردو غزل کا سب سے بڑا نمائندہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

15.8 جوابات سرگرمی

1. اسد

2. آگرہ

3. نجم الدولہ

4. اردوئے معلیٰ

5. تصوف

15.9 امدادی کتب

1. دیوانِ غالب ناشر رام نارائن لال بنی مادھوالہ آباد
2. غالب فکر و فن ڈاکٹر محمود الہی
3. یادگارِ غالب خواجہ الطاف حسین حالی
4. غالب کی شخصیت اور شاعری رشید احمد صدیقی
5. غالب اور آہنگِ غالب یوسف حسین خان
6. تذکرہ ماہ و سال مالک رام
7. شرح دیوانِ غالب یوسف سلیم چشتی

سبق نمبر ۱۶۔ حکیم مومن خان مومنؒ

ساخت

- 16.0 اغراض و مقاصد
- 16.1 تعارف
- 16.2 مومنؒ کی حیات اور غزل گوئی
- 16.2.0 اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
- 16.2.1 غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
- 16.2.2 وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
- 16.2.3 اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
- 16.2.4 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 16.3 عمومی جائزہ
- 16.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 16.5 فرہنگ
- 16.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 16.7 مشقی سوالات
- 16.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 16.8 جوابات سر گرمی
- 16.9 امدادی کتب

16.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو اردو کے ممتاز غزل گو شاعر محمد مومن خان مومن کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ مومن کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، علمی ذوق اور ان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ یہ جان سکیں گے کہ مومن صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ طب، علم نجوم، موسیقی اور شطرنج جیسے علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ آپ ان کی خودداری، قناعت پسندی اور آزاد مزاجی جیسی نمایاں شخصی خصوصیات سے بھی آگاہ ہوں گے۔ مزید یہ کہ آپ مومن کی غزل گوئی کے اہم اوصاف، ان کے اسلوب بیان، حسن و عشق کے موضوعات، جذبات کی لطافت، زبان کی سادگی اور شعری محاسن کا مطالعہ کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ مومن نے اردو غزل کو کس طرح نئے احساسات اور نفسیاتی باریکیوں سے مالا مال کیا۔

اس سبق کے ذریعے آپ مومن کے منتخب اشعار کی تفہیم، ان کے فکری و فنی پہلوؤں کے تجزیے اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا بہتر ادراک حاصل کر سکیں گے۔

16.1 تعارف

یہ سبق اردو ادب کے معروف شاعر محمد مومن خان مومن کی حیات، شخصیت، ادبی خدمات اور شاعرانہ خصوصیات سے متعلق ہے۔ مومن کا شمار اردو کے ان ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے غزل کو لطافتِ احساس، سادگی بیان اور عشق و محبت کے دلکش مضامین سے آراستہ کیا۔ مومن ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف شاعر تھے بلکہ طب، علم نجوم، موسیقی اور شطرنج جیسے علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں خودداری، قناعت، آزاد خیالی اور وطن دوستی جیسے اوصاف نمایاں تھے، جن کا عکس ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں نظر آتا ہے۔

مومن کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق اور حسن ہے۔ ان کی غزلوں میں محبت کے جذبات، انسانی احساسات، محبوب کی دلکشی اور عاشق کے داخلی تجربات نہایت خوبصورتی سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات سادگی، سلاست، دلکشی، نازک خیالی اور معنی آفرینی ہیں۔ اس سبق میں مومن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، ان کی علمی و ادبی خدمات اور شاعری کے نمایاں اوصاف کا جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ ان کے فن، فکر اور اردو ادب میں ان کی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ ان کا مطالعہ اردو غزل کی روایت اور اس کے ارتقا کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

16.2 مومن کی حیات اور شاعری

محمد مومن خان "مومن" اردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی ولادت 1800ء میں دہلی کے کوچہ چیلان میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام حکیم غلام نبی خان تھا جو ایک معزز اور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مومن کے دادا حکیم نامدار مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے درباری طبیب تھے اور انہیں جاگیر بھی عطا کی گئی تھی۔ مومن کے والد کو مشہور عالم دین مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے گہری عقیدت تھی، اسی نسبت سے ان کا نام "محمد مومن خان" رکھا گیا۔

مومن غیر معمولی ذہانت اور قوی حافظے کے مالک تھے۔ ابتدائی عمر ہی سے انہیں علم و ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے عربی، فارسی، طب، علم نجوم، موسیقی اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ شاعری کا شوق بھی بچپن سے تھا۔ ابتدا میں وہ اپنا کلام معروف شاعر شاہ نصیر کو دکھاتے تھے، لیکن جلد ہی ایسی صلاحیت پیدا کر لی کہ اپنے عہد کے صاحب طرز شاعر بن گئے۔

مومن نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں غزل، قصیدہ، رباعی، واسوخت، ترکیب بند اور مثنوی شامل ہیں، تاہم ان کی اصل شہرت غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے جذبات، حسن و جمال کی تصویریں، محبوب سے وابستہ احساسات اور انسانی نفسیات کی باریکیاں نہایت دلکش انداز میں بیان ہوئی ہیں۔

مومن کی شخصیت میں خودداری، قناعت اور آزادی فکر نمایاں تھی۔ وہ امراء اور حکمرانوں کی خوشامد سے نفرت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ کپور تھلہ نے انہیں اپنے دربار میں ملازمت کی پیشکش کی، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک گویے کی تنخواہ بھی ان کے برابر ہے تو انہوں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے سے ان کی خودداری اور وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاعری کے علاوہ مومن علم نجوم، طب، شطرنج اور رمل میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سال بھر کے نجومی حسابات ذہن میں محفوظ رکھتے تھے۔ اسی طرح شطرنج میں بھی ان کا شمار ماہر کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت نے انہیں اپنے دور کے ممتاز اہل علم میں شامل کر دیا تھا۔

مومن کا شمار مرزا غالب اور شیخ ابراہیم ذوق کے ہم عصروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کے عہد میں غالب جیسا عظیم شاعر موجود تھا، پھر بھی مومن نے اپنی منفرد شاعرانہ شناخت قائم رکھی۔ ان کے ایک مشہور شعر کے بارے میں روایت ہے کہ غالب نے کہا تھا کہ وہ اس شعر کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے کے لیے تیار ہیں:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی، سلاست اور دلکشی ہے۔ ان کے اشعار میں جذبات کی لطافت اور احساسات کی نزاکت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ عام الفاظ میں گہرے مفاہیم پیدا کرنے کا ہنر رکھتے تھے۔ عشق اور حسن کے موضوعات کو انہوں نے نہایت خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ پیش کیا۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

مومن نے چھ مثنویاں بھی تصنیف کیں جن میں "اسرارِ عشق" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں عشق کے مختلف تجربات اور جذباتی کیفیات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ناقدین کے مطابق مومن کی شاعری میں حسن بیان، لطافتِ احساس اور فنی پختگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جس زمانے میں مومن نے زندگی گزاری، وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ اس عہد کی تہذیبی رنگینیوں اور معاشرتی رویوں کے اثرات ان کی شاعری میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ جوانی میں وہ عشق و محبت کی رنگین دنیا سے وابستہ رہے، لیکن عمر کے آخری حصے میں ان کے کلام میں سنجیدگی اور فکری گہرائی زیادہ نمایاں ہو گئی۔

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

مومن 1851ء میں ایک حادثے کا شکار ہوئے۔ چھت سے گرنے کے باعث شدید زخمی ہوئے اور چند ماہ بعد انتقال کر گئے۔ ان کی وفات دہلی میں ہوئی۔ انہوں نے اردو ادب کو ایک ایسا شعری سرمایہ عطا کیا جو آج بھی غزل کے شائقین کے لیے باعثِ کشش ہے۔ مومن کی ادبی یادگاروں میں ان کا دیوانِ مومن اور متعدد مثنویاں شامل ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو لطافتِ احساس، سادگی بیان اور عشق کی نفسیاتی کیفیات سے مالا مال کیا۔ اسی وجہ سے انہیں اردو کے اہم ترین غزل گو شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا کلام آج بھی اپنی تازگی، دلکشی اور فنی حسن کے باعث اردو ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

16.2.0 غزل (اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا)

اثر	اس	کو	ذرا	نہیں	ہوتا
رنج	راحت	فزا	نہیں	ہوتا	

اس شعر میں شاعر محبوب کی بے حسی اور اپنی بے اثری کا شکوہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہماری آہ، ہماری تکلیف، ہمارا رنج محبوب پر ذرا بھی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ ہماری اذیت اس کے لیے کسی قسم کی راحت یا خوشی کا سبب بھی نہیں بنتی۔ یہاں عاشق کی انتہائی بے بسی سامنے آتی ہے کہ اس کی محبت، قربانی اور درد نہ تو محبوب کو نرم کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے دل میں کسی احساس کی لہر پیدا کرتے ہیں۔ رنج اور راحت کا باہمی تضاد شعر میں معنی کی گہرائی پیدا کرتا ہے۔ اثر نہ ہونا محبوب کی سنگ دلی کی علامت ہے، جبکہ راحت فزا نہ ہونا عاشق کی اس آرزو کی نفی ہے کہ شاید اس کی تکلیف محبوب کے دل کو چھو لے۔ شعر میں سادگی کے ساتھ شدید جذباتی کرب بیان ہوا ہے۔ مومن کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی پیچیدہ استعارے کے بغیر ایک تلخ حقیقت کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

بے	وفا	کہنے	کی	شکایت	ہے
تو	بھی	وعدہ	وفا	نہیں	ہوتا

اس شعر میں عاشق محبوب سے شکوہ کرتا ہے کہ تمہیں یہ گلہ ہے کہ میں تمہیں بے وفا کہتا ہوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ تم خود بھی تو اپنے وعدوں کو پورا نہیں کرتے۔ یہاں شاعر محبوب کی اخلاقی کمزوری کو نہایت نرم مگر فیصلہ کن انداز میں پیش کرتا ہے۔ وعدہ اور وفا عشق کے بنیادی ستون ہیں۔ وعدہ وفانہ ہونا محبوب کی بے اعتنائی اور غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔ شعر میں شکوہ بھی ہے اور منطق بھی۔ شاعر محبوب کے اعتراض کا جواب دلیل سے دیتا ہے، جذباتی شور سے نہیں۔ یہی مومن کے اسلوب کی خاص بات ہے کہ شکایت بھی شائستگی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

ذکر	اغیار	سے	ہوا	معلوم	
حرف	ناصح	برا	نہیں	ہوتا	

یہ شعر انسانی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب نصیحت دشمنوں یا غیروں کی زبان سے سننے میں آئی تو معلوم ہوا کہ نصیحت بذاتِ خود بری چیز نہیں ہوتی۔ اصل مسئلہ نصیحت کرنے والے کی نیت اور تعلق کا ہوتا ہے۔ ناصح عام طور پر عاشق کے لیے ناپسندیدہ کردار ہوتا ہے، مگر یہاں شاعر ایک متوازن رائے پیش کرتا ہے۔ اغیار سے ذکر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بات غیر جانبدار ہو گئی۔ اس شعر میں مومن کی فکری سنجیدگی اور اعتدال نمایاں ہے۔

کس کو ہے ذوق تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزا نہیں ہوتا

اس شعر میں شاعر زندگی اور عشق کے ایک اہم اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تلخی کسی کو پسند نہیں، مگر جدوجہد اور کشمکش کے بغیر بھی زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ تلخ کامی ناکامی اور تکلیف کی علامت ہے، جبکہ جنگ جدوجہد اور عمل کا استعارہ ہے۔ شاعر یہاں یہ فلسفہ پیش کرتا ہے کہ آسانی اور مکمل سکون زندگی کو بے مزہ بنا دیتے ہیں۔ یہ شعر عشق کے ساتھ ساتھ حیاتِ انسانی پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ مومن یہاں زندگی کو ایک متحرک تجربہ قرار دیتے ہیں، نہ کہ محض آسودگی کا نام۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

یہ شعر محرومی اور حسرت کا نہایت خوبصورت اظہار ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تم ہمارے ہو جاتے تو دنیا میں کوئی بھی چیز ناممکن نہ رہتی، مگر افسوس کہ تم کسی طرح ہمارے نہ ہو سکے۔ یہاں محبوب کا حاصل ہونا پوری کائنات کے حاصل ہونے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ مبالغہ عاشقانہ ہے مگر فطری لگتا ہے۔ شعر میں دنیا اور محبوب کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر عشق کی مرکزیت کو واضح کیا گیا ہے۔ یہی مومن کی عشقیہ شاعری کی جان ہے۔

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

اس شعر میں شاعر دل کی بے قدری اور اس کی ناقدری کا شکوہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب دل کو لے کر نہ جانے کیا کیا لے گیا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اب دل کسی کام کے قابل نہیں رہا۔ دل یہاں محض عضو نہیں بلکہ احساس، حوصلہ اور زندگی کی قوت کا استعارہ ہے۔ دل کا کسی کام کا نہ رہنا مکمل شکستِ باطن کو ظاہر کرتا ہے۔

امتحان کیجیے مرا جب تک
شوق زور آزما نہیں ہوتا

یہ شعر عاشق کے اعتماد اور عشق کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ جب تک میرا شوق پوری طرح آزمایا نہ جائے، اس کی اصل قوت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ شوق کو قوت اور طاقت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ امتحان عشق کی راہ کا لازمی مرحلہ ہے۔ یہ شعر عاشق کی خود اعتمادی اور عشق کی سچائی کا اعلان ہے۔ مومنؔ یہاں عشق کو کمزوری نہیں بلکہ طاقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تم	مرے	پاس	ہوتے	ہو	گویا
جب	کوئی	دوسرا	نہیں	ہوتا	

اس شعر میں شاعر تنہائی، یاد اور نفسیاتی قربت کی نہایت لطیف کیفیت بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب میں بالکل اکیلا ہوتا ہوں اور میرے پاس کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم میرے پاس موجود ہو۔ یعنی محبوب کی یاد اتنی شدید اور زندہ ہے کہ وہ خارجی موجودگی کا بدل بن جاتی ہے۔ یہ محض یاد نہیں بلکہ ایک داخلی حضوری (inner presence) ہے۔ عاشق کے شعور میں محبوب اس قدر رچ بس گیا ہے کہ تنہائی خلا نہیں رہتی بلکہ یاد سے بھر جاتی ہے۔ اس شعر کی اصل قوت اس کی سادگی اور سچائی میں ہے۔ ایک عام انسانی تجربے کو نہایت پاکیزہ اور موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ’گویا‘ کا لفظ یہاں نہایت اہم ہے یہ کیفیت خیال اور حسی وہم کو ظاہر کرتا ہے۔ شعر میں خاموش کیفیت نگاری اور نفسیاتی صداقت ہے۔ کوئی بھاری استعارہ نہیں مگر مکمل اثر یہ سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال ہے۔

حال	دل	یار	کو	لکھوں	کیوں	کر
ہاتھ	دل	سے	جدا	نہیں	ہوتا	

شاعر اظہارِ عشق کی مشکل کو ایک نہایت تخلیقی اور علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں محبوب کو اپنے دل کا حال کیسے لکھوں، جبکہ میرا ہاتھ دل سے جدا ہی نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا وجود اس قدر جذبے میں ڈوبا ہوا ہے کہ لکھنے والا ہاتھ بھی دل کے قبضے میں ہے۔ عقل اور تحریر جذبات سے الگ نہیں ہو پار ہے۔ یہاں لکھنا صرف خط لکھنا نہیں بلکہ اظہارِ حال ہے، اور دل و ہاتھ کا ایک ہو جانا جذبہ اور اظہار کی وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔

کیوں	سنے	عرض	مضطر	مومنؔ
صنم	آخر	خدا	نہیں	ہوتا

شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے مومن! محبوب تیری فریاد کیوں سنے آخر وہ خدا تو نہیں ہے۔ اس طرح پوری غزل کے عاشقانہ جوش کے بعد ایک حقیقت پسندانہ موڑ آتا ہے۔ یہ خود آگاہی کا لمحہ ہے جہاں شاعر عشق کی حد اور حقیقت دونوں کو پہچان لیتا ہے۔ صنم/خدا کا تقابل واضح صنعت تضاد ہے۔ خود خطاب سے خود کلامی پیدا ہوتی ہے۔ تخلص کے استعمال سے حسن تخلص اور فکری حسن اختتام پیدا ہوا۔

16.2.1 غزل (غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا)

غیروں	پہ	کھل	نہ	جائے	کہیں	راز	دیکھنا
میری	طرف	بھی	غمزہ	غماز	دیکھنا		

اس شعر میں شاعر عشق کی نہایت نازک اور خطرناک کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ذرا خیال رکھنا، کہیں ہمارے درمیان کارازا غیار پر ظاہر نہ ہو جائے، اور اگر دیکھنا ہی ہے تو اس انداز سے دیکھنا کہ وہ نگاہِ رمز آلود خاص طور پر میری طرف ہو۔ یہاں غمزہ غماز ایک ایسی نگاہ ہے جو خود ہی راز افشا کر دیتی ہے۔ عاشق کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ محبوب کی توجہ بھی حاصل رہے اور راز داری بھی مجروح نہ ہو۔ اس شعر میں راز عشق کی پوشیدگی، سماجی خوف اور محبوب کی نگاہ کی طاقت تینوں عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ غیر کا ذکر معاشرتی دباؤ اور رقابت کی علامت ہے، جبکہ غمزہ حسن کا وہ ہتھیار ہے جو خاموش ہو کر بھی بول اٹھتا ہے۔ شعر میں خطاب، تنبیہ اور التجا ایک ساتھ چلتے ہیں، جس سے عاشق کی بے چینی نمایاں ہو جاتی ہے۔ یہاں نگاہ کو زبان بنا دینا، اور نظر کو غماز کہنا تشبیہ و استعارہ کی خوبصورت مثال ہے، جس سے شعر میں لطافت اور نفسیاتی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔

اڑتے	ہی	رنگ	رخ	مرا	نظروں	سے	تھا	نہاں
اس	مرغ	پر	شکستہ	کی	پرواز	دیکھنا		

اس شعر میں شاعر اپنی شکستہ حالی اور کمزوری کو ایک نہایت بلیغ تمثیل کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جیسے ہی میں نے اڑنے کی کوشش کی، میرا رنگ و روپ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا؛ اب ذرا اس زخمی پرندے کی پرواز تو دیکھو۔ یہاں مرغ پر شکستہ عاشق کی علامت ہے، جو زخمی ہونے کے باوجود اڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

پرواز عام طور پر طاقت، آزادی اور بلندی کی علامت ہوتی ہے، مگر یہاں وہ کمزوری، ناتوانی اور ناکامی کا استعارہ بن گئی ہے۔ رنگ رخ کا نظروں سے چھپ جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عاشق کی ہستی اب نمایاں نہیں رہی، اس کی شناخت مٹی جا رہی ہے۔ شعر میں منظر نگاری بھی ہے اور درد کی تجسیم بھی۔ شکستہ پر کا تصور عاشق کی محرومی کو نہایت مؤثر انداز میں مجسم کرتا ہے، جبکہ دیکھنا کا صیغہ طنزیہ حسرت کو بڑھا دیتا ہے۔

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

یہ شعر عشق کی نفسیات کو بڑی نزاکت سے واضح کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی گالی یا سخت بات بھی میرے غمگیں مزاج پر بوجھ نہیں بنتی، مگر اے ہم نفس، اس کی آواز کی نزاکت تو دیکھو۔ یہاں عاشق کے لیے محبوب کی ہر اداء، خواہ وہ دشنام ہی کیوں نہ ہو، لطف اور تاثیر سے خالی نہیں۔ دشنام اور نزاکتِ آواز کا تضاد شعر میں حسن تضاد پیدا کرتا ہے۔ طبع حزیں عاشق کی مستقل ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے، جو محبوب کی سختی سے بھی بوجھل نہیں ہوتی۔ ہم نفس کا خطاب شعر کو مکالماتی بنا دیتا ہے، جیسے شاعر کسی قریبی ساتھی سے دل کی بات کہہ رہا ہو۔ آواز کی نزاکت یہاں محض صوتی خوبی نہیں بلکہ محبوب کی شخصیت کا سحر ہے، جو تلخ کلامی کو بھی قابل برداشت بنا دیتا ہے۔

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

اس شعر میں مومنؑ نے قسمت، حسد اور انسانی کمزوری کو ایک ساتھ سمو دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ذرا اپنا حال زار دیکھو کہ نجومی تک میرا رقیب بن گیا۔ جو میری قسمت کو سازگار بتاتا تھا، وہی اب ناساز طالع دکھانے لگا ہے۔ منجم تقدیر کا علم رکھنے والا ہوتا ہے، مگر یہاں وہ بھی رقیب بن کر سامنے آتا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ دنیا میں کوئی بھی غیر جانبدار نہیں رہتا۔ سازگار اور ناساز کا تضاد قسمت کی بے ثباتی کو ظاہر کرتا ہے۔ شعر میں طنز بھی ہے اور تلخی بھی۔ مومنؑ یہاں انسانی معاشرے کی اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ کامیابی یا محبت میں آدمی کے حامی بھی مخالف بن جاتے ہیں۔

بد کام کا مال برا ہے جزا کے دن
حالِ سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

یہ شعر اخلاقی اور فکری پہلو رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ برے کام کا انجام جزا کے دن برا ہی ہوتا ہے، ذرا آسمان کی کیفیت دیکھو کہ وہ کیسا تفرقہ ڈالنے والا ہے۔ یہاں سپہر یعنی آسمان کو فتنہ گراور انتشار کا سبب بتایا گیا ہے۔ مال اور جزا کے الفاظ شعر کو اخلاقی رنگ دیتے ہیں۔ یہ محض عشقیہ شعر نہیں بلکہ انجامِ عمل پر ایک تنبیہ ہے۔ سپہر کی تفرقہ اندازی تقدیر کی بے رحمی اور زمانے کی سازشوں کی علامت ہے۔ شعر میں حکمت بھی ہے اور شکوہ بھی، جو مومنؑ کے سنجیدہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

مت ر کھیو گرد تارکِ عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

اس شعر میں عاشقوں کی عظمت اور قربانی کو نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر محبوب کو خبردار کرتا ہے کہ عاشقوں کے سر پر قدم نہ رکھنا، کہیں کوئی سر بلند عاشق پامال نہ ہو جائے۔ تارکِ عشاق سرِ عاشق کا استعارہ ہے اور سرافراز اس عاشق کی علامت ہے جو عشق میں فنا ہو کر بھی سر بلند ہے۔ یہاں عاشق کی قربانی کو تقدس حاصل ہے۔ شعر میں نہایت لطیف تنبیہ، عظمتِ عشق اور عاشق کی خود داری تینوں عناصر جمع ہو گئے ہیں۔

میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

اس شعر میں محبوب کی بے رحمی اور عاشق کی بے بسی نمایاں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری حیران اور بے خود نگاہوں کا تماشا غیر کو دکھایا جاتا ہے، اور میری کمزوری پر ناز کے ساتھ ملامت کی جاتی ہے۔ نگاہِ خیرہ عاشق کی محبت میں کھو جانے کی علامت ہے۔ سرزنشِ ناز محبوب کی وہ خاص ادا ہے جس میں ملامت بھی لطف بن جاتی ہے۔ غیر کا شامل ہونا عاشق کے لیے ذلت اور دکھ کا باعث ہے۔ شعر میں نفسیاتی کرب اور جذباتی اذیت پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جہیم سے
مومنؔ غمِ مال کا آغاز دیکھنا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کو چھوڑ دینا بھی جہنم کی آگ سے کم نہیں، اے مومنؔ، اس انجام کے غم کا آغاز تو دیکھو۔ ترکِ صنم عشق کی آخری اور سب سے کڑی آزمائش ہے۔ سوزِ جہیم اس تکلیف کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ غمِ مال مستقبل کے دائمی دکھ کی طرف اشارہ ہے۔ شعر غزل کو ایک دردناک مگر فکری انجام تک پہنچاتا ہے، جہاں عشق کا اختتام بھی عذاب بن جاتا ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مطلع میں شاعر ماضی کے ایک بنیادی اور فیصلہ کن پہلو کو سامنے لاتا ہے۔ شاعر محبوب سے سوالیہ انداز میں پوچھتا ہے کہ وہ باہمی قرار، وہ باہمی عہد و پیمان جو ہمارے درمیان تھا، تمہیں یاد ہے یا نہیں؟ پھر اسی بات کو وضاحت کے ساتھ دہراتا ہے کہ مراد محض تعلق نہیں بلکہ وعدہ نباہ کرنے کا عہد تھا۔ اس تکرار میں صرف سوال نہیں بلکہ شکوہ، افسوس اور طنز بھی شامل ہے۔ ”تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو“ کی تکرار شعر میں ایک خاص موسیقیت بھی پیدا کرتی ہے اور محبوب کی بے اعتنائی کو مزید نمایاں کر دیتی ہے۔ شاعر براہ راست الزام نہیں لگاتا بلکہ سوال کی صورت میں پورا مقدمہ رکھ دیتا ہے، جو مومن کے نرم مگر گہرے اسلوب کی پہچان ہے۔

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس شعر میں شاعر اپنے اور محبوب کے یادداشت کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جو لطف، جو مہربانیاں، جو کرم میرے حال پر تھے، وہ سب مجھے ذرا یاد ہیں، مگر معلوم نہیں تمہیں یاد ہیں یا نہیں۔ یہاں عاشق کی وفا اور محبوب کی بے پروائی کا تقابل نہایت مؤثر انداز میں سامنے آتا ہے۔ عاشق کے لیے ہر چھوٹی بات بھی قیمتی ہے، جبکہ محبوب کے لیے وہی باتیں شاید غیر اہم بن چکی ہیں۔ شعر میں یاد کو محبت کی دلیل اور فراموشی کو بے وفائی کی علامت بنا دیا گیا ہے۔

وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ شعر ماضی کی محبت کی روزمرہ نزاکتوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ دلچسپ قصے اور ہر بات پر روٹھ جانا کیا یہ سب تمہیں یاد ہے یا نہیں؟ یہاں شاعر محبت کو کسی مثالی یا رومانوی تصور میں نہیں بلکہ اس کی عملی، انسانی اور روزمرہ صورت میں پیش کرتا ہے۔ گلہ، شکایت اور روٹھنا بظاہر منفی چیزیں ہیں، مگر یہاں وہ محبت کی تازگی اور قربت کی علامت بن جاتی ہیں۔ ”مزے مزے کی حکایتیں“ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ماضی کی تلخیاں بھی اب یادوں میں مٹھاس بن چکی ہیں۔

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیانِ شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس شعر میں شاعر محبت کے اس مرحلے کو بیان کرتا ہے جہاں اظہارِ عشق کھلے لفظوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ شاعر کہتا ہے کہ کبھی ہم سب کے درمیان روبرو بیٹھے ہوتے تھے اور اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہوتی تھی، مگر وہ شوق کا اظہار بالکل واضح تھا۔ یہاں اشارتوں کی گفتگو معاشرتی پابندیوں اور حیا کی علامت ہے، جبکہ بیانِ شوق کا برملا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ سچی محبت چھپائے نہیں چھپتی۔ شعر میں خاموشی کو زبان اور اشارے کو بیان بنا دیا گیا ہے، جو تجسیم اور لطیف معنوی صنعت کی خوبصورت مثال ہے۔

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بہ دم
گلہٗ ملامتِ اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس شعر میں شاعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب کبھی اتفاقاً ملاقات ہوتی تھی تو وفا کے دعوے کیے جاتے تھے، مگر ساتھ ہی قریبی لوگوں کی ملامت اور اعتراضات بھی سامنے آتے تھے۔ یہاں ”اتفاق سے“ ملاقات کی کمی اور مجبوری کو ظاہر کرتا ہے۔ وفا جتنا محبت کی سچائی کا اظہار ہے، جبکہ اقربا کی ملامت معاشرتی رکاوٹوں کی علامت ہے۔ شاعر اس شعر میں ذاتی محبت اور سماجی دباؤ کے ٹکراؤ کو نہایت سادہ مگر گہرے انداز میں پیش کرتا ہے۔

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ شعر محبوب کی نازک مزاجی اور عاشق کی قربانی کو نمایاں کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر کبھی کوئی بات تمہیں بری لگ گئی تو تم نے اظہار سے پہلے ہی اسے بھلا دیا یا شاید بھلا دینے کا دعویٰ کیا۔ یہاں ”بیاں سے پہلے ہی بھولنا“ محبوب کی انا اور خود پسندی کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کی بے نیازی کی طرف بھی۔ شعر میں ایک نرم سا طنز ہے، جو براہِ راست الزام نہیں بنتا مگر معنی پوری شدت سے پہنچا دیتا ہے۔

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ شعر تعلق کے زوال کی ایک مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کبھی ہمارے درمیان محبت بھی تھی، میل جول بھی تھا اور ہم ایک دوسرے کے شناسا بھی تھے کیا تمہیں یہ سب یاد ہے؟ چاہ، راہ اور آشتائینوں الفاظ تعلق کے مختلف درجوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تکرار سے ماضی کی گہرائی اور حال کی خالی پن نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ شعر محبت کے ختم ہو جانے کا نہیں بلکہ محبت کے بھلا دیے جانے کا نوحہ ہے۔

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے با وفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مقطع میں شاعر اپنا نام لے کر خود کو محبوب کے سامنے پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جسے تم کبھی آشنا اور وفادار کہا کرتے تھے، وہی میں ہوں جو آج بھی اسی محبت میں مبتلا ہے۔ یہ شعر پوری غزل کا خلاصہ ہے۔ یہاں خود شناسی، وفاداری اور محرومی ایک ساتھ جمع ہو جاتی ہیں۔ ”مبتلا“ کا لفظ عشق کی دائمی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ غزل ایک خاموش مگر گہرے درد کے ساتھ اختتام کو پہنچتی ہے۔

16.2.3 غزل (اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ)

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

اس شعر میں عاشق ایک نہایت دردناک اور نفسیاتی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ محبوب، جو اصل میں ظلم و بے وفائی کا مرتکب ہے، وہی الٹا عاشق سے شکوے کر رہا ہے، اور وہ بھی نہایت دلکش انداز کے ساتھ۔ یہاں شاعر نے انسانی رشتوں کی اس تلخ حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ طاقت و فریق اکثر مظلوم کو ہی قصور وار ٹھہرا دیتا ہے۔ محبوب کی ادا میں ایسی دلکشی ہے کہ شکوہ بھی دل آزار نہیں بلکہ زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ ”بے طاقی کے طعنے“ میں عاشق کی مجبوری، اس کی کمزوری اور اس کی یک طرفہ وابستگی کا اظہار ہے، جب کہ ”عذرِ جفا“ میں محبوب اپنی بے وفائی کو دلیلوں اور جواز کے پردے میں چھپاتا ہے۔ یہاں تضاد (شکوہ کرنے والا خود مجرم ہونا)، حسنِ تعلیل اور طنز کی ہلکی سی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ”اُلٹے“ کا لفظ پورے شعر کے معنوی نظام کو قائم کرتا ہے اور معنی میں تہہ داری پیدا کرتا ہے۔

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

اس شعر میں محبوب کی آمد کو زندگی کے بجائے موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بظاہر وہ عیادت کے لیے آیا ہے، مگر اس کی آمد میں ایسی سرد مہری اور بے نیازی ہے کہ عاشق کے لیے یہ زندگی بخش نہیں بلکہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ محبوب کی آواز سنتے ہی عاشق کا دم نکل جانا اس بات کی علامت

ہے کہ اس کی موجودگی خود ایک قیامت ہے۔ یہاں ”عمیادت“ اور ”قضا“ کا باہمی تضاد شعر کو انتہائی مؤثر بنا دیتا ہے۔ عمیادت کا مقصد شفا ہوتا ہے، مگر یہاں وہی عمیادت موت کا سبب بن جاتی ہے۔ مبالغہ، تضاد، اور استعاراتی اظہار اس شعر کو کلاسیکی غزل کا بہترین نمونہ بنا دیتے ہیں۔

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس شعر میں غیرت، حیا اور سماجی اقدار کی شکست کا نوچہ ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ محبوب کو غیر کے پاس بے پردہ بیٹھے دیکھنا اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ”اٹھ جاتے کاش“ میں موت کی تمنا اور شدید شرمندگی دونوں سمٹ آئی ہیں۔ یہاں ”پردہ“ صرف ظاہری نہیں بلکہ اخلاقی اور جذباتی پردے کی علامت بھی ہے۔ ”حیا کے ساتھ اٹھ جانا“ ایک تہذیبی تصور ہے جو اردو غزل کی روایت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو
کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

یہ شعر حسن محبوب اور فطرت کے حسن کے باہمی تعلق پر قائم ہے۔ شاعر کو شک ہے کہ کہیں محبوب باغ کی سیر کو گیا تو نہیں، کیونکہ صبا میں جو رنگ اور خوشبو ہے وہ غیر معمولی محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں محبوب کو لالہ رو کہنا تشبیہ بلیغ ہے، جب کہ صبا کو پیغام رساں بنا کر تشخیص پیدا کی گئی ہے۔ فطرت کو انسانی جذبات سے جوڑنا کلاسیکی غزل کی نمایاں روایت ہے۔

اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جاے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

شاعر محبوب کی گلی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہے اور کہتا ہے کہ یہ محض ایک گلی نہیں بلکہ جنت کے باغ جیسی جگہ معلوم ہوتی ہے۔ ”باغِ خلد“ جنت کی علامت ہے، اس لیے محبوب کا مسکن ایک روحانی اور ماورائی مقام بن جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ موت مجھے کہاں لا کر چھوڑ گئی یعنی میں تو مرنے جیسی کیفیت سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں اور اب جو منظر سامنے ہے وہ جنت جیسا ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ محبوب تک پہنچنا گویا مر کر جینا ہے ایک نئی سطح وجود میں داخل ہونا۔ حیرت، سرشاری اور روحانی مسرت تینوں کیفیتیں ایک ساتھ جمع ہیں۔ فنی طور پر محبوب کی گلی = باغِ خلد ایک واضح تشبیہ بلیغ اور مبالغہ ہے۔ موت کا یہاں پہنچانا ایک لطیف استعارۂ انقلابِ حال ہے۔ دنیاوی جگہ کو اخروی مقام میں بدل دینا کلاسیکی غزل کی روحانی پیکر تراشی کی خوبصورت مثال ہے۔

آتی ہے بوئے داغِ شبِ تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

اس شعر میں ہجر کی رات کا دردناک اور تاریک منظر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جدائی کی اندھیری رات میں زخموں کی بو محسوس ہوتی ہے گویا غم اتنا شدید ہے کہ اس کی مہک فضا میں پھیل گئی ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا سینہ قبا (کرتے) سمیت چاک ہو گیا ہو۔ یعنی غم نے اندر اور باہر دونوں کو پھاڑ دیا ہو۔ یہ داخلی کرب کی خارجی علامت بننے کا بیان ہے۔ ”بوئے داغ“ نہایت لطیف کنایہ اور حسی پیکر ہے۔

گلابنگ کس کا مشورہ قتل ہو گیا
کچھ آج بوئے خوں ہے وہاں کی ہوا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ آج فضا میں خون کی بو آرہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے قتل کا اعلان ہو گیا ہے۔ ”گلابنگ“ عام طور پر خوشی یا بلند آواز کے اعلان کے لیے آتا ہے، مگر یہاں اسے قتل کے مشورے سے جوڑ کر ایک الٹی اور خوفناک فضا پیدا کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کی بزم یا کوچہ عاشق کے لیے خطرے اور ہلاکت کی جگہ بن گیا ہے۔ گلابنگ اور قتل کا ساتھ آنا قوی تضاد پیدا کرتا ہے۔ بوئے خوں ایک حسی استعارہ ہے۔ آواز اور بود و مختلف حواس کو جمع کر کے شاعر نے حسی امتزاج (sensory fusion) پیدا کیا ہے، جو فنی طور پر بہت بلیغ ہے۔

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ میں محبوب کے دوبارہ آنے کے وعدے پر خوش تھا، مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میری پوری زندگی اسی بے وفا سے وابستہ ہو جائے گی۔ یعنی ایک وقتی وعدے کو میں نے معمولی سمجھا، مگر وہ میری تقدیر بن گیا۔ اس میں خود پر طنز بھی ہے اور تقدیر پر شکوہ بھی۔ عاشق کو اپنی جذباتی سرمایہ کاری کی قیمت اب سمجھ آرہی ہے۔

کوچہ سے اپنے غیر کا منہ ہے مٹا سکے
عاشق کا سر لگا ہے ترے نقشِ پا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ اگر محبوب چاہے تو اپنے کوچے سے غیروں کو ہٹا سکتا ہے، کیونکہ سچا عاشق تو پہلے ہی اپنا سر محبوب کے قدموں کے نشان سے لگا چکا ہے۔ یعنی اس نے انتہائی درجے کی عاجزی، سپردگی اور وفاداری اختیار کر لی ہے۔ سر کا قدموں سے لگنا فنا فی المحبوب کی کیفیت ہے یعنی اپنی انا کا خاتمہ۔ نقشِ پا تقدس اور مرکزیت کا استعارہ ہے۔ سر لگانا انتہائی عاجزی اور عشقانہ بندگی کی علامت ہے۔ شعر میں صوفیانہ رنگ اور استعارہ فنا موجود ہے۔

اللہ رے گر ہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پار سا کے ساتھ

مقطع میں شاعر خود پر طنز کرتا ہے کہ دیکھو کیسی گمراہی ہے۔ بت اور بت خانہ چھوڑ کر ایک پار سا کے ساتھ کعبے جا رہا ہوں۔ بظاہر یہ ہدایت کی راہ ہے، مگر شاعر اسے بھی طنزیہ انداز میں گمراہی کہتا ہے۔ اس میں مذہبی ظاہر داری، انسانی کمزوری، اور دل کی اصل وابستگی کے درمیان تضاد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ گویا دل ابھی بت (محبوب) کے ساتھ ہے، جسم کعبے کی طرف جا رہا ہے۔

16.2.4 سر گرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

ذیل کے جملوں میں خالی جگہیں پُر کیجیے:

1. حکیم مومن خان مومن کی پیدائش _____ میں ہوئی۔
2. مومن کے والد کا نام _____ تھا۔
3. مومن شاعری میں ابتدا میں اپنا کلام _____ کو دکھایا کرتے تھے۔
4. مومن کی یادگار تصنیف _____ ہے۔
5. مومن کی غزلوں کا بنیادی موضوع _____ اور عشق ہے۔

16.3 عمومی جائزہ

محمد مومن خان مومن اردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے لطیف جذبات، حسن و جمال کی دلکش تصویریں اور انسانی احساسات کی نفسیاتی کیفیتیں نہایت خوبصورتی سے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ مومن نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے بلکہ طب، علم نجوم، موسیقی اور شطرنج جیسے علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی زندگی خودداری، قناعت اور آزاد مزاجی کی عمدہ مثال تھی۔

مومنؑ کی غزلوں میں سادگی، سلاست، دلکشی اور نازک خیالی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے عشق کے مختلف جذبات اور وارداتِ قلبی کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا۔ ان کا کلام زبان کی لطافت، احساسات کی نزاکت اور فنی پختگی کے باعث اردو غزل کی روایت میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ مومنؑ نے اپنے مخصوص اسلوب اور شعری حسن کے ذریعے اردو ادب کو ایک گراں قدر سرمایہ عطا کیا جو آج بھی ادب کے طالب علموں اور شائقینِ ادب کے لیے باعثِ کشش ہے۔

16.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ محمد مومن خان مومنؑ کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے۔ آپ نے جانا کہ مومنؑ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر تھے جنہوں نے اپنی شاعری میں عشق و محبت، حسن و جمال اور انسانی جذبات کی نہایت لطیف اور دلکش عکاسی کی۔ آپ نے مومنؑ کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت اور ان کی علمی و فنی صلاحیتوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آپ نے یہ بھی جانا کہ مومنؑ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ طب، علم نجوم، موسیقی اور شطرنج جیسے علوم میں بھی غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ اس سبق کے ذریعے آپ مومنؑ کی شخصیت کے نمایاں اوصاف، مثلاً خودداری، قناعت، آزاد مزاجی اور وطن دوستی سے آگاہ ہوئے۔ آپ نے ان کی زندگی کے مختلف واقعات اور ان کی بلند ہمتی و خود اعتمادی کے نمونوں کا بھی مطالعہ کیا۔

آپ نے مومنؑ کی غزل گوئی کے اہم فنی اور فکری پہلوؤں کو سمجھا۔ ان کی شاعری میں عشق کی مختلف کیفیتوں، جذبات کی لطافت، زبان کی سادگی، بیان کی سلاست اور نازک خیالی کا جائزہ لیا۔ آپ نے یہ بھی سیکھا کہ مومنؑ نے اپنے تخلص کو کس خوبصورتی اور معنوی تنوع کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیا۔

مزید برآں آپ نے مومنؑ کے منتخب اشعار کا مطالعہ کیا اور ان کے اسلوبِ بیان، معنی آفرینی، جذباتی اثر انگیزی اور شعری حسن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سبق نے آپ کو اردو غزل کی کلاسیکی روایت میں مومنؑ کے مقام و مرتبے اور ان کی ادبی اہمیت کا ادراک عطا کیا۔

16.5 فرہنگ

لفظ	معنی
قناعت	تھوڑے پر راضی رہنے کی صفت
وجہہ	خوبصورت اور پُرکشش
منجم	علم نجوم کا ماہر
تقویم	سال بھر کے نجومی یا زمانی حسابات کا جدول

لفظ	معنی
واسوخت	شاعری کی ایک صنف جس میں محبوب سے بے رخی کا اظہار کیا جاتا ہے
وارداتِ قلبی	دل کی کیفیات اور جذبات
نازک خیالی	باریک اور لطیف احساسات کا اظہار
سلاست	روانی اور آسانی
خودداری	عزتِ نفس اور وقار
طبع آزمائی	کسی فن یا شعبے میں اپنی صلاحیت کا اظہار

16.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ محمد مومن خان مومن کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

2۔ مومن نے کن علوم و فنون میں مہارت حاصل کی؟

3۔ مومنؑ کی شخصیت کے نمایاں اوصاف بیان کیجیے۔

4۔ مومنؑ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟

16.7 مشقی سوالات

1. محمد مومن خان مومنؑ کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. مومنؑ کی غزل گوئی کے فنی اور فکری محاسن کا جائزہ لیجیے۔
3. مومنؑ کی شاعری میں عشق و محبت کے موضوعات کا مطالعہ کیجیے۔
4. مومنؑ کی شخصیت میں خودداری، قناعت اور آزاد مزاجی کے عناصر واضح کیجیے۔
5. اردو غزل کی روایت میں مومنؑ کے مقام و مرتبہ پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

1- محمد مومن خان مومن کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

محمد مومن خان مومن اردو کے ممتاز کلاسیکی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش 1800ء میں دہلی میں ہوئی۔ ان کا تعلق ایک علمی اور معزز خاندان سے تھا۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خان تھے جبکہ ان کے خاندان میں طب اور علم و فضل کی روایت موجود تھی۔ مومن نے عربی، فارسی، طب، علم نجوم، موسیقی اور شطرنج میں مہارت حاصل کی اور کم عمری ہی میں شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابتدا میں وہ اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے، لیکن جلد ہی اپنے منفرد اندازِ سخن کی بدولت ممتاز شاعر بن گئے۔ مومن خود دار، قانع اور آزاد مزاج انسان تھے۔ انہوں نے کبھی درباری شاعری یا خوشامد کو ذریعہٴ معاش نہیں بنایا۔ ان کی ادبی خدمات میں سب سے اہم ان کا "دیوانِ مومن" ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد مثنویاں بھی تصنیف کیں جن میں "اسرارِ عشق" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مومن نے اردو غزل کو لطافتِ احساس، نفسیاتی گہرائی اور زبان کی دلکشی عطا کی۔ ان کا شمار اردو کے اہم ترین غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔

2- مومن کی غزل گوئی کے فنی اور فکری محاسن کا جائزہ لیجیے۔

مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں عشق و محبت، حسن و جمال اور انسانی جذبات کا نہایت لطیف اظہار ملتا ہے۔ فکری اعتبار سے ان کی شاعری انسانی احساسات اور نفسیاتی کیفیات کی عکاس ہے۔ فنی اعتبار سے ان کی شاعری میں سادگی، سلاست، روانی، نازک خیالی اور معنی آفرینی نمایاں ہیں۔ ان کے اشعار میں جذبات کی صداقت اور زبان کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات کے بر محل استعمال نے ان کے کلام کو مزید مؤثر بنا دیا ہے۔

3- مومن کی شاعری میں عشق و محبت کے موضوعات کا مطالعہ کیجیے۔

عشق و محبت مومن کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کی غزلوں میں محبوب کی دلکشی، عاشق کی بے قراری، ہجر و وصال کی کیفیات اور محبت کے مختلف جذبات نہایت خوبصورتی سے بیان ہوئے ہیں۔

مومن عشق کو محض ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک مکمل نفسیاتی اور روحانی تجربہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں محبت کی نزاکت، دل کی کیفیت اور جذبات کی گہرائی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔

4- مومن کی شخصیت میں خودداری، قناعت اور آزاد مزاجی کے عناصر واضح کیجیے۔

مومن کی شخصیت میں خودداری اور قناعت نمایاں اوصاف تھے۔ وہ امراء اور حکمرانوں کی خوشامد کو ناپسند کرتے تھے۔ مہاراجہ کپور تھلہ کی ملازمت قبول نہ کرنے کا واقعہ ان کی خودداری کی بہترین مثال ہے۔

وہ محدود وسائل کے باوجود عزت نفس پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ آزاد مزاجی ان کی شخصیت کا اہم وصف تھا اور انہوں نے زندگی بھر اپنی خود مختاری اور وقار کو برقرار رکھا۔

5۔ اردو غزل کی روایت میں مومن کے مقام و مرتبہ پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

مومن اردو غزل کے اہم ترین کلاسیکی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق، حسن، جذبات اور انسانی نفسیات کا نہایت لطیف اور مؤثر اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو زبان کی سادگی، بیان کی لطافت اور احساسات کی گہرائی عطا کی۔ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر نے بھی مومن کے شعری کمال کا اعتراف کیا تھا۔ ان کی غزلیں آج بھی مقبول ہیں اور اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کا اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ مومن کا کلام اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے اور ان کا نام اردو غزل کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

16.8 جوابات سرگرمی

1. ۱۸۰۰ء، دہلی

2. حکیم غلام نبی خان

3. شاہ نصیر

4. دیوان مومن

5. حسن

16.9 امدادی کتب

1. دیوان مومن مع شرح مرتبہ ضیا احمد ضیا

2. مومن خان مومن خیات و شاعری پروفیسر نذیر احمد

3. انتخاب کلام مومن عبدالودود خان

4. مومن: شخصیت اور فن ظہیر احمد صدیقی

5. مومن خان مومن حیات اور مطالعاتی ترجیحات معید رشیدی

6. انشائے مومن ظہیر احمد صدیقی

سبق نمبر ۱۷۔ حسرت موہانی

ساخت

- 17.0 اغراض و مقاصد
- 17.1 تعارف
- 17.2 حسرت حیات اور غزل گوئی
- 17.2.0 دل کو خیال یار نے مغمور کر دیا
- 17.2.1 حُسنِ بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کر دیا
- 17.2.2 نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
- 17.2.3 چُپکے چُپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
- 17.2.4 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 17.3 عمومی جائزہ
- 17.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 17.5 فرہنگ
- 17.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 17.7 مشقی سوالات
- 17.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 17.8 جواباتِ سر گرمی
- 17.9 امدادی کتب

17.0 اغراض و مقاصد

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو مولانا حسرت موہانی کی زندگی، شخصیت، ادبی خدمات اور شاعرانہ عظمت سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ جان سکیں گے کہ حسرت موہانی اردو غزل کے ایک ممتاز شاعر، بلند پایہ صحافی، آزادی وطن کے مجاہد اور قومی رہنما تھے۔ اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ حسرت موہانی کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، سیاسی سرگرمیوں اور ادبی زندگی سے واقف ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ انہوں نے عشق و محبت کے روایتی مضامین کو کس طرح سادگی، خلوص اور فکری تازگی کے ساتھ پیش کیا۔ مزید یہ کہ آپ حسرت موہانی کی شاعری کے اہم فکری اور فنی پہلوؤں، مثلاً عشق، حسن پرستی، معاملہ بندی، حسن تغزل، فلسفہ عشق، زبان و بیان کی سادگی اور کلاسیکی روایت سے وابستگی کا مطالعہ کریں گے۔ آپ ان کی سیاسی جدوجہد، قومی شعور اور آزادی کی تحریک میں کردار کو بھی سمجھ سکیں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ حسرت موہانی کے منتخب اشعار کی تفہیم اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت حاصل کریں گے اور اردو غزل کی روایت میں ان کے مقام و مرتبے کا ادراک کر سکیں گے۔

17.1 تعارف

یہ سبق اردو کے ممتاز شاعر، صحافی، سیاست دان اور مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی کی زندگی اور ادبی خدمات سے متعلق ہے۔ حسرت موہانی اردو غزل کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے خلوص جذبات، سادگی بیان اور دل نشیں اسلوب سے نئی زندگی عطا کی۔

حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک طرف عشق و محبت کے شاعر تھے تو دوسری طرف آزادی وطن کے سرگرم علمبردار بھی تھے۔ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد، قید و بند، قومی خدمت اور ادبی سرگرمیوں سے عبارت ہے۔ ان کی شاعری میں محبت، وفا، ہجر و وصال، حسن و عشق اور انسانی جذبات کی نہایت مؤثر ترجمانی ملتی ہے۔

حسرت موہانی کی غزلوں کا سب سے نمایاں وصف ان کا خلوص اور سادگی ہے۔ ان کے اشعار براہ راست دل پر اثر کرتے ہیں اور قاری کو محبت اور انسان دوستی کے لطیف احساسات سے آشنا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کلاسیکی روایت اور انفرادی طرز احساس کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

اس سبق میں حسرت موہانی کی حیات، ادبی خدمات، شاعری کی نمایاں خصوصیات اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ ان کے فن اور شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور اردو غزل کی روایت میں ان کی اہمیت کا صحیح ادراک حاصل کر سکیں۔

17.2 حسرت کی حیات اور غزل گوئی

مولانا حسرت موہانی اردو ادب کے ان ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے شاعری، صحافت، سیاست اور قومی جدوجہد کے میدانوں میں یکساں شہرت حاصل کی۔ ان کا اصل نام سید فضل الحسن تھا اور شاعری میں حسرت مستخلص اختیار کیا۔ آپ 1875ء میں ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید اظہر حسین ایک معزز اور دیندار شخصیت تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے اور 1903ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم نامور اساتذہ سے حاصل کی جس کے نتیجے میں زبان و ادب پر انہیں غیر معمولی عبور حاصل ہوا۔

حسرت موہانی کو طالب علمی ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں اپنا کلام تسنیم لکھنوی کو دکھاتے تھے۔ جلد ہی ان کی شاعرانہ صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں اور وہ اردو غزل کے اہم شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ 1903ء میں انہوں نے ادبی اور سیاسی رسالہ "اردوئے معلیٰ" جاری کیا جو اردو صحافت کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔

حسرت موہانی محض شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سرگرم سیاسی کارکن بھی تھے۔ وہ سودیشی تحریک کے پر جوش حامی تھے اور زندگی بھر دیسی اشیاء کے استعمال پر زور دیتے رہے۔ انگریز حکومت کی مخالفت کے باعث انہیں متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ سیاسی جدوجہد، مالی مشکلات اور مسلسل قید و بند کے باوجود ان کی شاعری کا سفر جاری رہا۔ وہ آزادی وطن کے ساتھ ساتھ انسانی آزادی اور خودداری کے بھی علمبردار تھے۔

حسرت موہانی کو مذہبی وابستگی بھی حاصل تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں تیرہ مرتبہ حج ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں مذہبی عقیدت، قومی شعور اور عشقیہ جذبات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

حسرت موہانی کی شاعری

حسرت موہانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انہیں "رئیس المتغزلین" کا لقب بھی دیا گیا۔ ان کی شاعری کا مرکزی موضوع عشق و محبت ہے، لیکن یہ عشق محض جذباتی کیفیت نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک لطیف اور ہمہ گیر تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں محبت کی صداقت، خلوص، وفاداری، جدائی کا کرب اور وصال کی آرزو نہایت دلکش انداز میں بیان ہوئی ہے۔

حسرت کی شاعری کا سب سے نمایاں موضوع عشق ہے۔ ان کے اشعار میں محبوب کی یاد، انتظار، ملاقات اور جدائی کے مختلف احساسات بڑی سادگی اور اثر انگیزی کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کی غزلیں قاری کے دل میں براہِ راست اتر جاتی ہیں۔

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکوبا کر دیا

حسرت صرف عشقیہ جذبات کے شاعر نہیں بلکہ عشق کے فلسفی بھی ہیں۔ ان کے نزدیک عشق انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہے۔ وہ عشق کو زندگی کی ایک مثبت اور تعمیری قوت قرار دیتے ہیں۔

۔ دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

حسرت نے محبوب کے حسن، انداز، شرم، ادا اور نفسیاتی کیفیات کی نہایت خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ ان کی شاعری میں محبوب ایک جیتی جاگتی شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

۔ آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

حسرت کی شاعری میں معاملہ بندی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ عاشق اور محبوب کے درمیان پیش آنے والے واقعات، اشارے، کنایے اور جذباتی کیفیتیں بڑی فنی مہارت سے بیان ہوئی ہیں۔

۔ بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

حسرت کی غزلوں میں روانی، موسیقیت اور جذبے کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں تغزل کی وہ کیفیت موجود ہے جو قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

۔ تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

حسرت کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور دلکش ہے۔ انہوں نے مشکل تراکیب اور ثقیل الفاظ سے گریز کیا ہے۔ ان کا کلام سادگی کے باوجود معنوی گہرائی رکھتا ہے۔

سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت
نغز گوئی مرا شعار نہیں

حسرت نے میر، مصحفی، مومن اور غالب جیسے کلاسیکی شعرا سے فیض حاصل کیا، لیکن محض تقلید پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی انفرادی شناخت قائم کی۔ ان کے ہاں کلاسیکی روایت اور جدید احساسات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اگرچہ حسرت کی شہرت ایک عشقیہ شاعر کی حیثیت سے ہے، لیکن ان کی شاعری میں سیاسی شعور بھی نمایاں ہے۔ آزادی، حریت فکر اور قومی خودداری کے مضامین ان کے اشعار میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کہ ہم خدمتِ انگریز نہ کرتے

حسرت موہانی اردو غزل کے ان ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں تازگی، خلوص اور سادگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں عشق، حسن، انسانی جذبات، روحانیت اور قومی شعور کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ سادہ زبان، دلکش اسلوب، حسن تغزل اور جذبے کی سچائی ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت موہانی اردو غزل کی تاریخ میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ان کا کلام آج بھی ادب کے شائقین میں مقبول ہے۔

17.2.0	غزل (دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا)
دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا	
ساغر کو رنگہ بادہ نے پر نور کر دیا	

اس شعر میں عشق کی پہلی اور بنیادی واردات کو نہایت لطیف اور کلاسیکی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا محض خیال دل پر ایسا اثر ڈال گیا کہ دل گویا شراب کے نشے میں ڈوب گیا۔ یہاں مخموری کسی جسمانی نشے کا نام نہیں بلکہ وہ روحانی سرشاری ہے جو عشق کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسی کیفیت کو شراب اور ساغر کے پیکر میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جیسے شراب کا رنگ پیالے کو روشن اور تابناک بنا دیتا ہے، اسی طرح محبوب کے خیال نے دل کو نورانی کر دیا۔ دل کو ساغر اور خیال یار کو بادہ قرار دینا ایک مکمل استعاراتی نظام قائم کرتا ہے جو کلاسیکی غزل کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حال دل
پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

اس شعر میں انسانی دل کی نفسیاتی کیفیت کو نہایت سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دل کسی نہ کسی طرح خود کو تسلی دے کر سنبھالنے لگا تھا، غم کی شدت میں کچھ کمی آگئی تھی، مگر محبوب کی یاد نے آکر دل کو پھر اسی پرانی بے قراری اور اضطراب کی حالت میں پہنچا دیا۔ یہاں ”مانوس ہونا“ دل کی عارضی عادت کو ظاہر کرتا ہے، یعنی انسان دکھ کے ساتھ بھی جینا سیکھ لیتا ہے، مگر یادِ محبوب ایک ایسی قوت ہے جو اس عادت کو توڑ دیتی ہے۔ ”بدستور“ ماضی کے دکھ کی واپسی کا علامتی لفظ ہے، جو وقت کے غیر مؤثر ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس شعر میں یاد کو ایک فعال کردار دیا گیا ہے، جو انسانی کوششوں کو بے اثر کر دیتی ہے۔

گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ
لیکن ہجوم شوق نے مجبور کر دیا

یہ شعر عاشق کے باطن میں چلنے والی کشش کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاعر اعتراف کرتا ہے کہ اس میں فطری طور پر اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ محبوب کی حدود کو پامال کرے یا گستاخی کا مرتکب ہو، مگر عشق کی شدت اور جذبات کے ہجوم نے اسے بے اختیار کر دیا۔ ”گستاخ دستی“ ادب و احترام کی حد توڑنے کا کنایہ ہے، جب کہ ”ہجوم شوق“ عشق کی بے پناہ قوت کا نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ یہاں عاشق اپنی ذمہ داری سے انکار نہیں کرتا بلکہ یہ واضح کرتا ہے کہ عشق انسان کو اپنے اختیار سے باہر لے جاتا ہے۔

کچھ ایسی ہو گئی ہے تیرے غم میں مبتلا
گویا کسی نے جان کو مسحور کر دیا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے غم میں مبتلا ہو کر اس کی حالت ایسی ہو گئی ہے جیسے کسی نے اس کی جان پر سحر کر دیا ہو۔ یعنی نہ وہ آزاد ہے، نہ اس کیفیت سے نکل سکتا ہے۔ یہاں ”مسحور“ ہونا محض حیرت نہیں بلکہ مکمل گرفت، بے بسی اور جکڑے جانے کا استعارہ ہے۔ غم کو ایک زندہ اور طاقتور قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو جان پر قابض ہو جاتی ہے۔ تشبیہ، مبالغہ اور داخلی احساس کی شدت مل کر اس شعر کو نہایت اثر انگیز بنا دیتی ہے۔

بیتابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل
آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

شاعر کہتا ہے کہ دل کا جو راز چھپایا ہوا تھا، وہ بیتابی اور اضطراب کی شدت کے باعث ظاہر ہو گیا، حتیٰ کہ محبوب کے سامنے بھی اس کا ذکر ہو گیا۔ ”ماجرائے دل“ عشق کے تمام پوشیدہ جذبات کا کنایہ ہے، جب کہ ”بیتابیاں“ اس اضطراب کی علامت ہیں جو راز کو راز نہیں رہنے دیتی۔ یہاں اظہار اور اخفا کی کشمکش نمایاں ہے۔ شعر یہ بتاتا ہے کہ عشق میں ضبط کی حدیں آخر کار ٹوٹ ہی جاتی ہیں۔

اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار
یاں تک حجابِ نور نے مستور کر دیا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا حسن اس قدر تابناک اور روشن ہے کہ صاحبِ نظر لوگ بھی اس کے حقیقی خدو خال دیکھنے سے محروم رہ گئے۔ یہاں حسن خود پردہ بن گیا ہے۔ ”حجابِ نور“ ایک نہایت اعلیٰ درجے کا استعارہ ہے جو صوفیانہ تصور سے ہم آہنگ ہے، جہاں نور کی زیادتی بھی نظر کو محروم کر دیتی ہے۔ عام طور پر پردہ تاریکی سے بنتا ہے، مگر یہاں نور پردہ بن گیا ہے۔ یہی صنعتِ تضاد اور خیال کی ندرت اس شعر کو معنوی رفعت عطا کرتی ہے۔

حسرت بہت ہے مرتبہ عاشقی بلند
تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

شاعر اپنے تخلص کے ذریعے ایک تلخ سماجی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عاشقی کا مرتبہ بہت بلند اور قربانی طلب ہے، مگر زمانے نے اسے اس قدر سستا کر دیا ہے کہ لوگ بغیر کسی دکھ، بغیر کسی آزمائش کے خود کو عاشق کہلا کر مشہور ہو گئے ہیں۔ یہاں ”مفت مشہور“ ہونا یا کاری، سطحی جذبات اور جھوٹی محبت پر گہرا طنز ہے۔ شاعر حقیقی عشق کی عظمت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور زمانے کے بناوٹی معیار پر ضرب لگاتا ہے۔ اس شعر میں خود آگاہی، زمانہ شناسی اور اخلاقی تنقید یکجا ہو گئی ہے۔

17.2.1 حُسنِ بے پرواہ کو خود بین و خود آرا کر دیا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

اس شعر میں عاشق اپنی ہی خطا اور نادانی کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب کا حسن پہلے ہی بے پروا تھا، مگر میری طرف سے خواہشِ عشق کے اظہار نے اسے اور زیادہ خود پسند اور خود آرا بنا دیا۔ یعنی محبوب کو اپنی خوب صورتی اور قدر کا اور زیادہ احساس ہو گیا۔ یہاں ”حسنِ بے پروا“ محبوب

کے بے نیاز رویے کا استعارہ ہے، جب کہ ”خود بین و خود آرا“ خود پسندی اور ناز کی علامت ہیں۔ اظہارِ تمنا کو شاعر نے ایک ایسا عمل بنا کر پیش کیا ہے جو حسن کے غرور میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس شعر میں عاشق کی خود احتسابی، عشق کی نفسیات اور کلاسیکی تصورِ ناز و نیاز پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہیں۔

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکلیا کر دیا

یہ شعر عشق کی ایک بڑی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ عاشق یہ گمان کرتا تھا کہ محبوب سے ملاقات کے بعد دل کو قرار آجائے گا، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس نکلی۔ ملاقات نے بیتابی کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھا دیا۔ یہاں ”شکلیا کرنا“ صبر اور اطمینان کی علامت ہے، مگر عشق کی فطرت یہ ہے کہ قربت شوق کو اور تیز کر دیتی ہے۔

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کر دیا

اس شعر میں خط کو محض ایک کاغذ نہیں بلکہ جذبات کو بھڑکانے والی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا خط پڑھ کر دل پر ایسی کیفیت طاری ہوئی جیسے قیامت برپا ہو گئی ہو۔ ”اضطرابِ شوق“ ”عشق کی بے قابو کیفیت کا نہایت خوب صورت استعارہ ہے، جب کہ ”حشر برپا کرنا“ ”مبالغے کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس شعر میں عشق کی شدت، انتظار کی تڑپ اور محبوب کے الفاظ کی طاقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز
تجھ کو آخر آشنائے ناز بے جا کر دیا

اس شعر میں عاشق کی بے لوث خدمت اور محبوب کے رویے کی تبدیلی کا ذکر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم یہاں تک تمہاری خدمت اور عاجزی میں مشغول رہے کہ آخر کار تم ناز کرنے کے عادی ہو گئے، بلکہ یہ ناز بے جا ہو گیا۔ ”سرگرم نیاز“ ”عاشق کی خاکساری کا استعارہ ہے، جب کہ ”آشنائے ناز“ ”محبوب کی خود پسندی کی علامت ہے۔ اس شعر میں عشق کی قربانیوں کے منفی نتیجے کی طرف اشارہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی عاجزی محبوب کے غرور میں اضافہ کر دیتی ہے۔

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

اس شعر میں شاعر محبوب کی ایک نگاہ کے اثر کو مرکز بنا کر عشق کی بے قراری کی کیفیت بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب دل کو کسی حالت، کسی کروٹ، کسی پہلو میں قرار نصیب نہیں ہوتا۔ گویا باطنی سکون مکمل طور پر رخصت ہو چکا ہے۔ اس بے قراری کی واحد وجہ محبوب کی ”نگاہِ ناز“ ہے یعنی وہ نظر جس میں ادا، غرور، بے نیازی اور کشش سب شامل ہیں۔ شاعر حیرت کے انداز میں کہتا ہے کہ اس ایک نظر نے ایسا جادو کیا ہے کہ پورا داخلی نظام بدل گیا۔ یہاں عشق کو ایک نفسیاتی انقلاب کے طور پر دکھایا گیا ہے جہاں ایک لمحاتی تجربہ دیر پا اضطراب میں بدل جاتا ہے۔ ”نگاہِ ناز“ ایک جامع استعارہ ہے جو حسن، ادا اور بے پروائی کو سمیٹتا ہے۔ ”سحر“ (جادو) عشق کے غیر مرئی مگر طاقتور اثر کا استعارہ ہے۔ قرار / بے قراری کا تقابل تضاد کیفیت پیدا کرتا ہے۔ استغفہامی اندازِ تعجب شعر کی تاثیر بڑھاتا ہے۔

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

شاعر اس شعر میں عشق کی ارتقائی اور تخلیقی قوت کو بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارے عشق نے دلوں کے درجے اور مرتبے بلند کر دیے جو لوگ معمولی تھے وہ عظیم ہو گئے، جو کمزور تھے وہ وسیع ظرف بن گئے۔ ”ذروں کو مہر“ (سورج) اور ”قطروں کو دریا“ بنادینا اس بات کی علامت ہے کہ عشق انسان کی صلاحیتوں کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ یہ عشق کو ایک روحانی اور وجودی طاقت کے طور پر پیش کرتا ہے جو شخصیت کو وسعت دیتا ہے۔ ذرہ، مہر، قطرہ، دریا یہ سب علامتی استعارے ہیں اور باہم مل کر مراعات النظیر پیدا کرتے ہیں۔ معمولی کو عظیم بنادینا واضح مبالغہ ارتقا ہے۔

کیوں نہ ہو تیری محبت سے منور جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا کر دیا

شاعر یہاں محبت کے مثبت، روشن اور حیات بخش پہلو کو بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری محبت سے جان اور دل کار و روشن ہونا بالکل فطری بات ہے جیسے جب شمع جلتی ہے تو پورا گھر روشن ہو جاتا ہے۔ اس میں محبت کو روشنی، ہدایت اور حرارت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ شعر عشق کو محض اضطراب نہیں بلکہ نور اور آگہی کا ذریعہ بھی مانتا ہے۔ محبت = شمع اور دل = گھر ایک واضح اور خوبصورت تشبیہ ہے۔ روشنی، منوری، اجالا باہم مل کر مراعات النظیر پیدا کرتے ہیں۔ سادہ مثال سے گہرا مفہوم ادا کرنا سہل ممتنع کی خوبی ہے۔

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا

اس شعر میں شاعر اپنی بے دخلی کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے محبوب کی خاموش رضامندی پر دکھ کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی غیر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھے تمہاری محفل سے اٹھا دیتا مگر میں نے دیکھا کہ تم نے خود ہی اشارہ کر دیا تھا۔ یعنی اصل چوٹ رقیب سے نہیں بلکہ محبوب کی بے اعتنائی سے لگی۔ یہ خاموش اشارہ کھلے انکار سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ شعر میں تعلقات کی نزاکت اور غیر لفظی ابلاغ کی طاقت نمایاں ہے۔ ”اشارہ“ یہاں خاموش فیصلہ اور رد کا کنایہ ہے۔

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

اس شعر میں شاعر اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر ایک عام تصور کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگ کہتے تھے محبوب کی قربت اور لطف دل کو سکون دیتا ہے، مگر میرے معاملے میں اس نے تو درد اور بڑھادیا۔ یعنی قربت نے چین نہیں دیا بلکہ اضطراب کو دوگنا کر دیا۔ اس میں عشق کی پیچیدگی بیان ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ راحت نہیں دیتا کبھی قربت بھی کرب کا سبب بن جاتی ہے۔

17.2.2 غزل (نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اس شعر میں شاعر محبوب کی نگاہ کو غیر معمولی روحانی اور معنوی قوت عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب کی جس نظرِ خاص نے کسی کو رازِ عشق کا محرم بنالیا ہو، وہ شخص اپنی قسمت پر ناز کیوں نہ کرے۔ یہاں نگاہ محض دیکھنے کا عمل نہیں بلکہ انتخاب، قبولیت اور عطا کا استعارہ ہے۔ ”آشنائے راز“ ہونا عشق کے بلند ترین مرتبے کی علامت ہے، کیونکہ ہر شخص اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے دل کے بھید سونپے جائیں۔ ”خوبی قسمت“ تقدیر کے اس انتخاب کی طرف اشارہ ہے، جو بغیر کسی ظاہری سبب کے نصیب ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں حسنِ انتخاب، تقدیر پر ناز اور عشق کی عطائی فطرت نمایاں ہے۔

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے عشق کے جنون نے دلوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ یہاں، ”فکرِ دو عالم“ انسانی زندگی کی تمام مصلحتوں اور حساب کتاب کا جامع استعارہ ہے۔ ”جنوں“ کو ایسا جذبہ قرار دیا گیا ہے جو عقل، مفاد اور انجام کے سارے بندھن توڑ دیتا ہے۔ اسی لیے شاعر دعا دیتا ہے کہ خدا اس جنون کا سلسلہ دراز کرے، کیونکہ یہی کیفیت دل کو حقیقی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس شعر میں عشق کو نجات دہندہ قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہ شعر عشق اور عقل کے باہمی تصادم پر مبنی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے حسن کے کرشمے نے عقل کو جنون اور جنون کو عقل کا نام دے دیا ہے۔ یعنی جو چیز پہلے عقل سمجھی جاتی تھی وہ اب جنون کہلاتی ہے، اور جو جنون تھا وہی اصل دانائی بن گیا ہے۔ یہاں، ”خرد“ اور ”جنوں“ کا تبادلہ صنعتِ تضاد اور قلبِ معنی کی اعلیٰ مثال ہے۔ محبوب کے حسن کو، ”کرشمہ ساز“ کہا گیا ہے، یعنی وہ حقیقتوں کی تعریفیں بدل دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ شعر عشق کی اس فلسفیانہ جہت کو نمایاں کرتا ہے جہاں روایتی عقل ناکام اور عشق کی دیوانگی ہی اصل فہم بن جاتی ہے۔

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

اس شعر میں عاشق کا منفرد اور خوددار رویہ سامنے آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تمہارے ستم سے خوش ہوں، اس لیے کہ شاید یہی ظلم مجھے خاص اور منتخب لوگوں میں شامل کر دے۔ یہاں ستم کو عزت اور امتیاز کا ذریعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ”اربابِ امتیاز“ وہ لوگ ہیں جو عام عاشقوں سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں، کیونکہ ان پر محبوب کی خاص توجہ چاہے ظلم کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو پڑتی ہے۔ اس شعر میں عاشق کی انا، اس کی نفسیاتی برتری اور عشق میں درد کو فخر میں بدل دینے کا فن نمایاں ہے۔ یہ تصور کلاسیکی غزل کے اس رویے سے جڑا ہے جہاں محبوب کی بے رحمی بھی اعزاز بن جاتی ہے۔

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

شاعر اپنے تخلص کے ساتھ مکمل عاجزی اختیار کرتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ وہ محبوب کے کرم کے لائق نہیں، مگر اب آگے سب کچھ محبوب کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے کہ چاہے تو اسے سرفراز کرے یا نظر انداز۔ یہاں عاشق کی خود سپردگی، انکسار اور بے اختیاری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ”سرفراز کرنا“ محض عزت نہیں بلکہ قبولیت اور قرب کی علامت ہے۔ یہ شعر غزل کو ایک اخلاقی اور جذباتی انجام تک پہنچاتا ہے، جہاں عاشق کی ساری جدوجہد محبوب کی رضا پر ختم ہو جاتی ہے۔

17.2.3 غزل (چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے)

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

غزل کے مطلع میں شاعر یادوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ وہ خاموش، چپے ہوئے آنسوؤں کا ذکر کرتا ہے جو دن رات بہتے رہے، مگر کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ”چپکے چپکے“ میں عاشق کی تنہائی، اس کی شرم، اور اس کا ضبط سب سمٹ آئے ہیں۔ یہ آنسو محض غم کے نہیں بلکہ عشق کے ابتدائی اور خالص دور کی نشانی ہیں۔ ”وہ زمانا“ کہہ کر شاعر ماضی کو ایک مکمل عہد بنا دیتا ہے، جس میں دکھ بھی میٹھا تھا۔ یہاں یاد کو تسلسل، عشق کو عبادت اور آنسو کو خاموش زبان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

اس شعر میں عشق کے آغاز کی شدت بیان ہوئی ہے۔ ہزاروں اضطراب اور لاکھوں اشتیاق کی ترکیبیں مبالغے کے ذریعے عشق کی بے قراری کو وسعت دیتی ہیں۔ ”پہلے پہل“ عشق کی معصومیت، جھجک اور جوش کا استعارہ ہے۔ دل لگانا کوئی سادہ عمل نہیں بلکہ ایک زلزلہ ہے جس میں دل، ہوش اور سکون سب داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ شاعر یہاں ابتدائی عشق کی نفسیاتی کیفیت کو زندہ کر دیتا ہے، جہاں خوف اور کشش ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہ شوق کا
اور ترا غرنے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

یہ شعر عاشقانہ شرارت اور بصری تعلق کی خوبصورت تصویر ہے۔ بار بار نگاہ اٹھنا شوق کی بے اختیاری کو ظاہر کرتا ہے۔ ”آنکھیں لڑانا“ محض دیکھنا نہیں بلکہ خاموش مکالمہ ہے، جس میں خواہش، دعوت اور انکار سب شامل ہیں۔ ”غرفہ“ محبوب کی دوری اور بلند مقام کی علامت ہے، جسے نگاہ کا رابطہ پل بنا دیتا ہے۔

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

اس شعر میں قربت کے ساتھ پیدا ہونے والی بے تکلفی بیان ہوئی ہے۔ شاعر اعتراف کرتا ہے کہ محبوب سے ذرا سی ملاقات ہی اسے بے باک بنا دیتی تھی۔ محبوب کا دانتوں میں انگلی دبانا ناز، شرارت اور ہلکے سے احتجاج کا مرکب اشارہ ہے۔ یہ منظر عشق کے اس مرحلے کو ظاہر کرتا ہے جہاں جھجک ختم اور اپنائیت پیدا ہو چکی ہے۔ اس شعر میں جسمانی حرکت کو علامتی اور تہذیبی دائرے میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے، جو کلاسیکی غزل کا خاص وصف ہے۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

یہاں پردہ حیا اور معاشرتی پابندی کی علامت ہے۔ عاشق کا پردہ کھینچ لینا بے ساختہ جذبے کی علامت ہے اور محبوب کا فوراً دوپٹے سے منہ چھپانا شرم اور ناز کا حسین امتزاج۔ ”دفعتاً“ لمحے کی اچانک شدت کو نمایاں کرتا ہے۔ اس شعر میں حرکت، رد عمل اور جذبات تینوں ایک فریم میں قید ہیں، جو اسے نہایت بصری اور جاندار بنا دیتا ہے۔

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانہ یاد ہے

یہاں شاعر محبت بھرے شکوے اور نرم فخر کے انداز میں ماضی یاد دلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب تمہارا واحد دیوانہ میں ہی تھا کوئی دوسرا شریکِ عشق نہ تھا۔ اب محبوب سے پوچھتا ہے کہ کیا تمہیں بھی وہ زمانہ یاد ہے؟ ”کارِ خانا“ یہاں عشق کی پوری دنیا ملاقاتیں، باتیں، منصوبے، سازشیں، وعدے سب کا استعارہ ہے۔

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اس شعر میں محبوب کی بے ساختہ محبت اور عملی قربانی کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ تیز دھوپ، جلتا وقت اور ننگے پاؤں آنا یہ سب تکلیف کے استعارے ہیں مگر محبوب ان سب کی پروا کیے بغیر عاشق کی آواز پر چلا آتا ہے۔ اس سے محبت کی شدت اور ترجیح ظاہر ہوتی ہے کہ جسمانی راحت عشق کے سامنے بے معنی ہو جاتی ہے۔ دھوپ، ننگے پاؤں، کوٹھال کر قوی تصویریں پیکر بناتے ہیں۔

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

اس شعر میں شاعر یادِ مقام (memory of place) کے نفسیاتی اثر کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے جس جگہ چوری چھپے آکر ملا کرتے تھے، وہ مقام آج بھی پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے، حالانکہ اس واقعے کو گزرے مدتیں بیت چکی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق میں جگہیں محض جغرافیائی نقطے نہیں رہتیں بلکہ جذباتی ذخیرے بن جاتی ہیں۔ محبوب کی موجودگی نے اس مقام کو تقدس اور معنی عطا کر دیے، اس لیے وقت گزرنے کے باوجود وہ یاد سے محو نہیں ہوا۔ یاد یہاں محض ذہنی نہیں بلکہ جذباتی اور حسی تجربہ ہے جیسے منظر ابھی آنکھوں کے سامنے ہو۔ ”چوری چوری“ رازداری، خطرہ اور لطف تینوں مرکب کیفیت پیدا کرتا ہے۔

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

شاعر ایک خاص لمحے کو یاد کر رہا ہے جب محبوب کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی اور وہ بے دست و پا یعنی وقتی طور پر بے بس تھا۔ اس حالت میں عاشق کا شوخی سے چھیڑنا اور ہنسنا ایک زندہ اور متحرک منظر بناتا ہے۔ یہ عشق کا وہ رخ ہے جو المیہ اور اضطراب سے ہٹ کر قربت، مانوسیت اور کھیل پن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں جسمانی قربت نہیں بلکہ جذباتی بے تکلفی اور اعتماد جھلکتا ہے۔ یاد کا انتخاب بھی معنی خیز ہے عاشق کو بڑے وعدے نہیں بلکہ چھوٹے زندہ لمحے یاد ہیں۔

باوجود ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

شاعر نہایت جرات مندانہ خود احتسابی سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ میں پرہیزگاری اور تقویٰ کا دعویٰ کرتا ہوں، مگر سچ یہ ہے کہ ہوس اور جذباتی لغزش کے دنوں کا وہ قصہ آج بھی یاد ہے۔ یہاں شاعر ریاکارانہ پاکیزگی کا نقاب نہیں پہنتا بلکہ انسانی کمزوری کا اعتراف کرتا ہے۔ یہی سچائی شعر کو اخلاقی گہرائی دیتی ہے۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان کی شخصیت یک رنگ نہیں اس میں تقویٰ بھی ہے اور خواہش بھی اور یادوں کو محفوظ رکھتی ہے۔ غزل جو ابتدا میں پاکیزہ یادوں سے شروع ہوئی تھی، آخر میں انسانی سچائی پر ختم ہوتی ہے۔

17.2.4 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

ذیل کے جملوں میں خالی جگہیں پُر کیجیے:

1. مولانا حسرت موہانی کا اصل نام _____ تھا۔
2. حسرت موہانی نے _____ میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔
3. حسرت موہانی کے ادبی رسالے کا نام _____ تھا۔
4. حسرت موہانی کو _____ کا لقب دیا گیا۔
5. حسرت موہانی کی شاعری کا بنیادی موضوع _____ ہے۔

17.3 عمومی جائزہ

مولانا حسرت موہانی اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، صحافی، سیاست دان، مجاہد آزادی اور مذہبی رہنما تھے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت، حسن و جمال، وفا، ہجر و وصال اور انسانی جذبات کی نہایت مؤثر ترجمانی ملتی ہے۔ حسرت نے کلاسیکی غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے سادگی، خلوص اور دلکشی سے آراستہ کیا۔ ان کی زبان سادہ، اسلوب دل نشیں اور اظہار نہایت مؤثر ہے۔ ان کی شاعری میں حسن تغزل، معاملہ بندی، عشق کی لطافت اور انسانی احساسات کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ سیاسی جدوجہد اور قومی شعور نے بھی ان کی شخصیت اور شاعری کو منفرد رنگ عطا کیا۔

17.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ مولانا حسرت موہانی کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے۔ آپ نے جانا کہ حسرت موہانی اردو غزل کے ممتاز شاعر، معروف صحافی، مجاہد آزادی اور قومی رہنما تھے۔

آپ نے ان کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، سیاسی سرگرمیوں، صحافتی خدمات اور آزادی کی تحریک میں کردار کا مطالعہ کیا۔ آپ نے یہ بھی جاننا کہ انہوں نے قید و بند، مالی مشکلات اور سیاسی جدوجہد کے باوجود ادب اور شاعری کی خدمت جاری رکھی۔ اس سبق کے ذریعے آپ حسرت موہانی کی شاعری کے مختلف فکری اور فنی پہلوؤں سے آگاہ ہوئے۔ آپ نے سیکھا کہ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے، لیکن اس عشق میں خلوص، وفاداری، حسن پرستی، انسانی جذبات اور روحانی بالیدگی کے عناصر بھی شامل ہیں۔ آپ نے حسرت کی شاعری میں حسن تغزل، معاملہ بندی، فلسفہ عشق، محبوب کی نفسیات کی عکاسی، سادگی زبان اور دلکشی بیان کا مطالعہ کیا۔ آپ یہ بھی سمجھ سکے کہ حسرت نے کلاسیکی شعری روایت کو نئے انداز سے پیش کیا اور اردو غزل کو مزید وسعت بخشی۔ مزید برآں آپ ان کی شاعری کے سیاسی شعور، قومی احساس اور آزادی وطن کے جذبے سے بھی واقف ہوئے۔ اس سبق نے آپ کو حسرت موہانی کے مقام و مرتبہ اور اردو غزل میں ان کی خدمات کا ادراک کرنے میں مدد فراہم کی۔

17.5 فرہنگ

لفظ	معنی
سودیش	دلی اشیاء کے استعمال کی تحریک
تغزل	غزل کی لطافت اور حسن
معاملہ بندی	عاشق و محبوب کے تعلقات اور واقعات کی شاعرانہ تصویر کشی
تتبع	پیروی یا اتباع
خندہ پیشانی	خوش دلی اور خوش مزاجی سے حالات کا سامنا کرنا
وجد	روحانی سرشاری کی کیفیت
رعنائی	خوب صورتی اور دلکشی
شکلیا	صبر کرنے والا
احتجاج	مخالفت یا مزاحمت کا اظہار

17.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. مولانا حسرت موہانی کا اصل نام کیا تھا اور وہ کب پیدا ہوئے؟

8 حسرت موہانی کی سیاسی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

3 حسرت موہانی کی شاعری کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

4 حسرت موہانی کی شاعری میں حسن تغزل کی وضاحت کیجیے۔

5 حسرت موہانی کی زبان و بیان کی خصوصیات بیان کیجیے۔

17.7 مشقی سوالات

1. مولانا حسرت موہانی کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. حسرت موہانی کی شاعری کے نمایاں فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔
3. حسرت موہانی کی شاعری میں عشق و محبت کے تصور پر بحث کیجیے۔
4. حسرت موہانی کے اسلوب بیان اور حسن تغزل کی وضاحت کیجیے۔
5. اردو غزل کی روایت میں حسرت موہانی کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

1- مولانا حسرت موہانی کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

مولانا حسرت موہانی اردو ادب کے ممتاز شاعر، صحافی، سیاست دان اور مجاہد آزادی تھے۔ ان کا اصل نام سید فضل الحسن تھا اور شاعری میں حسرت تخلص اختیار کیا۔ آپ 1875ء میں قصبہ موہان، ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور بعد ازاں علی گڑھ سے 1903ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی نامور اساتذہ سے حاصل کی جس سے ان کے علمی اور ادبی ذوق کو جلا ملی۔

حسرت موہانی شروع ہی سے ادب اور سیاست دونوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے 1903ء میں "اردوئے معلیٰ" کے نام سے ایک ادبی و سیاسی رسالہ جاری کیا جو اردو صحافت میں اہم مقام رکھتا ہے۔ آزادی وطن کی تحریک میں بھرپور حصہ لینے کے باعث انہیں متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنے نظریات سے دست برداری اختیار نہیں کی۔

ادبی اعتبار سے حسرت موہانی اردو غزل کے ممتاز شاعر ہیں۔ انہیں "رئیس المتغزلین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے، لیکن اس میں خلوص، صداقت، حسن پرستی اور انسانی جذبات کی گہری عکاسی بھی ملتی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور دلکش ہے۔

حسرت موہانی نے اردو غزل کو تازگی، سادگی اور جذبے کی سچائی عطا کی۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت اور جدید احساسات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اردو ادب، صحافت اور قومی تحریک میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

2- حسرت موہانی کی شاعری کے نمایاں فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔

حسرت موہانی کی شاعری فکری اور فنی دونوں اعتبار سے بلند مقام رکھتی ہے۔ فکری لحاظ سے ان کی شاعری کا محور عشق و محبت ہے۔ وہ محبت کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں خلوص، وفاداری، ایثار اور جذبہ محبت کی پاکیزہ صورتیں نمایاں ہیں۔ حسرت کی شاعری میں عشق کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، روحانی بالیدگی، اخلاقی اقدار اور آزادی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ ان کے بعض اشعار میں سیاسی شعور اور قومی احساسات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

فنی اعتبار سے ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی زبان ہے۔ ان کے اشعار میں بناوٹ اور تصنع نہیں پایا جاتا۔ وہ عام الفاظ میں گہرے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ حسن تغزل، معاملہ بندی، روانی، موسیقیت اور دلکشی ان کے فن کے نمایاں اوصاف ہیں۔

حسرت نے محبوب کی نفسیات، عشق کی کیفیات اور انسانی جذبات کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار میں جذبے کی صداقت اور احساس کی گہرائی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ یہی فکری اور فنی خوبیاں انہیں اردو غزل کے اہم ترین شاعروں میں شامل کرتی ہیں۔

3- حسرت موہانی کی شاعری میں عشق و محبت کے تصور پر بحث کیجیے۔

حسرت موہانی کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے۔ ان کے نزدیک عشق زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور انسان کی روحانی و جذباتی ضرورت ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق کی مختلف کیفیات، جیسے محبت، انتظار، ہجر، وصال، امید، محرومی اور وفاداری کی نہایت خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔

حسرت کے ہاں عشق محض وقتی جذبہ نہیں بلکہ ایک دائمی اور پاکیزہ احساس ہے۔ وہ محبت کو انسانی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں محبوب کی یاد، اس کے حسن کا تذکرہ، ملاقات کی خواہش اور جدائی کا کرب بڑے مؤثر انداز میں بیان ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کے ساتھ خلوص اور سچائی کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کا عاشق وفادار، باوقار اور ثابت قدم ہے۔ عشق کی یہی پاکیزگی اور سادگی ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔

حسرت عشق کو روحانی بلندی کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت انسان کے دل کو نرم، حساس اور انسان دوست بناتی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں عشق ایک مثبت اور تعمیری قوت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

4۔ حسرت موہانی کے اسلوب بیان اور حسن تغزل کی وضاحت کیجیے۔

حسرت موہانی کا اسلوب بیان اردو شاعری میں اپنی سادگی، روانی اور اثر آفرینی کے باعث منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے مشکل الفاظ اور پیچیدہ تراکیب سے گریز کرتے ہوئے سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی۔ ان کے اشعار براہ راست دل پر اثر کرتے ہیں اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ان کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت خلوص اور سچائی ہے۔ وہ اپنے جذبات کو بناوٹ اور تصنع کے بغیر بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ شائستگی اور لطافت بھی پائی جاتی ہے۔

حسن تغزل ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ ان کے اشعار میں محبت، حسن، وفا اور جذباتی کیفیتوں کا نہایت دلکش اظہار ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں موسیقیت، روانی اور جذباتی ہم آہنگی قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

محبوب کے حسن، اس کی اداؤں، شرم و حیا اور نفسیاتی کیفیات کی جو تصویر کشی حسرت نے کی ہے وہ اردو غزل کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہی حسن تغزل اور دلکش اسلوب انہیں اردو غزل کا ممتاز شاعر بناتا ہے۔

5۔ اردو غزل کی روایت میں حسرت موہانی کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

حسرت موہانی اردو غزل کی روایت کے ایک اہم اور ممتاز شاعر ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئے احساسات اور تازگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں میر، مصحفی، مومن اور غالب کی روایت کے اثرات ضرور ملتے ہیں، لیکن انہوں نے اپنی انفرادی شناخت بھی قائم کی۔

حسرت موہانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عشق و محبت کے مضامین کو خلوص، سادگی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا۔ ان کے اشعار میں جذبے کی سچائی اور احساس کی گہرائی موجود ہے۔ انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایت کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اردو غزل میں ان کا مقام اس لیے بھی اہم ہے کہ انہوں نے حسن تغزل، معاملہ بندی، محبوب کی نفسیات اور عشقیہ جذبات کی عکاسی میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا۔ ان کی شاعری میں سادگی اور فنی پختگی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ادبی حلقوں میں انہیں "رئیس المتغزلین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جو ان کی غزل گوئی کے اعلیٰ مقام کا اعتراف ہے۔ ان کی شاعری آج بھی اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ اور شائقین ادب میں یکساں مقبول ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ احترام اور عقیدت کے ساتھ لیا جائے گا۔

17.8 جوابات سرگرمی

1. سید فضل الحسن

2. 1903ء

3. اردوئے معلیٰ

4. رئیس المتغزلین

5. عشق و محبت

17.9 امدادی کتب

1. کلیات حسرت موہانی

2. انتخاب کلام حسرت موہانی

3. حسرت موہانی حیات و خدمات

4. مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت

5. حسرت کی شاعری

6. انتخاب کلام حسرت موہانی

مرتبہ کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور

مرتبہ خلیق انجم

شاہد مابلی

سید محمد اصغر کاظمی

ڈاکٹر یوسف حسین

مرتبہ محمد رضا انصاری

سبق نمبر ۱۸۔ علی سکندر جگر مراد آبادی

ساخت

- 18.0 اغراض و مقاصد
- 18.1 تعارف
- 18.2 علی سکندر جگر مراد آبادی کی حیات اور غزل گوئی
- 18.2.0 دل کو سکون، روح کو آرام کر گیا
- 18.2.1 کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ گل و خار پر
- 18.2.2 اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
- 18.2.3 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 18.3 عمومی جائزہ
- 18.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 18.5 فرہنگ
- 18.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 18.7 مشقی سوالات
- 18.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 18.8 جوابات سر گرمی
- 18.9 امدادی کتب

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو جگر مراد آبادی کی زندگی، شخصیت، ادبی خدمات اور شاعری کے نمایاں فنی و فکری پہلوؤں سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ جان سکیں گے کہ جگر مراد آبادی اردو غزل کے ایک نہایت مقبول اور مؤثر شاعر تھے جنہوں نے اپنی شیریں بیانی، حسن تغزل اور نغمگی کے ذریعے اردو شاعری کو نئی دلکشی عطا کی۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ جگر مراد آبادی کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، ادبی سفر اور ان کے عہد کے ادبی ماحول سے واقف ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ جگر نے عشق و محبت، حسن، جذباتِ انسانی، روحانیت اور زندگی کے مختلف تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اردو غزل کی روایت کو کس طرح مضبوط کیا۔

مزید یہ کہ آپ جگر کی شاعری کی اہم خصوصیات، مثلاً حسن تغزل، نغمگی، سادگی زبان، جذبے کی صداقت، رومانیت اور اثر آفرینی کا مطالعہ کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ان کی اہم تصانیف اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے سے بھی آگاہ ہوں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ جگر مراد آبادی کے منتخب اشعار کی تفہیم اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت حاصل کریں گے اور اردو غزل کی روایت میں ان کی اہمیت کا بہتر ادراک کر سکیں گے۔

18.1 تعارف

یہ سبق اردو کے ممتاز شاعر جگر مراد آبادی کی زندگی، شخصیت، ادبی خدمات اور شاعرانہ خصوصیات سے متعلق ہے۔ جگر مراد آبادی بیسویں صدی کے ان نامور شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اردو غزل کو حسن تغزل، موسیقیت اور جذباتی گہرائی سے مالا مال کیا۔ ان کی شاعری عشق و محبت، حسن و جمال، انسانی جذبات اور روحانی کیفیات کی خوبصورت ترجمان ہے۔

جگر مراد آبادی ایک ایسے شاعر تھے جن کی آواز اور اندازِ بیان نے مشاعروں کی دنیا میں انہیں غیر معمولی مقبولیت عطا کی۔ ان کے اشعار میں سوز و گداز، خلوصِ محبت، جذبے کی شدت اور زبان کی شیرینی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری دل کی وارداتوں کا ایسا آئینہ ہے جس میں محبت کے مختلف رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔

جگر کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ حقیقتِ زندگی کا شعور بھی موجود ہے۔ ان کے کلام میں عشق محض ایک جذبہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر انسانی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار عام قاری سے لے کر اہل ادب تک سب کو متاثر کرتے ہیں۔

اس سبق میں جگر مراد آبادی کی زندگی، ان کی ادبی خدمات، شاعری کی نمایاں خصوصیات اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ ان کے فن اور شخصیت کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں اور اردو غزل کی ترقی میں ان کے کردار کا صحیح ادراک حاصل کر سکیں۔

18.2 جگر مراد آبادی کی حیات اور شاعری

اردو غزل کی تاریخ میں چند ایسے شعرا گزرے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص اندازِ فکر، حسنِ تغزل اور نغمہ نگاری کے ذریعے عوام اور خواص دونوں کے دلوں میں مستقل جگہ بنائی۔ ان ہی ممتاز شعرا میں جگر مراد آبادی کا نام نہایت احترام اور محبت سے لیا جاتا ہے۔ جگر مراد آبادی بیسویں صدی کے ان مقبول ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اردو غزل کو ایک نئی رعنائی، موسیقیت اور جذباتی گہرائی عطا کی۔ ان کی شاعری عشق و محبت، انسانی جذبات، روحانیت، درد و غم اور زندگی کے تجربات کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

جگر مراد آبادی کا اصل نام علی سکندر تھا اور "جگر" ان کا تخلص تھا۔ چونکہ وہ اتر پردیش کے شہر مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے مراد آبادی کہلائے۔ ان کی ولادت 6 اپریل 1890ء کو ہوئی۔ ان کے والد مولوی علی نظر خود ایک شاعر تھے اور چچا مولوی علی ظفر بھی شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ اسی ادبی ماحول نے جگر کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

جگر ابھی کم عمر ہی تھے کہ والد کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے۔ اس حادثے نے ان کی زندگی کو مشکلات سے دوچار کر دیا، لیکن ان کی فطری ذہانت اور ذوقِ ادب نے انہیں مایوس نہ ہونے دیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی جہاں اردو اور فارسی زبانوں کی تعلیم پائی۔ بعد ازاں ان کا رجحان شاعری کی طرف بڑھتا گیا۔ شاعری میں ان کے ابتدائی استاد سر رامپوری تھے جن کی رہنمائی نے جگر کے شعری ذوق کو جلا بخشی۔

جگر مراد آبادی کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے، لیکن ان کے ہاں عشق صرف جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک روحانی اور انسانی تجربہ بھی بن جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں محبت کی لطافت، جدائی کا درد، وصال کی آرزو اور انسانی احساسات کی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار میں ایسی موسیقیت اور ترنم پایا جاتا ہے جو سامع اور قاری دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشاعروں میں ان کی غزلیں بے حد پسند کی جاتی تھیں۔

جگر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت حسنِ تغزل ہے۔ ان کے اشعار میں نرمی، سلاست، دلکشی اور جذبات کی سچائی پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، رواں اور دل نشین ہے۔ وہ مشکل الفاظ یا پیچیدہ تراکیب کے بجائے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو براہِ راست دل پر اثر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق، حسن، شراب، رندی اور روحانیت کے مضامین بڑی خوبصورتی سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

جگر مراد آبادی اپنی جوانی میں مے نوشی کے لیے بھی مشہور تھے، لیکن عمر کے آخری حصے میں انہوں نے اس عادت سے توبہ کر لی۔ ان کی زندگی کے اس تجربے نے ان کی شاعری میں ایک خاص روحانی رنگ پیدا کر دیا۔ ان کے بعد کے کلام میں اخلاقی اور روحانی عناصر زیادہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

جگر کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ حقیقت نگاری بھی ملتی ہے۔ معروف نقاد آل احمد سرور کے مطابق:

"جگر ایک رومانی شاعر ہیں۔ رومان کسی نہ کسی حقیقت کو خوابوں میں پیش کرتا ہے۔ جگر کے یہاں بھی خواب اور حقیقت کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔"

یہ رائے جگر کی شاعری کے مزاج کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے، کیونکہ ان کے ہاں تخیل اور حقیقت دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

جگر مراد آبادی کے کئی اشعار عوام میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ان کا یہ شعر اردو شاعری کے مقبول ترین اشعار میں شمار ہوتا ہے:

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اس شعر میں عشق کی دشواریوں اور اس کے ہمہ گیر تجربے کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جگر کی اہم تصانیف میں داغ جگر (1922ء)، شعلہ طور اور آتش گل شامل ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ کلیات جگر کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں ان کی غزلیں، نظمیں، قطعات اور دیگر شعری تخلیقات شامل ہیں۔ ان کی شاعری کو ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی اور انہیں اردو غزل کے صفِ اول کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جگر مراد آبادی کا انتقال 9 ستمبر 1960ء کو ہوا، لیکن ان کی شاعری آج بھی اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں عشق کی وارفتگی، جذبات کی صداقت، زبان کی شیرینی اور موسیقیت کا ایسا امتزاج موجود ہے جو انہیں اردو غزل کے بڑے شاعروں کی صف میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جگر مراد آبادی اردو غزل کے ایک عظیم شاعر تھے جنہوں نے اپنے منفرد اسلوب، حسن تغزل، رومانیت اور نغمگی کے ذریعے اردو شاعری کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ ان کا کلام آج بھی ادب کے شائقین کے دلوں میں اسی طرح زندہ ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھا۔

دل کو سکون روح کو آرام آ گیا
موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا

اس شعر میں شاعر نے محبوب کے پیغام کو موت کے مترادف قرار دے کر عشق کی انتہائی کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ عام تصور میں موت خوف، اضطراب اور جدائی کا استعارہ ہے، مگر یہاں شاعر کے لیے موت بھی راحت کا پیغام بن گئی ہے۔ محبوب کا پیغام ایسا سرور اور تسکین لے کر آیا ہے کہ دل کو سکون اور روح کو آرام نصیب ہوا۔ اس میں عشق کی وہ کیفیت جھلکتی ہے جہاں عاشق کے لیے زندگی اور موت کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔

جب کوئی ذکر گردشِ ایام آ گیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آ گیا

یہ شعر عاشق کی نفسیاتی وابستگی کو نمایاں کرتا ہے۔ زمانے کی گردش، حالات کے نشیب و فراز کا ذکر آتے ہی شاعر کی زبان پر محبوب کا نام خود بخود آ جاتا ہے۔ گویا زندگی کے تمام تجربات محبوب سے جڑ چکے ہیں۔ محبوب اب صرف ایک فرد نہیں بلکہ وقت، تقدیر اور حالات کا استعارہ بن چکا ہے۔

غم میں بھی ہے سرور وہ ہنگام آ گیا
شاید کہ دور بادۂ گلفام آ گیا

یہاں شاعر غم اور سرور کے امتزاج کو پیش کرتا ہے۔ غم کی حالت میں بھی ایک عجیب سی خوشی ہے، ایک نشہ ساطاری ہے۔ شاعر اس کیفیت کو شرابِ گلفام کے دور سے تشبیہ دیتا ہے۔ گویا عشق کا غم بھی سرمستی عطا کرتا ہے۔ یہ وہ صوفیانہ اور رومانوی کیفیت ہے جہاں درد بھی لطف بن جاتا ہے۔

دیوانگی ہو عقل ہو امید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آ گیا

یہ شعر فلسفیانہ رنگ رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چاہے دیوانگی ہو یا عقل، امید ہو یا مایوسی اصل چیز وہی ہے جو وقتِ ضرورت کام آ جائے۔ عشق میں کوئی کیفیت مطلق نہیں، سب کچھ حالات کے تابع ہے۔ یہ شعر زندگی اور عشق دونوں پر صادق آتا ہے۔ یہاں تضاد، جامعیت اور تجربے کی چٹنگی نمایاں ہے۔ شاعر ایک عملی سچائی کو شعری پیرائے میں پیش کرتا ہے۔

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سو بار حسن پر بھی یہ الزام آ گیا

اس شعر میں ناصح یعنی نصیحت کرنے والے کی ناکامی بیان ہوئی ہے۔ دل کے معاملات میں عقل اور نصیحت ہار جاتی ہے۔ اگرچہ الزام محبوب کے حسن پر آتا ہے، مگر حقیقت میں عاشق خود اس کا اسیر ہے۔ حسن کو قصور وار ٹھہرانا عشق کی قدیم روایت ہے۔ اس شعر میں طنز کی ہلکی سی جھلک، عاشقانہ خود فریبی اور حسن کی بالادستی نمایاں ہے۔

صیاد شادماں ہے مگر یہ تو سوچ لے
میں آ گیا کہ سایہ دام آ گیا

یہ شعر شکار اور شکاری کے کلاسیکی استعارے پر مبنی ہے۔ صیاد یعنی محبوب خوش ہے کہ شکار پھنس گیا، مگر شاعر خبردار کرتا ہے کہ میں خود نہیں آیا بلکہ جال کا سایہ مجھ پر پڑا ہے۔ گویا گرفت ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ اس میں عاشق کی خودداری، رمزیت اور فکری گہرائی موجود ہے۔

دل کو نہ پوچھ معرکہ حسن و عشق میں
کیا جانے غریب کہاں کام آ گیا

یہاں عشق اور حسن کو دو متحارب قوتوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور دل ان کے درمیان پس کر رہ گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دل کا حال مت پوچھو، معلوم نہیں وہ کہاں اور کیسے کام آ گیا۔ بے بسی، حیرت اور داخلی انتشار اس شعر کا مرکزی جذبہ ہے۔

یہ کیا مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آ گیا

یہ شعر عاشق کے احساسِ جرم اور خود احتسابی کا مظہر ہے۔ شاعر کو حیرت ہے کہ عشق کے دعوے کے باوجود اب محبوب کے بغیر بھی چین آ جاتا ہے۔ وہ اس کیفیت کو عشق کے مقام کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس میں محبت کی سچائی کا کرب اور بدلتی ہوئی کیفیات کا اعتراف موجود ہے۔ سوالیہ انداز شعر میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔

احباب مجھ سے قطع تعلق کریں جگر
اب آفتاب زیت لب بام آ گیا

جگر اپنے انجام کا اعلان کرتے ہیں۔ زندگی کا سورج اب ڈھلنے کو ہے، لب بام کا مطلب ہے زوال کی دہلیز۔ شاعر کہتا ہے کہ دوستوں کا ساتھ چھوٹ جانا فطری ہے کیونکہ اب زندگی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس شعر میں وقت، فنا، تنہائی اور خود آگاہی کا گہرا احساس ہے۔

18.2.1 غزل (کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ گل و خار پر)

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

اس شعر میں شاعر نے اپنے وجود اور حق محبت کو فطرت کے استعارے میں بیان کیا ہے۔ شاخ، سبزہ، برگ، غنچہ، گل اور خار یہ سب زندگی، حسن، رعنائی اور تکلیف کے مختلف مظاہر ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں باغ میں کسی بھی حالت، کسی بھی مقام پر رہوں، بہار پر میرا حق مسلم ہے۔ یعنی خوشی، حسن اور فیضانِ محبت صرف مخصوص حالات یا مقامات کے محتاج نہیں۔ یہ شعر عاشق کے اس شعوری یقین کو ظاہر کرتا ہے کہ عشق میں دکھ، کانٹے اور محرومیاں بھی اسی طرح قابل قبول ہیں جیسے گل و غنچہ۔

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہ ہی آشیاں مری ملکیت یہ ہی چار پر

شاعر کہتا ہے کہ چاہے غصے میں مجھے دھمکیاں دی جائیں یا بار بار بجلیاں گریں، مجھے کوئی خوف نہیں۔ میرا آشیانہ ہی میری سلطنت ہے اور یہی چار پر (چار تنکے) میری ملکیت ہیں۔ یہ فقر و استغنا کی وہ کیفیت ہے جو عشق حقیقی یا سچے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ شاعر مادی اقتدار کے مقابل روحانی خود کفالت کو ترجیح دیتا ہے۔

جنہیں کہئے عشق کی وسعتیں جو ہیں خاص حسن کی عظمتیں
یہ اسی کے قلب سے پوچھے جسے فخر ہو غم یا پر

اس شعر میں شاعر عشق اور حسن کی حقیقت کو تجربے سے جوڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عشق کی وسعتیں اور حسن کی عظمتیں وہی سمجھ سکتا ہے جسے غم یار پر فخر ہو۔ یعنی جس نے محبوب کے غم کو ذلت نہیں بلکہ اعزاز سمجھا ہو۔ یہ شعر عشق کی داخلی تطہیر اور روحانی بلندی کو واضح کرتا ہے۔ غم یار یہاں کمزوری نہیں بلکہ امتیاز ہے۔ فخر، قلب، وسعت اور عظمت جیسے الفاظ عشق کو ایک اخلاقی و روحانی قدر بنا دیتے ہیں۔

مرے اشکِ خوں کی بہار ہے کہ مرقعِ غم یار ہے
مری شاعری بھی نثار ہے مری چشمِ سحر نگار پر

یہ شعر جگر کی شاعری کے فنی اور جذباتی سرچشمے کو ظاہر کرتا ہے۔ اشکِ خوں یعنی خون کے آنسو یہ عشق کی انتہا کا استعارہ ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ یہی آنسو میری بہار ہیں اور یہی غم یار کا مرقع (تصویری مجموعہ) ہیں۔ اس کی شاعری بھی انہی آنسوؤں کی نذر ہے اور اس کی آنکھ، جو سحر نگار ہے، اسی غم کو حسن میں بدل دیتی ہے۔

عجب انقلابِ زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

یہ شعر وقت کی بے ثباتی اور حالات کی الٹ پھیر کا گہرا احساس رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زمانہ کیسا عجیب انقلاب لایا ہے جو سر کبھی محبوب کی گود میں تھا، آج وہی بوجھ بن چکا ہے۔ مختصر فسانہ کہہ کر شاعر اپنی پوری زندگی کی کہانی سمیٹ دیتا ہے۔ یہاں ماضی و حال کا تضاد، حسرت، زوال اور انسانی بے بسی نمایاں ہے۔ زانوئے یار سے دوشِ باریک کا سفر عشق کی الم ناک داستان بیان کرتا ہے۔

یہ کمالِ عشق کی سازشیں یہ جمالِ حسن کی نازشیں
یہ عنایتیں یہ نوازشیں مری ایک مشتِ غبار پر

شاعر خود کو ایک مشتِ غبار یعنی حقیر ذرہ سمجھتا ہے، مگر عشق اور حسن کی عنایتیں اسی پر نچھاور ہیں۔ یہاں عاشق کی عاجزی اور محبوب کے حسن کی فیاضی ایک ساتھ جلوہ گر ہے۔ سازشیں، نازشیں، عنایتیں اور نوازشیں یہ سب الفاظ عشق کے پیچیدہ مگر دلکش نظام کو ظاہر کرتے ہیں۔

مری سمت سے اے صبا یہ پیامِ آخرِ غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

یہاں شاعر صبا کو بیامبر بنا کر محبوب تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جا کر میرا آخری غم سنا دے اور یہ بھی دکھا دے کہ خزاں اپنی بہار پر ہے۔ یعنی ظاہری بہار کے باوجود اندر زوال چھپا ہے۔ یہ شعر ظاہر و باطن کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ خزاں کا بہار پر ہونا ایک نہایت بلیغ علامت ہے۔ تشخیص، رمزیت، استعارہ اور داخلی کرب اس شعر کو فکری سطح پر بلند کرتے ہیں۔

یہ فریبِ جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بے خبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انہیں چند نقش و نگار پر

اس شعر میں شاعر حسنِ ظاہری کے فریب سے خبردار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب جلوے محض فریب ہیں، ڈر یہ ہے کہ بے خبر دل کہیں ان چند نقش و نگار پر ہی ٹھہر نہ جائے۔ یہاں عشق کی بصیرت اور حسن کی سطحیت کے درمیان کشمکش ہے۔ شاعر گہرے جوہر کے بجائے ظاہری حسن پر رک جانے کو خطرہ سمجھتا ہے۔

میں رہیں درد سہی مگر مجھے اور چاہئے کیا جگر
غم یار ہے مرا شیفۃ میں فریفتہ غم یار پر

شعر میں جگر اپنے عشق کا حتمی اعلان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اگرچہ درد کا قیدی ہوں، مگر مجھے اس کے سوا اور چاہیے ہی کیا؟ میں غم یار کا دیوانہ ہوں اور اسی پر فریفتہ ہوں۔ یہاں عشق اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ قناعت، وارفتگی، خود سپردگی اور عشق کی معراج اس شعر کو اختتامیہ و قار عطا کرتی ہیں۔

18.2.2 غزل (اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں)

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

اس شعر میں شاعر عشق کی اصل حقیقت کو توفیقِ الہی سے وابستہ کرتا ہے۔ وہ واضح کرتا ہے کہ محض انسانی کوشش، عقل یا ارادے سے عشق کی منزل حاصل نہیں ہوتی جب تک خدا کی جانب سے توفیق نہ ہو۔ یہاں ”فیضانِ محبت“ سے مراد محبت کا ظاہری اثر، جذبہ یا کیفیت ہے جو بظاہر بہت سے لوگوں کو نصیب ہو جاتی ہے، مگر ”عرفانِ محبت“ یعنی محبت کی باطنی معرفت، اس کا شعور، اس کی روحانی معنویت ہر ایک کے حصے میں نہیں

آتی۔ اس شعر میں عشق کو محض جذباتی تجربہ نہیں بلکہ ایک روحانی عطیہ قرار دیا گیا ہے۔ تضاد کے ذریعے معنی کو گہرا کیا گیا ہے: فیضان عام ہے مگر عرفان خاص۔ یہ تضاد عشق مجازی اور عشق حقیقی کے فرق کو بھی نمایاں کرتا ہے اور صوفیانہ فکر کی جھلک دیتا ہے۔

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں فیاضی قدرت عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر کیا چیز ہے جو انعام نہیں

شاعر کہتا ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ قدرت کی فیاضی عام نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان میں فکر اور نظر کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو انعام نہ ہو۔ یہاں شاعر انسانی ناشکری اور فکری سطحیت پر تنقید کرتا ہے۔ ”فکر و نظر“ عقل اور بصیرت دونوں کا مجموعہ ہے، اور ”انعام“ پوری کائنات کے فیوض و برکات کا استعارہ۔ یہ شعر شکر، معرفت اور کائناتی حسن کے ادراک کی دعوت دیتا ہے، اور استغفہامیہ انداز سے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

یارب یہ مقام عشق ہے کیا گو دیدہ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں آرام ہے اور آرام نہیں

یہ شعر عشق کی پیچیدہ اور paradoxical (متضاد) کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ شاعر بارگاہ الہی میں عرض کرتا ہے کہ عشق کی یہ کیسی منزل ہے جہاں آنکھ اور دل بظاہر ناکام نہیں، مگر پھر بھی مکمل سکون حاصل نہیں ہوتا۔ تسکین بھی ہے اور نہیں بھی، آرام بھی ہے اور بے قراری بھی۔ یہ تضاد عشق کے اس باطنی تجربے کو ظاہر کرتا ہے جہاں لذت اور اذیت، سکون اور اضطراب ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل الجھ جاتی ہے مگر دل زندہ ہو جاتا ہے۔ صنعت تضاد یہاں نہایت فنی حسن کے ساتھ استعمال ہوئی ہے اور عشق کو ایک ایسی کیفیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو عام انسانی پیمانوں میں نہیں سما سکتی۔

کیوں مستِ شرابِ عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں

اس شعر میں شاعر اہل عیش و طرب سے شکوہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ عیش و عشرت کی شراب میں مست ہیں وہ کسی کی طرف توجہ کیوں کریں گے؟ ان کے لیے دل کے ٹوٹنے کی آواز کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ وہ اسے جام کے ٹوٹنے کی آواز نہیں سمجھتے۔ یہاں دل اور جام کا تقابل نہایت معنی خیز ہے۔ جام ٹوٹے تو محفل میں ہلچل مچ جاتی ہے، مگر دل ٹوٹے تو کوئی پروا نہیں کرتا۔ یہ شعر معاشرتی بے حسی، سطحی خوشی اور حقیقی انسانی دکھ کی ناقدری کو علامتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ استعارہ، تقابل اور طنز تینوں عناصر ایک ساتھ موجود ہیں۔

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

یہ شعر عشق کے بنیادی اصول کو بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر محبوب کی محفل میں آنا ہے تو اپنی خودی، انا اور پندار کو توڑ کر آؤ۔ یہاں عقل و ہوش کی کوئی وقعت نہیں۔ عشق کی دنیا میں عقل نہیں، سرسپردگی چلتی ہے۔ ”پندارِ خودی“ انسانی انا کا استعارہ ہے جو عشق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ شاعر عقل پرستی کو چیلنج کرتا ہے اور عشق کو ایک ایسی کیفیت قرار دیتا ہے جہاں خود کو مٹا دینا ہی اصل شعور ہے۔

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
مے کش یہی اب تک سمجھے تھے شائستہ دورِ جام نہیں

اس شعر میں زاہد اور مے کش کے روایتی تضاد کو نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زاہد نے بھی ایسی ادا سے شراب پی کہ ساقی کی نگاہیں اس پر ٹھہر گئیں۔ مے کشوں کو تو یہی گمان تھا کہ زاہد شائستگی سے جام گردش میں نہیں آنے دیتا۔ یہاں زہد کی ریاکاری اور باطنی کمزوری پر طنز کیا گیا ہے۔ زاہد جو بظاہر پرہیزگار ہے، اندر سے وہی خواہش رکھتا ہے جسے وہ برا کہتا ہے۔

عشق اور گوارا خود کر لے بے شرط شکستِ فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش ہے تنہا یہ نظر کا کام نہیں

یہ شعر عشق میں خود سپردگی اور شکستِ انا کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق کو چاہیے کہ وہ خود ہی اپنی کھلی ہوئی شکست کو قبول کر لے، کیونکہ یہ صرف نظریاً حسن کا کام نہیں بلکہ دل بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ یہاں عشق کو ایک جیتی جاگتی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان کو خود اس کی ہار پر راضی کر دیتا ہے۔ ”سازش“ کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دل خود بھی عشق کی گرفت میں آنا چاہتا ہے۔

سب جس کو اسیری کہتے ہیں وہ تو ہے امیری ہی لیکن
وہ کون سی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دام نہیں

شاعر کہتا ہے کہ جسے لوگ اسیری کہتے ہیں، وہ دراصل امیری ہے، کیونکہ عشق کی غلامی انسان کو اندر سے مالا مال کر دیتی ہے۔ پھر وہ ایک بنیادی سوال اٹھاتا ہے: یہاں ایسی کون سی آزادی ہے جس میں انسان خود اپنا دام نہ ہو؟ یعنی ہر انسان کسی نہ کسی خواہش، تعلق یا وابستگی کا قیدی ہے۔ مکمل آزادی محض ایک وہم ہے۔

18.2.3 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

ذیل کے جملوں میں خالی جگہیں پُر کیجیے:

1. جگر مراد آبادی کا اصل نام _____ تھا۔
2. جگر مراد آبادی کی پیدائش _____ میں ہوئی۔
3. جگر کے ابتدائی استاد شاعری _____ تھے۔
4. جگر مراد آبادی کی شاعری کا بنیادی موضوع _____ ہے۔
5. جگر کی مشہور تصنیف _____ ہے۔

18.3 عمومی جائزہ

جگر مراد آبادی اردو غزل کے ان ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں عشق و محبت، حسن و جمال اور انسانی جذبات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا۔ ان کی شاعری میں حسن تغزل، نغمگی، سوز و گداز اور جذبے کی صداقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے سادہ اور رواں زبان میں گہرے جذبات کا اظہار کیا اور اردو غزل کو نئی توانائی بخشی۔ جگر کی شاعری میں رومانیت اور روحانیت کا حسین امتزاج ملتا ہے، جس کی وجہ سے ان کا کلام آج بھی مقبول اور مؤثر سمجھا جاتا ہے۔

18.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ جگر مراد آبادی کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے۔ آپ نے جانا کہ جگر مراد آبادی بیسویں صدی کے اردو کے ایک نہایت مقبول اور باکمال شاعر تھے جنہوں نے اردو غزل کو حسن تغزل، نغمگی اور جذبے کی سچائی سے مالا مال کیا۔ آپ نے ان کے خاندانی پس منظر، ابتدائی تعلیم، ادبی تربیت اور شاعرانہ سفر کا مطالعہ کیا۔ آپ یہ بھی جان سکے کہ جگر نے اپنی شاعری میں عشق و محبت، حسن و جمال، انسانی جذبات اور روحانی کیفیات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ اس سبق کے ذریعے آپ جگر کی شاعری کی نمایاں خصوصیات، مثلاً حسن تغزل، موسیقیت، سادگی زبان، رومانیت، اثر آفرینی اور جذبے کی صداقت سے آگاہ ہوئے۔ آپ نے یہ بھی سیکھا کہ ان کے اشعار میں محبت محض ایک جذبہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک ہمہ گیر تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔

مزید برآں آپ جگر کی اہم تصانیف اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے سے واقف ہوئے۔ اس سبق نے آپ کو جگر مراد آبادی کے فن اور شخصیت کو بہتر انداز میں سمجھنے اور اردو غزل کی روایت میں ان کی خدمات کا ادراک کرنے میں مدد فراہم کی۔

لفظ	معنی
تغزل	غزل کی دلکشی اور حسن
رومانیت	جذباتی اور تخیلاتی اندازِ فکر
نغمگی	موسیقیت اور آہنگ
سوز و گداز	درد و تاثیر سے بھرپور کیفیت
ترنم	خوش آہنگ انداز میں پڑھنا
وارداتِ قلبی	دل کی کیفیات اور جذبات
مے نوشی	شراب نوشی
تائب	گناہ یا برے عمل سے رجوع کرنے والا
اثر آفرینی	گہرا اثر پیدا کرنے کی صلاحیت

18.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. جگر مراد آبادی کا اصل نام کیا تھا اور وہ کہاں پیدا ہوئے؟

2 جگر مراد آبادی کی شاعری کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

3 جگر کی شاعری میں حسنِ تغزل کی کیا اہمیت ہے؟

4 جگر مراد آبادی کی اہم تصانیف کے نام لکھیے۔

5 اردو غزل کی روایت میں جگر مراد آبادی کا مقام بیان کیجیے۔

18.7 مشقی سوالات

1. جگر مراد آبادی کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. جگر مراد آبادی کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔
3. جگر مراد آبادی کی شاعری میں عشق و محبت کے تصور پر بحث کیجیے۔
4. جگر مراد آبادی کے حسن تغزل، نغمگی اور اسلوب بیان کی وضاحت کیجیے۔
5. اردو غزل کی تاریخ میں جگر مراد آبادی کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

18.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1- جگر مراد آبادی کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

جگر مراد آبادی اردو ادب کے ممتاز اور مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اصل نام علی سکندر تھا اور "جگر" ان کا تخلص تھا۔ وہ 6 اپریل 1890ء کو اتر پردیش کے شہر مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی علی نظر خود بھی شاعر تھے، اس لیے جگر کو ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ کم عمری میں والد کے انتقال کے باعث انہیں زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کی فطری صلاحیتوں اور شوقِ ادب نے انہیں شاعری کی دنیا میں نمایاں مقام عطا کیا۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی اور اردو و فارسی زبانوں میں مہارت پیدا کی۔ شاعری میں ان کے ابتدائی استاد رسہ رامپوری تھے۔ جگر نے جلد ہی اپنی منفرد شاعرانہ شناخت قائم کر لی اور اردو مشاعروں کے مقبول ترین شاعر بن گئے۔

جگر مراد آبادی کی ادبی خدمات اردو غزل کے فروغ میں نہایت اہم ہیں۔ انہوں نے غزل کو نئی رعنائی، نغمگی اور اثر آفرینی عطا کی۔ ان کے اشعار میں عشق و محبت، حسن و جمال اور انسانی جذبات کی نہایت خوبصورت ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں ”داغِ جگر“، ”شعلہ طور“ اور ”آتشِ گل“ شامل ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ ”کلیاتِ جگر“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جگر کی شاعری نے اردو ادب کو نہ صرف ایک خوبصورت اسلوب عطا کیا بلکہ غزل کی مقبولیت میں بھی اضافہ کیا۔ اسی وجہ سے وہ اردو غزل کے صفِ اول کے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

2- جگر مراد آبادی کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔

جگر مراد آبادی کی شاعری فکری اور فنی دونوں اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ فکری اعتبار سے ان کی شاعری کا بنیادی موضوع عشق و محبت ہے، لیکن ان کے ہاں عشق محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایک روحانی اور انسانی تجربہ بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی، محبت، اخلاص، وفاداری اور روحانی بالیدگی کے عناصر نمایاں ہیں۔

فنی اعتبار سے جگر کی شاعری میں حسنِ تغزل، موسیقیت، نغمگی، سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں جذبات کی صداقت اور اظہار کی لطافت قاری کو فوراً متاثر کرتی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور دلکش ہے، جس کی وجہ سے ان کا کلام عام اور خاص دونوں طبقوں میں مقبول ہے۔

جگر کے اشعار میں تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا استعمال بھی نہایت خوبصورتی سے ملتا ہے۔ ان کے ہاں جذبے کی شدت اور اظہار کی نرمی ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ یہی فنی اور فکری خوبیاں انہیں اردو غزل کے بڑے شاعروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

3۔ جگر مراد آبادی کی شاعری میں عشق و محبت کے تصور پر بحث کیجیے۔

عشق و محبت جگر مراد آبادی کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ ان کے نزدیک عشق انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور روحانی ارتقا کا ذریعہ ہے۔ ان کی شاعری میں محبت کا جذبہ نہایت خلوص، وارفتگی اور سچائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ جگر کے ہاں عشق صرف محبوب تک محدود نہیں بلکہ انسان دوستی اور روحانیت کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے اشعار میں محبت کی لذت، جدائی کا درد، انتظار کی کیفیت اور وصال کی آرزو نہایت دلنشین انداز میں بیان ہوئی ہے۔

ان کا مشہور شعر:

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

عشق کی دشواریوں اور اس کی عظمت کو واضح کرتا ہے۔ جگر کے نزدیک عشق قربانی، صبر، استقامت اور جذبہ ایثار کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری محبت کے جذبات کی بہترین ترجمان سمجھی جاتی ہے۔

4۔ جگر مراد آبادی کے حسنِ تغزل، نغمگی اور اسلوبِ بیان کی وضاحت کیجیے۔

جگر مراد آبادی کو اردو شاعری میں حسنِ تغزل کا امام کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے جذبات نہایت دلکش اور مؤثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے اشعار میں نرمی، لطافت اور جذبے کی صداقت پائی جاتی ہے جو قاری کے دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت نغمگی ہے۔ ان کے اشعار میں ایسا آہنگ اور موسیقیت موجود ہے جو سننے والے کو مسحور کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام مشاعروں میں بے حد پسند کیا جاتا تھا۔

جگر کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ، رواں اور دلکش ہے۔ انہوں نے پیچیدہ زبان یا مشکل تراکیب سے گریز کیا اور عام فہم الفاظ میں گہرے جذبات کا اظہار کیا۔ ان کے اشعار میں روانی، سلاست اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔ حسنِ تغزل، موسیقیت اور سادگی بیان نے ان کی شاعری کو اردو ادب کا لازوال سرمایہ بنا دیا ہے۔

5۔ اردو غزل کی تاریخ میں جگر مراد آبادی کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

جگر مراد آبادی اردو غزل کی تاریخ کے اہم ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے بیسویں صدی میں اردو غزل کو نئی زندگی، تازگی اور مقبولیت عطا کی۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج ملتا ہے جس نے انہیں اپنے عہد کا منفرد شاعر بنا دیا۔ جگر نے غزل کی کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئے جذباتی اور فکری رنگ شامل کیے۔ ان کی شاعری عشق و محبت، حسنِ تغزل، موسیقیت اور انسانی جذبات کی بہترین ترجمان ہے۔ ان کے اشعار میں جو سوز و گداز اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے، وہ انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز بناتی ہے۔

اردو مشاعروں میں ان کی مقبولیت بے مثال تھی اور ان کے اشعار عوام و خواص دونوں میں یکساں پسند کیے جاتے تھے۔ ناقدین نے انہیں اردو غزل کا ایک عظیم شاعر قرار دیا ہے۔ ان کا شعری سرمایہ آج بھی ادب کے طلبہ، اساتذہ اور محققین کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ مختصر آئیہ کہا جاسکتا ہے کہ جگر مراد آبادی اردو غزل کے ایک درخشاں ستارے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو ادب کو بے پناہ حسن، نغمگی اور اثر آفرینی عطا کی۔ ان کا نام اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

18.8 جوابات سرگرمی

1. علی سکندر

2. مراد آباد

3. رسہ رامپوری

4. عشق و محبت

5. داغِ جگر

18.9 امدادی کتب

1. کلیاتِ جگر

2. شعلہ طور

3. آتش گل

4. جگر مراد آبادی: حیات اور شاعری

5. جگر مراد آبادی

6. یادگارِ جگر

مرتبہ کرشن کانت

ڈاکٹر محمد سلام

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

محمد اسلام

سبق نمبر ۱۹۔ فراق گور کھپوری

ساخت

- 19.0 اغراض و مقاصد
- 19.1 تعارف
- 19.2 فراق کی حیات اور غزل گوئی
- 19.2.0 نگاہِ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا
- 19.2.1 کسی کایوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
- 19.2.2 سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
- 19.2.3 سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
- 19.3 عمومی جائزہ
- 19.4 آپ نے کیا سیکھا؟
- 19.5 فرہنگ
- 19.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات
- 19.7 مشقی سوالات
- 19.7.0 مشقی سوالات کے جوابات
- 19.8 جواباتِ سرگرمی
- 19.9 امدادی کتب

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو اردو کے ممتاز شاعر فراق گور کھپوری کی زندگی، شخصیت، ادبی خدمات اور شعری خصوصیات سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ جان سکیں گے کہ فراق گور کھپوری بیسویں صدی کے ان اہم شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے اردو غزل کو جدید فکری شعور، تہذیبی آگہی اور نئے جمالیاتی احساسات سے ہم آہنگ کیا۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ فراق گور کھپوری کے خاندانی پس منظر، تعلیمی زندگی، سیاسی سرگرمیوں اور ادبی سفر سے واقف ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ انہوں نے قومی تحریک آزادی میں کس طرح حصہ لیا اور تدریس و ادب کے میدان میں کس طرح نمایاں خدمات انجام دیں۔ مزید یہ کہ آپ فراق کی شاعری کے مختلف فکری اور فنی پہلوؤں، مثلاً عشق و محبت، انسانی جذبات، جدید شعور، ہندوستانی تہذیب و ثقافت، جذبات نگاری، حسن بیان، موسیقیت اور تغزل کا مطالعہ کریں گے۔ آپ ان کی شاعری میں موجود نفسیاتی بصیرت، تہذیبی شعور اور جمالیاتی حسن کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ فراق گور کھپوری کی اہم تصانیف، ان کے منفرد اسلوبِ اظہار، اردو غزل کی ترقی میں ان کے کردار اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبہ کا ادراک حاصل کریں گے۔ ساتھ ہی ان کے منتخب اشعار کی تفہیم اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی۔

19.1 تعارف

یہ سبق اردو کے عظیم شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور فراق گور کھپوری کی زندگی، ادبی خدمات اور شعری خصوصیات سے متعلق ہے۔ فراق گور کھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ وہ بیسویں صدی کے ان ممتاز شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو نئے فکری اور فنی امکانات سے روشناس کرایا۔

فراق ایک وسیع المطالعہ شخصیت کے مالک تھے۔ اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسی علمی وسعت نے ان کی شاعری کو فکری گہرائی، تہذیبی رنگارنگی اور معنوی وسعت عطا کی۔ ان کے کلام میں محبت، حسن، انسانی رشتوں، تہذیبی اقدار اور زندگی کے مختلف تجربات کا نہایت دلکش اظہار ملتا ہے۔

فراق گور کھپوری ایک ایسے دور میں سامنے آئے جب ہندوستان سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ انہوں نے قومی تحریک آزادی میں حصہ لیا اور بعد ازاں تدریس اور ادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کی شخصیت علم، دانش، حاضر جوابی اور تخلیقی بصیرت کا حسین امتزاج تھی۔

فراق کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف اس کی انسان دوستی، رومانیت، جذباتی صداقت اور فکری تازگی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو ایک نیالب و لہجہ عطا کیا اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے عناصر کو بڑی خوبصورتی سے اپنی شاعری میں سمو دیا۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات، زندگی کے تجربات اور جدید شعور کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

اس سبق میں فراق گور کھپوری کی حیات، ادبی خدمات، شعری خصوصیات اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا تاکہ آپ ان کی شخصیت اور فن کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں اور اردو شاعری میں ان کے منفرد کردار کا ادراک حاصل کر سکیں۔

19.2 فراق گور کھپوری: حیات اور شاعری

فراق گور کھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا جبکہ شاعری میں انہوں نے فراق مستخلص اختیار کیا۔ وہ 28 اگست 1896ء کو گور کھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی گور کھپر شاد عبرت اردو، فارسی اور سنسکرت کے عالم اور صاحبِ ذوق شاعر تھے۔ اسی ادبی ماحول نے فراق کی شخصیت اور شعری ذوق کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ شاعری کا رجحان انہیں وراثت میں ملا اور کم عمری ہی سے زبان و ادب سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ فراق کا دورِ شباب برصغیر کی سیاسی بیداری اور قومی تحریکوں کا دور تھا۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انڈین سول سروس (ICS) کے امتحان میں کامیابی بھی حاصل کی، لیکن قومی شعور اور آزادی وطن کے جذبے نے انہیں سرکاری ملازمت سے دور رکھا۔ مہاتما گاندھی کی تحریکِ عدم تعاون سے متاثر ہو کر انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا، جس کے نتیجے میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔

بعد ازاں فراق الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں اور وہ جلد ہی اردو ادب کے افق پر ایک منفرد اور ممتاز شاعر کے طور پر ابھرے۔ ان کی شخصیت علم، دانش، حاضر جوابی اور وسیع مطالعے کا حسین امتزاج تھی۔ اردو، ہندی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر تھی، جس کا اثر ان کی شاعری میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ فراق نے 3 مارچ 1982ء کو نئی دہلی میں وفات پائی۔ ان کی میت الہ آباد لے جائی گئی جہاں دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم کے قریب ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

فراق کی شاعری کے نمایاں اوصاف

فراق گور کھپوری نے اردو غزل کو نئے فکری زاویے عطا کیے۔ ان کی شاعری میں محض روایتی عشق و محبت ہی نہیں بلکہ زندگی، انسان، تہذیب، سماج اور نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی جھلک بھی ملتی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو جدید حسیت اور عصری شعور سے آشنا کیا۔ فراق کی شاعری کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے، لیکن ان کے ہاں عشق محض جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایک زندہ انسانی تجربہ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ محبت کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت تصور کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں محبوب ایک جیتی جاگتی شخصیت کے طور پر نظر آتا ہے۔ مشہور شعر ملاحظہ ہو:

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

فراق کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی ہے۔ انہوں نے ہندی اور سنسکرت الفاظ، استعاروں اور دیومالائی علامتوں کو بڑی خوبصورتی سے اپنی شاعری میں سمو دیا۔ اس طرح ان کی غزل اردو شاعری میں ایک نئے تہذیبی رنگ کی حامل بن گئی۔ فراق انسانی جذبات و احساسات کے بڑے کامیاب مصور ہیں۔ محبت، تنہائی، یاد، محرومی، امید اور زندگی کی مختلف کیفیات کو انہوں نے نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں داخلی تجربات کی گہرائی اور نفسیاتی بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔

فراق کی زبان نہایت دلکش، شستہ اور مترنم ہے۔ انہوں نے روایتی الفاظ کو نئے انداز سے استعمال کیا اور نئی تراکیب وضع کیں۔ ان کے ہاں تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا استعمال فنکارانہ مہارت کے ساتھ ملتا ہے۔ فراق کی شاعری میں تغزل، نغمگی اور ترنم کی کیفیت نمایاں ہے۔ ان کے اشعار قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں اور دیر تک اثر قائم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔

فراق نے ابتدا میں امیر مینائی، صفی لکھنوی، مومن، غالب اور میر کے اثرات قبول کیے، لیکن جلد ہی انہوں نے اپنا منفرد انداز پیدا کر لیا۔ ان کے کلام میں میر کا سوز، غالب کی ندرت، مومن کی نازک خیالی، حسرت کا تغزل اور جگر کی رومانیت ایک نئے آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ انہوں نے عشق و محبت کو نفسیاتی اور شخصی تجربات کی روشنی میں پیش کیا۔ ان کے اشعار میں اشاریت، رمزیت اور معنوی گہرائی پائی جاتی ہے، جو انہیں اپنے معاصر شعرا سے ممتاز بناتی ہے۔

تصانیف

فراق گورکھپوری کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

- گلِ نغمہ
- گلِ رعنا
- روحِ کائنات
- مشعل
- روپ
- شبستان
- سرِ غم
- بزمِ زندگی رنگِ شاعر

اعزازات

فراق گور کھپوری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا، جن میں:

- سہیتہ اکادمی ایوارڈ (1960ء)
- پدم بھوشن (1968ء)
- سوویت لینڈ نہر و ایوارڈ (1968ء)
- گیان پیٹھ ایوارڈ (1969ء)
- غالب اکیڈمی ایوارڈ (1981ء)

شامل ہیں۔

فراق گور کھپوری بیسویں صدی کے اردو ادب کی ایک عظیم اور ہمہ جہت شخصیت تھے۔ انہوں نے اردو غزل کو جدید فکری شعور، نئی جمالیاتی حس، ہندوستانی تہذیبی رنگ اور نفسیاتی گہرائی عطا کی۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کی لطافت، جذبات کی سچائی، فکر کی بلندی اور زبان کی دلکشی ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو نئی وسعتیں بخشیں اور اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اسی وجہ سے فراق گور کھپوری کا شمار اردو کے ان چند عظیم شعرا میں ہوتا ہے جن کی شاعری آج بھی تازگی، معنویت اور فنی عظمت کے ساتھ پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔

19.2.0	غزل (نگاہِ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا)
نگاہِ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا	جوابِ اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا

اس شعر میں شاعر نگاہِ محبوب کی طاقت اور تاثیر کو مرکزی موضوع بناتا ہے۔ محبوب کی ناز بھری نگاہ نے کتنے ہی پردے اٹھا دیے ہیں، یعنی وہ حقائق، راز اور کیفیات جواب تک چھپے ہوئے تھے، نگاہ کے ایک اشارے سے عیاں ہو گئے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی نگاہ نے اہلِ محبت پر نئے حجاب بھی ڈال دیے ہیں۔ یعنی جتنا کچھ ظاہر ہوا، اتنا ہی کچھ اور چھپ بھی گیا۔ عشق میں معرفت اور حیرت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ یہ شعر عشق کی اس paradoxical کیفیت کو بیان کرتا ہے جہاں انکشاف بھی ہے اور پردہ داری بھی۔

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

یہاں شاعر محبوب کے حسن کو آفاقی حیثیت دیتا ہے۔ پہلے دنیا میں اس کے جلووں کا محض چرچا تھا، ایک افواہ سی گردش میں تھی، مگر جب جلوہ حقیقت بن کر سامنے آیا تو دیر و حرم دونوں کے چراغ جگمگا اٹھے۔ دیر اور حرم مذہبی علامتیں ہیں جو بت کدے اور مسجد دونوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ محبوب کا حسن کسی ایک مذہب یا عقیدے تک محدود نہیں بلکہ ہر جگہ یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔

دو چار برقی تجلی سے رہنے والوں نے
فریبِ نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا

یہ شعر ان لوگوں پر طنز ہے جو عشق کی اصل شدت سے دور رہتے ہیں اور محض نرم نگاہی کو ہی حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جنہوں نے عشق کی مکمل تجلی نہیں دیکھی، وہ نرم اور فریب دینے والی نگاہوں کے دھوکے میں آ گئے۔

دلوں پہ کرتے ہوئے آج آتی جاتی چوٹ
تری نگاہ نے پہلو بچائے ہیں کیا کیا

اس شعر میں نگاہِ محبوب کی بے رحمی اور نزاکت دونوں ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ نگاہِ دلوں پر چوٹ بھی کرتی ہے مگر اس انداز سے کہ بچاؤ بھی ساتھ ساتھ ہو جاتا ہے۔ یعنی زخم بھی لگتا ہے مگر جان نہیں جاتی۔ یہ عاشقانہ اذیت کا وہ حسن ہے جس میں درد بھی مطلوب ہوتا ہے۔ ”پہلو بچانا“ اس بات کی علامت ہے کہ محبوب پوری شدت سے وار نہیں کرتا، بلکہ عاشق کو زندہ رکھ کر تڑپانا چاہتا ہے۔

نثارِ نرگھسِ مے گوں کہ آج پیمانے
لبوں تک آئے ہوئے تھر تھرائے ہیں کیا کیا

یہ شعر شراب، پیمانہ اور نرگھس جیسے کلاسیکی عشقی استعاروں سے مزین ہے۔ نرگھسِ مے گوں محبوب کی آنکھوں کی علامت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آج پیمانے لبوں تک آکر بھی کانپ رہے ہیں، یعنی شراب بھی محبوب کے جلوے کے سامنے لرزاں ہے۔ حسن کی شدت نے نشے کو بھی بے بس کر دیا ہے۔ یہاں حسن اور شراب کے مابین مقابلہ دکھایا گیا ہے جس میں حسن غالب آتا ہے۔ صنعتِ تشبیہ اور مبالغہ اس شعر کو جمالیاتی شان عطا کرتے ہیں۔

وہ اک ذرا سی جھلک برق کم نگاہی کی
جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا

یہاں شاعر اپنی ذات کی طرف پلٹتا ہے۔ محبوب کی نگاہ کی معمولی سی جھلک نے دل کے پرانے، چھپے ہوئے زخموں کو بھی تازہ کر دیا ہے، مگر یہ تازگی مسکراہٹ کے ساتھ آئی ہے۔ یعنی درد بھی لذت میں بدل گیا ہے۔ ”زخم نہاں کا مسکراہٹ“ ایک نہایت لطیف استعاراتی ترکیب ہے جو عشق کے paradox کو مکمل کرتی ہے۔ یہ شعر داخلی کرب کو جمالیاتی تجربے میں بدل دیتا ہے۔

چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ
جوابِ برق ادا نے اٹھائے ہیں کیا کیا

یہ شعر صوفیانہ علامتوں سے بھرپور ہے۔ چراغِ طور حضرت موسیٰ کے واقعہ تجلی کی طرف اشارہ ہے۔ آئینہ در آئینہ سے مراد مسلسل تجلیات ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی ادا کی بجلی نے کتنے ہی پردے اٹھا دیے ہیں، حتیٰ کہ تجلی در تجلی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہاں حسن کو تجلی حق کے قریب تر دکھایا گیا ہے۔ مذہبی استعارہ، تصوف اور عشقی رمزیت اس شعر کو غیر معمولی معنویت دیتی ہے۔

بقدرِ ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر
نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا

اس شعر میں شاعر تسلیم کرتا ہے کہ حسن کا ادراک دیکھنے والے کے ذوق پر منحصر ہے۔ مگر عاشق کی نگاہِ شوق میں جلووں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں حسن محدود نہیں، بلکہ نگاہ کی استعداد محدود یا وسیع ہوتی ہے۔ یہ شعر قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ عشق میں اصل چیز دیکھنے والی آنکھ نہیں بلکہ دیکھنے کا ذوق ہے۔ یہ فکری شعر ہے جس میں فلسفہ ادراک پوشیدہ ہے۔

کہیں چراغِ کہیں گل کہیں دل برباد
خرامِ ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

یہ شعر محبوب کی چال (خرام ناز) کے اثرات کا نقشہ کھینچتا ہے۔ کہیں چراغ جل رہے ہیں، کہیں پھول کھل رہے ہیں اور کہیں دل تباہ ہو رہے ہیں۔ یعنی ایک ہی حسن مختلف مقامات پر مختلف اثرات پیدا کر رہا ہے۔ یہ کائناتی وسعت رکھنے والا شعر ہے جس میں محبوب کا وجود پوری فضا پر حاوی نظر آتا ہے۔ صنعتِ مراعات النظر اور تصویریت اس شعر کا حسن ہیں۔

فراقِ راہِ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈمگائے ہیں کیا کیا

مقطع میں فراقِ محبوب کی بے نیازی اور سبک روی کا ذکر کرتے ہیں۔ وفا کی راہ میں محبوب کی بے پروائی نے بڑے بڑے ثابت قدم لوگوں کو بھی لڑکھڑادیا ہے۔ یہاں عاشق کی شکست نہیں بلکہ حسن کی قوت کا اعتراف ہے۔ تخلص کا بر محل استعمال شعر کو ذاتی تجربے سے آفاقی حقیقت تک لے جاتا ہے۔

19.2.1 کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

اس شعر میں شاعر انسانی زندگی کے ایک بنیادی تجربے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بظاہر انسان کسی کا ہو جاتا ہے، کسی تعلق، کسی محبت، کسی وابستگی میں عمر گزار دیتا ہے، لیکن حقیقت میں مکمل سپردگی اور کلی وابستگی کبھی بھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ شاعر یہ کہتا ہے کہ عمر بھر ساتھ رہنے، دل دینے اور قربانیاں دینے کے باوجود انسان پوری طرح کسی کا نہیں ہو پاتا۔ اسی نکتہ نظر سے وہ حسن و عشق کو دھوکا قرار دیتا ہے، مگر اسی سانس میں اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس دھوکے کے باوجود انسان حسن و عشق سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یہاں انسانی نفسیات کی پیچیدگی سامنے آتی ہے کہ عقل ایک حقیقت کو مان لیتی ہے مگر دل اس حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

یہ شعر محبوب کی گلی یا اس راستے کو مرکز خیال بناتا ہے جہاں سے شاعر بارہا گزر چکا ہے۔ زمانہ ہزار بار گزرا، یعنی وقت کی گردش نے اس جگہ کو پرانا کر دیا، مگر شاعر کے احساس میں وہ راستہ آج بھی نیا، تازہ اور ان دیکھا سا ہے۔ اس شعر میں یاد، محبت اور احساسِ تازگی کا حسین امتزاج ہے۔ محبوب سے وابستہ مقامات وقت کی گرفت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہاں تضادِ زمانی نمایاں ہے۔

کہوں یہ کیسے ادھر دیکھ یا نہ دیکھ ادھر
کہ درد درد ہے پھر بھی نظر نظر پھر بھی

اس شعر میں عاشق کی ذہنی الجھن اور قلبی بے قراری نہایت مؤثر انداز میں سامنے آتی ہے۔ شاعر یہ طے نہیں کر پا رہا کہ محبوب کی طرف دیکھے یا نظر چرالے۔ دیکھنے میں درد ہے اور نہ دیکھنے میں بھی اذیت ہے۔ درد اور نظر کی تکرار اس کیفیت کو شدید بنا دیتی ہے۔ یہاں نظر صرف آنکھ کا عمل نہیں بلکہ دل کا جذبہ بن جاتی ہے۔ درد کو تجرید سے نکال کر محسوس حقیقت بنا دیا گیا ہے۔

خوشا اشارہ پیہم زہے سکوت نظر
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

اس شعر میں خاموش نگاہ اور مسلسل اشاروں کا ذکر ہے۔ محبوب کی خاموشی بھی گویا ایک زبان رکھتی ہے جو مسلسل بات کر رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک طویل داستان بھی اگرچہ پھیل کر سامنے آئے، پھر بھی محبوب کی ایک نظر میں سمٹ آتی ہے۔ یہاں سکوت اور اشارہ، درازی اور اختصار جیسے متضاد تصورات کو یکجا کیا گیا ہے۔

جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادہ سفر پھر بھی

یہ شعر کائناتی سطح پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ زمان و مکاں کی آنکھوں کا جھپکنا وقت کی ناپائیداری اور کائنات کی تھکن کا استعارہ ہے۔ اس کے باوجود زندگی کا قافلہ سفر کے لیے تیار ہے۔ یہاں انسان کی مسلسل جدوجہد، حرکت اور آگے بڑھنے کی علامت ملتی ہے۔ کائنات تھک سکتی ہے مگر انسانی ارادہ رواں رہتا ہے۔ قافلہ زندگی کی اجتماعی علامت ہے اور سفر وجودی تسلسل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شبِ فراق سے آگے ہے آج میری نظر
کہ کٹ ہی جائے گی یہ شام بے سحر پھر بھی

اس شعر میں فراق کی تاریکی کے باوجود امید کی ایک باریک مگر روشن لکیر موجود ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری نظر اب صرف جدائی کی رات تک محدود نہیں رہی بلکہ اس سے آگے دیکھ رہی ہے۔ اگرچہ یہ شام ”بے سحر“ ہے یعنی جس کی صبح نظر نہیں آتی پھر بھی یقین ہے کہ یہ وقت کٹ

جائے گا۔ یہاں داخلی حوصلہ اور صبر کا تصور نمایاں ہے۔ شاعر اندھیرے کو حتمی نہیں مانتا بلکہ عارضی سمجھتا ہے۔ یہ نفسیاتی مزاحمت (inner resilience) کا بیان ہے۔ شب، شام، سحر یہ سب وقت کی علامتی تصویریں ہیں اور مل کر مراعات النظر پیدا کرتی ہیں۔

کہیں یہی تو نہیں کاشفِ حیات و ممات
یہ حسن و عشق بظاہر ہیں بے خبر پھر بھی

یہ شعر فکری اور فلسفیانہ نوعیت رکھتا ہے۔ شاعر سوال اٹھاتا ہے کہ کہیں حسن اور عشق ہی زندگی اور موت کے راز کھولنے والے تو نہیں؟ بظاہر حسن اور عشق جذباتی اور غیر عقلی محسوس ہوتے ہیں، مگر شاید وجود کے بڑے سچ انہی کے ذریعے منکشف ہوتے ہیں۔ گویا عقل نہیں بلکہ تجربہ حسن و عشق انسان کو حیات و ممات کی گہرائی سمجھاتا ہے۔

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا
وہ کوچہ اگرچہ رنجِ جنت ہو گھر ہے گھر پھر بھی

یہاں شاعر جلا وطنی اور واپسی کے جذبے کو بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ اپنے وطن سے دور تھے وہ لوٹ رہے ہیں اور لوٹنا فطری بھی تھا۔ محبوب کا کوچہ اگرچہ جنتِ رخ (بہت حسین) ہے، مگر اپنا گھر پھر بھی گھر ہوتا ہے۔ اس میں جذبات اور حقیقت پسندی کا توازن ہے عشق اپنی جگہ مگر اصل وابستگی بھی اپنی جگہ۔

لٹا ہوا چمن عشق ہے نگاہوں کو
دکھا گیا وہی کیا کیا گل و ثمر پھر بھی

اس شعر میں شاعر عاشقانہ نظر کی تخلیقی قوت کو بیان کرتا ہے۔ بظاہر عشق کا چمن لٹ چکا ہے یعنی محبت نے زندگی کو ویران، منتشر اور زخمی کر دیا ہے مگر اس کے باوجود شاعر کی نگاہ کو اسی اجڑے ہوئے باغ میں پھول اور پھل دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی نکتہ ہے کہ عاشق کی بصیرت عام نظر سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ تباہی میں بھی معنی، حسن اور امکان تلاش کر لیتا ہے۔ اس میں یاد، تخیل اور محبت مل کر حقیقت کو ایک نئے رنگ میں دکھاتے ہیں۔ گویا عشق صرف برباد نہیں کرتا بلکہ ادراک کا زاویہ بھی بدل دیتا ہے۔

خراب ہو کے بھی سوچا کیے ترے مہجور
یہی کہ تیری نظر ہے تری نظر پھر بھی

یہ شعر عاشق کی ذہنی مرکزیت اور یک رخ و البستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ برباد اور شکستہ حال ہونے کے باوجود اس کی سوچ محبوب ہی کے گرد گھومتی رہی۔ ”مہجور“ (جدائی زدہ عاشق) اپنی بربادی کا تجزیہ بھی محبوب کی نظر کے حوالے سے کرتا ہے گویا سبب بھی وہی، اثر بھی وہی۔

ستم کے رنگ ہیں ہر التفات پنہاں میں
کرم نما ہیں ترے جور سر بسر پھر بھی

محبوب کے رویے کی پیچیدگی یہاں نمایاں ہے۔ اس کا ہر التفات بظاہر مہربانی ہے مگر اندر ستم چھپا ہے اور اس کا ظلم بھی کرم کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ یہ عشق کی ستم ظریفی ہے جہاں دکھ بھی انعام لگتا ہے۔

خطا معاف ترا عفو بھی ہے مثل سزا
تری سزا میں ہے اک شانِ درگزر پھر بھی

محبوب کی معافی بھی سزا جیسی لگتی ہے یعنی اس میں بھی رعب، فاصلہ اور برتری ہے مگر اس سزا میں بھی ایک شان اور وقار ہے۔ عاشق کے لیے ہر صورت محبوب کی طرف سے ہے، اس لیے قبول ہے۔ عفو/سزا/درگزر مراعات النظر ہے جس سے شعر کا حسن بڑھ جاتا ہے۔

19.2.2 سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

اس شعر میں فراق کی داخلی کشمکش نہایت باریک اور نفسیاتی انداز میں سامنے آتی ہے۔ شاعر ایک طرف یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نہ اس کے سر میں عشق کا جنون باقی ہے اور نہ دل میں کوئی فعال تمنا، مگر دوسری ہی سانس میں یہ اعتراف بھی کرتا ہے کہ محبت سے مکمل دست برداری پر خود اسے اعتماد نہیں۔ یہی تضاد کیفیت اس شعر کی روح ہے۔ یہاں نفی کے بعد نفی کا اسلوب ایک خاص فکری الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔ سودا اور تمنا جیسے الفاظ عشق کی شدت کے نمائندہ ہیں، جن کی عدم موجودگی کا اعلان دراصل تھکن، شکست اور جذبے کے ماند پڑ جانے کی علامت ہے۔ لیکن ترکِ محبت پر عدم بھروسا بتاتا ہے کہ عشق پوری طرح مرا نہیں، محض سویا ہوا ہے۔ اس شعر میں داخلی مکالمہ، نفسیاتی صداقت اور جذبے کی نیم مردہ کیفیت کا گہرا بیان ملتا ہے، جو فراق کی جدید رومانوی حسیت کا خاصہ ہے۔

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

شاعر کہتا ہے کہ اس کا دل نہ اپنوں میں شمار ہوتا ہے اور نہ غیروں میں، یعنی وہ ہر تعلق سے کٹا ہوا ہے، مگر اس کے باوجود وہ محبوب کی جلوہ گاہ سے اٹھنے پر آمادہ نہیں۔ یہاں دل کو ایک بانجر، حساس وجود کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ذلت بے تعلقی کے باوجود جمالِ محبوب سے وابستگی نہیں چھوڑتا۔ یگانہ و بیگانہ کی تضادی ترکیب سماجی تنہائی کو واضح کرتی ہے، جب کہ جلوہ گہ ناز محبوب کی جمالیاتی اور روحانی مرکزیت کی علامت ہے۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں

یہاں فراقِ محبت اور مہربانی کے فرق کو نہایت شعوری انداز میں واضح کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ محض شفقت یا احسان کو محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اب محبوب کی ناراضی بھی بے سبب نہیں رہی۔ یہ شعر خود احتسابی، فکری بلوغت اور جذباتی بصیرت کی مثال ہے۔ مہربانی اور محبت کا تقابل دراصل عشق کی گہرائی اور سچائی پر سوال اٹھاتا ہے۔ رنجش کو بے جانہ کہنا عاشق کے احساسِ جرم اور شکستہ خودی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

شاعر نہ تو محبوب کی یاد میں مبتلا ہے اور نہ ہی اسے مکمل طور پر بھول سکا ہے۔ یہاں یاد کا نہ آنا بے حسی نہیں بلکہ ایک تھکی ہوئی شعوری کیفیت ہے۔ بھول جانے کی نفی دراصل لاشعوری وابستگی کا ثبوت ہے۔ یہ شعر فراق کے اسلوب کی خاص پہچان ہے جہاں جذبہ شور نہیں مچاتا بلکہ خاموشی سے دل میں موجود رہتا ہے۔

آج غفلت بھی ان آنکھوں میں ہے پہلے سے
سوا آج ہی خاطر پیار شکلیا بھی نہیں

اس شعر میں آنکھ، غفلت اور بیماری کے استعاروں سے ذہنی اور جذباتی زوال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ آنکھوں میں غفلت کا بڑھ جاناد کی بے حسی اور تھکن کا مظہر ہے، جب کہ خاطر بیمار کا شکیبانہ ہونا جذباتی ناتوانی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں جسمانی بیماری دراصل روحانی کمزوری کی علامت ہے۔ شعر میں داخلی انتشار اور وقتی کم ہمتی کا بیان نہایت لطیف انداز میں ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ سکون دل وحشی کا مقام
کنج زنداں بھی نہیں وسعت صحرا بھی نہیں

یہ شعر فراق کی فکر کی گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔ عاشق کے دل کے سکون کی کوئی متعین جگہ نہیں۔ نہ قید کی تنہائی اسے آرام دیتی ہے اور نہ آزادی کی وسعت۔ کنج زنداں اور وسعت صحرا دو متضاد علامتیں ہیں، جن کے درمیان عاشق کی روح معلق ہے۔

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

اس شعر میں شاعر کلاسیکی استعاراتی نظام (صیاد، گل، بلبل) کے ذریعے اپنا احتجاج اور درد بیان کرتا ہے۔ وہ صیاد (شکار کرنے والے / محبوب / جابر قوت) سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ہم صرف بلبل (عاشقِ نالاں) ہی نہیں بلکہ گل (مرکزِ حسن و قدر) بھی ہیں یعنی ہم میں حسن بھی ہے اور درد بھی، قیمت بھی ہے اور کیفیت بھی مگر تو نے نہ ہماری آہ سنی اور نہ ہماری حالت دیکھی۔ یہ عاشق کی نظر انداز کی گئی شناخت کا شکوہ ہے۔ گل اور بلبل کو بیک وقت اپنی ذات پر منطبق کرنا ایک طرح کی خود آگہی عاشق ہے۔ وہ خود کو صرف رونے والا نہیں بلکہ معنی خیز وجود سمجھتا ہے۔ صیاد کی بے خبری محبوب یا طاقتور فریق کی بے حسی کی علامت ہے۔

آہ یہ مجمع احباب یہ بزم خاموش
آج محفل میں فراق سخن آرا بھی نہیں

یہ شعر تخلیقی خاموشی اور ذہنی پشیمردگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دوستوں کا مجمع موجود ہے، محفل بھی سچی ہوئی ہے، مگر فضا خاموش ہے کیونکہ آج فراق خود سخن آرا (کلام کرنے والا، محفل کو زندہ کرنے والا) موجود نہیں یا بولنے کے حال میں نہیں۔ اس میں ظاہری اجتماع اور باطنی خلا کا تضاد ہے۔

19.2.3 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

ذیل کے جملوں میں خالی جگہیں پُر کیجیے:

1. فراق گور کھپوری کا اصل نام _____ تھا۔
2. فراق گور کھپوری کی پیدائش _____ میں ہوئی۔
3. فراق کے والد کا نام _____ تھا۔
4. فراق گور کھپوری نے _____ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔
5. فراق کی مشہور تصنیف _____ ہے۔

19.3 عمومی جائزہ

فراق گور کھپوری اردو کے عظیم شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اردو غزل کو جدید فکری شعور، تہذیبی وسعت اور جمالیاتی حسن عطا کیا۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت، انسانی جذبات، نفسیاتی بصیرت اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے روایتی غزل کو جدید حسیت سے ہم آہنگ کیا اور اردو شاعری میں ایک منفرد لب و لہجہ پیدا کیا۔ فراق کی شاعری میں تغزل، نغمگی، فکری گہرائی اور زبان کی دلکشی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کا کلام آج بھی اردو ادب کے قارئین اور محققین کے لیے یکساں اہمیت رکھتا ہے۔

19.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ فراق گور کھپوری کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے۔ آپ نے جانا کہ فراق گور کھپوری بیسویں صدی کے اردو کے ممتاز شاعر، نقاد اور دانشور تھے جنہوں نے اردو غزل کو نئے فکری اور فنی امکانات سے روشناس کرایا۔ آپ نے ان کے خاندانی پس منظر، تعلیمی زندگی، سیاسی سرگرمیوں اور تدریسی خدمات کا مطالعہ کیا۔ آپ یہ بھی جان سکے کہ انہوں نے قومی تحریک آزادی میں حصہ لیا اور اردو ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس سبق کے ذریعے آپ فراق کی شاعری کی اہم خصوصیات، مثلاً عشق و محبت، انسان دوستی، تہذیبی شعور، نفسیاتی بصیرت، تغزل، نغمگی اور حسن بیان سے آگاہ ہوئے۔ آپ نے یہ بھی سیکھا کہ فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے عناصر کس خوبصورتی سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مزید برآں آپ فراق کی اہم تصانیف، اعزازات اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے سے واقف ہوئے۔ اس سبق نے آپ کو فراق گور کھپوری کے فن اور شخصیت کو بہتر انداز میں سمجھنے اور اردو غزل کی روایت میں ان کی خدمات کا ادراک کرنے میں مدد فراہم کی۔

19.5 فرہنگ

لفظ	معنی
تہذیب	ثقافت، تمدن

لفظ	معنی
جمالیات	حسن و خوبصورتی سے متعلق نظریات
تغزل	غزل کی دلکشی اور حسن
نغمگی	موسیقیت اور خوش آہنگی
بصیرت	گہری سمجھ اور فہم
اشاریت	علامتی اندازِ اظہار
رمزیت	پوشیدہ معنی رکھنے کا اسلوب
عصری شعور	زمانہ حاضر کا ادراک
معنویت	معنی خیزی اور مقصدیت
نفسیات	انسانی ذہن اور جذبات کا مطالعہ

19.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. فراق گور کھپوری کا اصل نام کیا تھا اور وہ کہاں پیدا ہوئے؟

2. فراق گور کھپوری کی شاعری کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

3. فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کس طرح نظر آتی ہے؟

4. فراق گور کھپوری کی اہم تصانیف کے نام لکھیے۔

5. اردو غزل کی روایت میں فراق گور کھپوری کا مقام بیان کیجیے۔

1. فراق گور کھپوری کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. فراق گور کھپوری کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔
3. فراق گور کھپوری کی شاعری میں عشق و محبت کے تصور پر بحث کیجیے۔
4. فراق گور کھپوری کے اسلوب بیان، تغزل اور نغمگی کی وضاحت کیجیے۔
5. اردو غزل کی تاریخ میں فراق گور کھپوری کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

19.7.0 مشقی سوالات کے جوابات

1- فراق گور کھپوری کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

فراق گور کھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ وہ 28 اگست 1896ء کو گور کھپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی گور کھ پر شاد عبرت اردو، فارسی اور سنسکرت کے عالم اور شاعر تھے۔ فراق نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور قومی تحریک آزادی سے متاثر ہو کر انگریز حکومت کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا۔

بعد ازاں وہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کی شاعری نے اردو غزل کو جدید فکری شعور، نفسیاتی گہرائی اور تہذیبی وسعت عطا کی۔ ان کی اہم تصانیف میں ”گلِ نغمہ“، ”گلِ رعنا“، ”روحِ کائنات“ اور ”مشعل“ شامل ہیں۔ فراق اردو ادب کی ایک عظیم شخصیت تھے جنہوں نے اردو شاعری کو نئی جہتیں عطا کیں۔

2- فراق گور کھپوری کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔

فراق کی شاعری فکری اور فنی دونوں اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ ان کے ہاں عشق و محبت کے ساتھ انسانی نفسیات، تہذیبی شعور، زندگی کے تجربات اور انسان دوستی کے عناصر نمایاں ہیں۔

فنی اعتبار سے ان کی شاعری میں حسن بیان، نغمگی، تغزل، استعارات اور علامتوں کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ ان کی زبان شستہ، سادہ اور دلکش ہے۔ جذبات کی صداقت اور فکر کی گہرائی ان کے کلام کو ممتاز بناتی ہے۔

3- فراق گور کھپوری کی شاعری میں عشق و محبت کے تصور پر بحث کیجیے۔

عشق و محبت فراق کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے نزدیک محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اور حسن زندگی کا سرچشمہ ہے۔ ان کی شاعری میں عشق محض روایتی جذبہ نہیں بلکہ ایک زندہ انسانی تجربہ ہے۔

فراق محبت کے ذریعے انسانی شخصیت کی تکمیل اور روحانی بالیدگی کا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں یاد، انتظار، وصال، ہجر اور جذباتی کیفیات نہایت دلکش انداز میں بیان ہوئی ہیں۔

4۔ فراق گور کھپوری کے اسلوب بیان، تغزل اور نغمگی کی وضاحت کیجیے۔

فراق کا اسلوب بیان نہایت دلکش، شگفتہ اور اثر انگیز ہے۔ انہوں نے روایتی الفاظ اور تراکیب کو نئے معنوی انداز میں استعمال کیا۔ ان کی شاعری میں تغزل کی لطافت اور نغمگی کی کیفیت نمایاں ہے۔

ان کے اشعار میں موسیقیت اور آہنگ قاری کو مسحور کر دیتے ہیں۔ سادگی، روانی، جذبات کی سچائی اور حسن اظہار ان کے اسلوب کی اہم خصوصیات ہیں۔

5۔ اردو غزل کی تاریخ میں فراق گور کھپوری کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

فراق گور کھپوری اردو غزل کے عظیم اور منفرد شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو جدید شعور، نفسیاتی گہرائی اور ہندوستانی تہذیبی رنگ عطا کیا۔ ان کی شاعری روایت اور جدت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

انہوں نے اردو غزل کو نئے فکری زاویے دیے اور اسے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے کلام میں عشق، حسن، انسان دوستی اور تہذیبی شعور کی ایسی ہم آہنگی ملتی ہے جو انہیں اردو کے صف اول کے شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

19.8 جوابات سرگرمی

1. رگھوپتی سہائے

2. گور کھپور

3. منشی گور کھ پر شاد عبرت

4. الہ آباد

5. گل نغمہ

19.9 امدادی کتب

1. گل نغمہ

2. گل رعنا

3. روح کائنات

4. مشعل

5. فراق گور کھپوری: شخصیت اور فن

6. اردو شاعری کا فنی ارتقا

7. فراق گور کھپوری: شاعر، نقاد، دانشور

ڈاکٹر نواز شعلی

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

گوپی چند نارنگ

سبق نمبر ۲۰- شہر یار

ساخت

20.0	اغراض و مقاصد
20.1	تعارف
20.2	شہر یار کی حیات اور غزل گوئی
20.2.0	ماحول میرے شہر کا ہاں پر سکوں نہ تھا
20.2.1	کیسا ماضی تھا کیا ہے حال اپنا
20.2.2	نہیں ہے مجھ سے تعلق کوئی تو ایسا کیوں
20.2.3	سر گرمی آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں
20.3	عمومی جائزہ
20.4	آپ نے کیا سیکھا؟
20.5	فرہنگ
20.6	نمونہ برائے امتحانی سوالات
20.7	مشقی سوالات
20.7.0	مشقی سوالات کے جوابات
20.8	جوابات سر گرمی
20.9	امدادی کتب

اس سبق کے مطالعے کا بنیادی مقصد آپ کو اردو کے ممتاز جدید شاعر شہریار کی زندگی، شخصیت، ادبی خدمات اور شعری خصوصیات سے روشناس کرانا ہے۔ اس سبق کے ذریعے آپ جان سکیں گے کہ شہریار جدید اردو شاعری کے ان اہم شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے روایت اور جدت کے حسین امتزاج سے اردو غزل اور نظم کو نئے فکری اور فنی امکانات عطا کیے۔

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ شہریار کے خاندانی پس منظر، تعلیمی زندگی، تدریسی خدمات اور ادبی سفر سے واقف ہوں گے۔ آپ یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ جدیدیت کی تحریک کے تناظر میں شہریار نے اردو شاعری میں کس نوعیت کے رجحانات کو فروغ دیا اور کس طرح اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ مزید یہ کہ آپ شہریار کی شاعری کے مختلف فکری اور فنی پہلوؤں، مثلاً تنہائی، خواب، عدم تحفظ، انسانی وجود، عصری مسائل، سماجی بے حسی، علامت نگاری، استعارہ آفرینی، تہذیبی شعور اور جمالیاتی حس کا مطالعہ کریں گے۔ آپ ان کی شاعری میں موجود نفسیاتی گہرائی، فکری بصیرت اور فنی پختگی کو بھی بہتر انداز میں سمجھ سکیں گے۔

اس سبق کے ذریعے آپ شہریار کی اہم تصانیف، ان کے منفرد اسلوبِ اظہار، اردو غزل و نظم کی ترقی میں ان کے کردار اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا دراک حاصل کریں گے۔ ساتھ ہی ان کے منتخب اشعار کی تفہیم اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگی۔

20.1 تعارف

شہریار جدید اردو شاعری کے ممتاز اور منفرد شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اصل نام کنور محمد اخلاق خان تھا، لیکن ادبی دنیا میں وہ "شہریار" کے نام سے معروف ہوئے۔ انہوں نے اردو غزل اور نظم دونوں اصناف میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اپنے مخصوص طرزِ احساس کے ذریعے اردو شاعری میں ایک الگ شناخت قائم کی۔

شہریار ایسے دور میں سامنے آئے جب اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک فروغ پا رہی تھی۔ اس تحریک نے شاعری کو نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئی علامتوں سے روشناس کرایا۔ شہریار نے جدیدیت کے اثرات قبول کیے، لیکن انہوں نے کبھی روایت سے مکمل انحراف نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت اور جدید حسیت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں خواب، تنہائی، خوف، عدم تحفظ، محرومی، انسانی وجود، سماجی مسائل اور عصری زندگی کی پیچیدگیاں نمایاں موضوعات کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ انہوں نے جدید انسان کی داخلی کشمکش اور نفسیاتی الجھنوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں علامتوں اور استعاروں کا استعمال نہایت مؤثر اور معنی خیز ہے، لیکن ان کی شاعری غیر ضروری پیچیدگی سے محفوظ رہتی ہے۔

شہریار ایک کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز استاد، نقاد اور ادبی شخصیت بھی تھے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ادبی صحافت کے میدان میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کے فلمی نغمات، خصوصاً فلم "گمن" اور "امرِ اوجان" کے لیے لکھے گئے گیت، بے حد مقبول ہوئے اور انہیں عوامی سطح پر بھی شہرت حاصل ہوئی۔

اس سبق میں شہریار کی حیات، ادبی خدمات، شعری خصوصیات اور اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبے کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا تاکہ آپ ان کی شخصیت اور فن کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں اور جدید اردو شاعری میں ان کے منفرد کردار کا ادراک حاصل کر سکیں۔

20.2 شہریار کی حیات اور غزل گوئی

شہریار کا اصل نام کنور محمد اخلاق خان تھا۔ وہ 16 جون 1936ء کو اتر پردیش کے ضلع بریلی کے قصبہ آنولہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہردوئی میں حاصل کی اور 1948ء میں علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور 1961ء میں اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1966ء میں شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ تدریساً ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کے منصب تک پہنچے اور 1996ء میں اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

ان کے والد پولیس انسپٹر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بیٹا بھی سرکاری ملازمت اختیار کرے، لیکن شہریار کا رجحان ادب اور شاعری کی طرف تھا۔ کھیلوں میں بھی ان کی دلچسپی تھی اور وہ ہاکی، بیڈمنٹن اور رمی کھیلنا پسند کرتے تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز خلیل الرحمن اعظمی کی قربت سے ہوا۔ ابتدا میں ان کی چند غزلیں کنور محمد اخلاق کے نام سے شائع ہوئیں، لیکن خلیل الرحمن اعظمی کے مشورے پر انہوں نے "شہریار" تخلص اختیار کیا، جو بعد میں ان کی مستقل شناخت بن گیا۔

شہریار تدریس کے ساتھ ساتھ ادبی صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ میں لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور انجمن کے معروف رسائل "اردو ادب" اور "ہماری زبان" کی ادارت بھی کی۔ اس کے علاوہ مغنی تبسم کے ساتھ رسالہ "شعر و حکمت" کی ادارت میں بھی شریک رہے۔

شہریار کو عوامی سطح پر غیر معمولی شہرت فلمی نغمہ نگاری کے ذریعے حاصل ہوئی۔ مشہور فلم ساز مظفر علی کی فلموں "گن" اور "امر او جان" کے لیے لکھے گئے ان کے نغمات اردو شاعری اور فلمی موسیقی کا لازوال سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ فلم "انجمن" کے گیت بھی انہی کے قلم کا شاہکار ہیں۔ ان کے نغموں میں شعری حسن، تہذیبی شائستگی اور جذباتی گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔

ان کے شعری مجموعوں کو بعد میں کلیات کی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ سنگ میل پبلی کیشنز پاکستان سے ان کا کلیات شائع ہوا جس میں ان کے چھ شعری مجموعے شامل ہیں۔ یہی کلیات ہندوستان میں "سورج کو نکلتا دیکھوں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے کلام کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، مراٹھی، بنگالی اور تیلگو سمیت متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ بیدار بخت اور میری این ائر نے ساہتیہ اکادمی کے لیے ان کے منتخب کلام کا انگریزی ترجمہ کیا جبکہ رخشندہ جلیل نے بھی ان کی شاعری کو انگریزی قالب میں منتقل کیا۔

ادبی خدمات کے اعتراف میں شہریار کو متعدد قومی اعزازات سے نوازا گیا جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور گیان پیٹھ ایوارڈ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ 13 فروری 2012ء کو اردو شاعری کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، لیکن ان کا ادبی سرمایہ آج بھی زندہ اور تابندہ ہے۔

شہریار کی شاعری کے نمایاں اوصاف

آزادی کے بعد اردو شاعری میں نئے فکری اور فنی رجحانات نے جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر جدیدیت کی تحریک سامنے آئی جس نے اردو شاعری کو نئے موضوعات، نئی علامتوں اور نئے اسالیب سے روشناس کرایا۔ شہریار اسی جدید ادبی فضا کے اہم نمائندہ شاعر ہیں۔ تاہم ان کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے جدیدیت کو قبول کرنے کے باوجود فن کو نظریے پر قربان نہیں کیا۔ شہریار کی شاعری میں جدید حسیت اور کلاسیکی روایت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ روایت سے مکمل انحراف نہیں کرتے بلکہ ماضی کی صحت مند ادبی روایات کو اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئی معنویت عطا کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری کو قدیم و جدید کا سنگم قرار دیا جاتا ہے۔

ان کی شاعری کا بنیادی موضوع انسان اور اس کی داخلی دنیا ہے۔ تنہائی، بے چارگی، عدم تحفظ، خوف، محرومی، شکست خوردگی، زندگی کی تلخیاں اور سماجی بے حسی ان کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ جدید انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں درد اور کرب کے ساتھ امید، حوصلہ اور زندگی سے وابستگی بھی موجود رہتی ہے۔

شہریار کے یہاں خواب ایک مرکزی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواب ان کے ہاں آرزو، جستجو، امید اور بہتر مستقبل کی علامت بن جاتا ہے۔ اسی طرح رات، اندھیرا، نیند، آنکھ، جگنو اور سایہ جیسی علامتیں ان کی شاعری میں بار بار سامنے آتی ہیں اور نئے معنی پیدا کرتی ہیں۔

ریت بھی ان کی شاعری کا ایک اہم استعارہ ہے۔ وہ ریت کے ذریعے زندگی کی بے ثباتی، داخلی و خارجی ویرانی، احساسِ محرومی اور عصری انسان کی شکستہ حالی کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ریت محض ایک منظر نہیں بلکہ ایک فکری اور علامتی نظام کا حصہ بن جاتی ہے۔ تقسیم ہند، فسادات، ہجرت اور تہذیبی زوال جیسے موضوعات بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔ ان واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کرب، خوف اور انسانی المیے کو انہوں نے نہایت مؤثر انداز میں اپنے اشعار کا حصہ بنایا ہے۔

فنی اعتبار سے شہریار کی شاعری بڑی پختہ، متوازن اور تہہ دار ہے۔ وہ علامت، استعارہ، پیکر تراشی اور خود کلامی جیسے جدید شعری وسائل کو بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کے یہاں ابہام یا غیر ضروری پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی زبان سادہ، رواں اور دل نشیں ہے، جس کے باعث ان کا کلام عام قارئین اور سنجیدہ ناقدین دونوں میں مقبول ہے۔

شہریار نہ صرف ایک ممتاز غزل گو تھے بلکہ جدید اردو نظم کے بھی اہم شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں عصری انسان کی نفسیاتی کشمکش، شہری زندگی کی بے روجی، خواب و حقیقت کی کشمکش، تنہائی، محرومی اور وجودی مسائل کو گہرے فکری شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جدید اردو شاعری میں شہریار کا مقام نہایت بلند ہے۔ انہوں نے اپنے منفرد طرزِ احساس، فنی پختگی، علامتی نظام اور تہذیبی شعور کے ذریعے اردو غزل اور نظم دونوں کو نئی جہتیں عطا کیں۔ ان کی شاعری آج بھی جدید اردو ادب کا ایک اہم اور معتبر حوالہ سمجھی جاتی ہے۔

ماحول میرے شہر کا ہاں پُر سکوں نہ تھا
لیکن بٹا ہوا یہ قبیلوں میں یوں نہ تھا

اس شعر میں شاعر اپنے شہر یا معاشرے کے بدلتے ہوئے سماجی نقشے پر گہرا تبصرہ کرتا ہے۔ وہ حقیقت پسندی سے اعتراف کرتا ہے کہ پہلے بھی مکمل سکون، مثالی ہم آہنگی یا مثبت حالات موجود نہیں تھے، یعنی ماضی کو جنت بنا کر پیش نہیں کیا جا رہا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اس درجے کی ٹکڑوں میں تقسیم، گروہی نفرت اور شناختی بنیادوں پر بٹ جانا پہلے نہیں تھا۔ ”قبیلوں میں بٹا ہوا“ محض قبائلی ڈھانچے کا ذکر نہیں بلکہ فرقہ واریت، سیاسی دھڑوں، نظریاتی گروہوں اور سماجی دراڑوں کا علامتی اظہار ہے۔ اس طرح شعر ایک سماجی مرثیہ بن جاتا ہے جس میں بگاڑ کی شدت پردکھ اور تشویش دونوں شامل ہیں۔

اے اہل درد تم نے سمجھنے میں دیر کی
کارِ حیات معنی کارِ جنوں نہ تھا

شاعر ”اہل درد“ یعنی حساس، باشعور اور جذبہ رکھنے والے لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم نے زندگی کی اصل حقیقت سمجھنے میں دیر کر دی۔ تم نے زندگی کے عمل، جدوجہد اور مقصد کو صرف جذبے یا جنون کے دائرے میں محدود سمجھ لیا، حالانکہ حیات کا کارنامہ صرف جوش نہیں بلکہ شعور، حکمت، ضبط اور عملی بصیرت بھی چاہتا ہے۔ اس طرح شاعر جذباتیت پر تنقید اور متوازن فکر کی وکالت کرتا ہے۔

چاہا بہت کہ دشت کو گلزار کر سکوں
میرے بدن میں خون تو تھا، اتنا خوں نہ تھا

اس شعر میں شاعر اپنے اصلاحی جذبے اور عملی کمزوری دونوں کا اعتراف بڑی دیانت سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے پوری خواہش اور نیت سے کوشش کی کہ ویران حالات، سخت ماحول یا بے ثمر سماجی زمین کو سرسبز اور خوشحال بنادوں، مگر میرے اندر اتنی طاقت، وسائل یا قربانی کی شدت موجود نہ تھی کہ یہ کام مکمل ہو پاتا۔

دنیا نے ہر محاذ پہ مجھ کو شکست دی
یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

شاعر کہتا ہے کہ زندگی کے ہر میدان، ہر مقابلے اور ہر مرحلے پر مجھے شکست ہوئی، مگر اس کے باوجود میرے خواب، نظریے اور امید کا پرچم جھکا نہیں۔ یعنی عملی شکست کے باوجود فکری اور روحانی سطح پر ہار تسلیم نہیں کی گئی۔ یہ نظریاتی وفاداری اور باطنی حوصلے کا بیان ہے۔

وعدے پہ تیرے میں نے کبھی شک نہیں کیا
پھر تیرا انتظار مجھے رات کیوں نہ تھا

شاعر کہتا ہے کہ مجھے تیرے وعدے پر مکمل یقین تھا، میں نے کبھی شک نہیں کیا، مگر اس کے باوجود میں پوری رات انتظار اور بے قراری میں کیوں مبتلا رہا؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یقین اور اضطراب ایک دوسرے کی ضد نہیں۔ محبت میں اعتماد کے ساتھ بے چینی بھی رہتی ہے، کیونکہ دل کا تعلق منطق سے زیادہ احساس سے ہوتا ہے۔ یہاں شکوہ بھی ہے مگر نرم لہجے میں۔ دوسرے مصرع میں استفہامیہ اسلوب جذباتی شدت پیدا کرتا ہے۔ ”رات“ انتظار، بے خوابی اور اضطراب کی علامت ہے۔ یقین بے قراری کا باطنی تضاد شعر کو گہرا بناتا ہے۔ کلاسیکی غزل کی روایتی فضا اور لہجہ بھی برقرار ہے۔

20.2.1 غزل (کیسا ماضی تھا کیا ہے حال اپنا)

کیسا	ماضی	تھا	کیا	ہے	حال	اپنا
دیکھنا	تھا	ہمیں	زوال	اپنا		

اس شعر میں شاعر استفہامیہ انداز اختیار کر کے ماضی اور حال کا تقابل کرتا ہے۔ ”کیسا ماضی تھا“ میں سوالیہ لہجہ حسرت اور تعجب دونوں کیفیتیں پیدا کرتا ہے، جب کہ ”کیا ہے حال اپنا“ موجودہ ابتری کی طرف اشارہ ہے۔ یوں ماضی و حال کا یہ تقابل صنعت تضاد کو جنم دیتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں ”زوال“ کا لفظ پورے فکری کرب کو سمیٹ لیتا ہے؛ گو یا شاعر اعترافِ زوال بھی کر رہا ہے اور خود احتسابی بھی۔

اور	بھی	ہو	گئے	ہیں	ہم	تہا
اک	ذرا	آیا	تھا	خیال	اپنا	

یہاں شاعر داخلی کیفیت بیان کرتا ہے کہ جیسے ہی ”خیال اپنا“ آیا، یعنی خود شناسی یا خود آگہی کی ایک لہر اٹھی، تنہائی اور بڑھ گئی۔ اس میں لطیف سا نفسیاتی نکتہ پوشیدہ ہے کہ شعور انسان کو ہجوم میں بھی تنہا کر دیتا ہے۔ ”تنہا“ اور ”خیال اپنا“ کے درمیان معنوی ربط شعر کی داخلی ساخت کو مضبوط بناتا ہے۔ پہلے مصرعے میں اضافہ ”اور بھی“ شدتِ احساس کو بڑھاتا ہے، جب کہ دوسرے مصرعے کی سادگی گہرے معنی پیدا کرتی ہے۔ یہاں خارجی ہجوم اور داخلی تنہائی کا غیر مرئی تضاد شعر کو تاثیر بخشتا ہے۔

دشت	ہو	بازگشت	سے	آباد
کوئی	دہرائے	پھر	سوال	اپنا

شاعر کہتا ہے کہ اگر سوال کی بازگشت گونجنے لگے تو ویرانی بھی آباد ہو سکتی ہے۔ یوں سوال کو فکری حیات اور شعور کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ ”دشت“ اور ”آباد“ میں واضح تضاد ہے جو معنی کو ابھارتا ہے۔ ”دشت“ اور ”بازگشت“ کی صوتی مناسبت مراعات النظر کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور آہنگ میں حسن بڑھاتی ہے۔ شعر دراصل مکالمے اور فکری بیداری کی دعوت دیتا ہے، جو اس کی معنوی وسعت کا ثبوت ہے۔

دیکھ	ہم	پھر	جلا	رہے	ہیں	چراغ
اے	ہوا!	حوصلہ	نکال	اپنا		

اس شعر میں علامتی کشمکش اپنی پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ”چراغ“ امید، عزم اور روشنی کا استعارہ ہے، جب کہ ”ہوا“ مخالف حالات یا رکاوٹوں کی علامت ہے۔ شاعر ”اے ہوا!“ کہہ کر اسلوبِ خطاب اختیار کرتا ہے، جو چیلنج اور حوصلے کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ ”پھر“ کا لفظ تسلسل اور استقامت کو ظاہر کرتا ہے، گویا چراغ بجھایا گیا تھا مگر دوبارہ روشن ہو گیا۔ روشنی اور ہوا کی یہ کشمکش ایک غیر مرئی تضاد پیدا کرتی ہے جس سے شعر میں ڈرامائیت اور تاثیر بڑھتی ہے۔ یہاں عزم، استقامت اور حوصلے کا پیغام نہایت بلیغ انداز میں سامنے آتا ہے۔

20.2.2 غزل (نہیں ہے مجھ سے تعلق کوئی تو ایسا کیوں)

نہیں	ہے	مجھ	سے	تعلق	کوئی	تو	ایسا	کیوں
کہ	تو	نے	مڑ	کے	فقط	اک	مجھی	کو
								دیکھا
								کیوں

اس شعر میں عاشق محبوب سے شکوہ آمیز سوال کرتا ہے۔ اگر واقعی میرا تم سے کوئی تعلق نہیں تو پھر تم نے پلٹ کر صرف مجھے ہی کیوں دیکھا؟ یہاں استفہامیہ انداز جذباتی شدت پیدا کرتا ہے اور سوال دراصل جواب سے زیادہ معنی خیز بن جاتا ہے۔ ”مڑ کے دیکھنا“ خود ایک علامت ہے جو

پوشیدہ تعلق، دبی ہوئی محبت یا اعتراف و البستگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلے مصرعے میں انکار تعلق ہے اور دوسرے میں اسی انکار کی نفی، یوں معنوی تضاد شعر کو گہرائی دیتا ہے۔

میں اس سفر میں کہیں بھی نہ رکنے والا تھا
یہ اک درخت مرے راستے میں آیا کیوں

یہاں ”سفر“ زندگی یا عزم کا استعارہ ہے اور ”درخت“ کسی رکاوٹ، کسی تعلق یا کسی ایسے لمحے کی علامت ہے جس نے رفتار روک دی۔ شاعر کہتا ہے کہ میں تو مسلسل چلنے والا تھا، پھر یہ درخت (یعنی رکاوٹ یا سایہ تعلق) میرے راستے میں کیوں آگیا؟ درخت کا تصور سایہ، ٹھہراؤ اور کشش کا بھی حامل ہے، اس لیے یہ محض رکاوٹ نہیں بلکہ دل لبھانے والی رکاوٹ بھی ہو سکتی ہے۔

گزشتہ شام و سحر یاد کیوں نہیں آتے
ہوائے وقت مجھے تو نے اتنا بدلا کیوں

اس شعر میں وقت کی بے ثباتی اور تغیر کا احساس نمایاں ہے۔ ”شام و سحر“ ماضی کے لمحات کی علامت ہیں اور ان کی عدم یادداشت ایک داخلی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ”ہوائے وقت“ نہایت خوبصورت استعارہ ہے جو زمانے کی گردش اور حالات کی تبدیلی کو مجسم کر دیتا ہے۔ شاعر سوال کرتا ہے کہ اے وقت کی ہوا! تو نے مجھے اتنا کیوں بدل دیا کہ مجھے اپنی ہی گزری ہوئی ساعتیں یاد نہیں رہیں۔ ”شام و سحر“ میں مراعات النظیر ہے اور ان دونوں کا تضاد (رات و دن) زمانی وسعت پیدا کرتا ہے۔

میں اجنبی تو نہ تھا شہر آرزو کے لیے
تمام عمر رہا پھر یہاں اکیلا کیوں

شاعر کہتا ہے کہ میں تو اس شہر میں اجنبی نہ تھا، یعنی میری بھی تمنائیں تھیں، میرا بھی حق تھا، پھر میں ساری عمر یہاں تنہا کیوں رہا؟ ”شہر“ اور ”اکیلا“ کا باہمی تضاد معنی کو ابھارتا ہے کیونکہ شہر ہجوم کی علامت ہے اور اکیلا پن تنہائی کی۔

مری ان آنکھوں کو کب روشنی سے نسبت تھی
ازل سے میرے تعاقب میں ہے اندھیرا کیوں

شاعر کہتا ہے کہ میری آنکھوں کا تو روشنی سے کبھی تعلق ہی نہ تھا، یعنی میں ابتدا ہی سے محرومی یا ناکامی کا شکار تھا، مگر پھر بھی اندھیرا میرا تعاقب کیوں کر رہا ہے؟ ”روشنی“ امید اور ہدایت کی علامت ہے جبکہ ”اندھیرا“ مایوسی اور محرومی کا استعارہ۔ روشنی اور اندھیرے کا تضاد کلاسیکی شعری حسن پیدا کرتا ہے۔ ”تعاقب“ کا لفظ اندھیرے کو جاندار بنا دیتا ہے، گویا وہ پیچھا کرنے والی قوت ہے، جس سے تجسیم (Personification) کی صنعت پیدا ہوتی ہے۔

غورِ تشنہ لبی بھی نہیں رہا باقی
سراب دیکھ کے آیا خیالِ دریا کیوں

شاعر کہتا ہے کہ اب تو پیاس کا غور بھی باقی نہیں رہا، پھر سراب دیکھ کر دریا کا خیال کیوں آیا؟ ”سراب“ دھوکے اور فریب کی علامت ہے جبکہ ”دریا“ حقیقت اور سیرابی کی۔ سراب اور دریا میں واضح تضاد موجود ہے جو معنی کو ابھارتا ہے۔ ”تشنہ لبی، سراب، دریا“ میں مراعات النظر بھی پائی جاتی ہے کیونکہ سب کا تعلق پانی اور پیاس سے ہے۔

20.2.3 سرگرمی: آؤ! اپنی معلومات کو جانچیں

ذیل کے جملوں میں خالی جگہیں پُر کیجیے:

1. شہریار کا اصل نام _____ تھا۔
2. شہریار _____ میں پیدا ہوئے۔
3. شہریار نے اردو میں ایم اے _____ میں کیا۔
4. شہریار جدید اردو شاعری کی _____ تحریک سے وابستہ تھے۔
5. شہریار کی مشہور فلم _____ ہے جس کے نعमत بے حد مقبول ہوئے۔

20.3 عمومی جائزہ

شہریار جدید اردو شاعری کے ایک اہم اور منفرد شاعر ہیں جنہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کی شاعری میں جدید انسان کے مسائل، تنہائی، احساسِ محرومی، خواب، خوف، عدم تحفظ اور زندگی کی پیچیدگیوں کا نہایت مؤثر اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے جدیدیت کے رجحانات کو قبول کرتے ہوئے بھی کلاسیکی شعری روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ ان کی شاعری میں علامت نگاری، تہہ داری، فکری گہرائی اور سادگی بیان نمایاں خصوصیات ہیں۔ شہریار نے اردو شاعری کو نئی معنویت عطا کی اور اپنی منفرد آواز کے ذریعے جدید اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔

20.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ شہریار کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات سے واقف ہوئے۔ آپ نے جانا کہ شہریار جدید اردو شاعری کے ایک ممتاز شاعر تھے جنہوں نے جدید حسیت اور کلاسیکی روایت کے امتزاج سے اردو شاعری کو نئی جہت عطا کی۔ آپ نے ان کے خاندانی پس منظر، تعلیمی زندگی، تدریسی خدمات اور ادبی سفر کا مطالعہ کیا۔ آپ یہ بھی جان سکے کہ جدیدیت کی تحریک نے ان کے فکری رویوں اور شعری اسلوب کو کس طرح متاثر کیا۔

اس سبق کے ذریعے آپ شہریار کی شاعری کے نمایاں موضوعات، مثلاً تنہائی، خواب، عدم تحفظ، انسانی محرومیاں، سماجی مسائل اور داخلی کرب سے آگاہ ہوئے۔ آپ نے ان کی شاعری میں علامت نگاری، تہہ داری، سادگی اظہار اور فنی پختگی کی اہمیت کو بھی سمجھا۔

مزید برآں آپ شہریار کی اہم تصانیف، فلمی نغمہ نگاری، اعزازات اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے سے واقف ہوئے۔ اس سبق نے آپ کو شہریار کے فن اور شخصیت کو بہتر انداز میں سمجھنے اور جدید اردو شاعری میں ان کی خدمات کا ادراک کرنے میں مدد فراہم کی۔

20.5 فرہنگ

لفظ	معنی
جدیدیت	ادب کا جدید فکری و فنی رجحان
علامت نگاری	علامتوں کے ذریعے اظہار خیال
تہہ داری	معنی کی گہرائی اور کئی سطحوں پر مفہوم
عصری حسیت	اپنے عہد کے مسائل اور احساسات کا شعور
انفرادیت	منفرد طرز فکر اور اظہار
عدم تحفظ	غیر محفوظ ہونے کا احساس
محرومی	کسی مطلوب شے سے محروم رہنے کی کیفیت
استعارہ	ایک شے کو دوسری شے کے معنی میں استعمال کرنا
پیکر تراشی	الفاظ کے ذریعے تصویری کیفیت پیدا کرنا
ترسیل	خیال یا جذبے کا مؤثر ابلاغ

20.6 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1. شہریار کا اصل نام کیا تھا اور وہ کہاں پیدا ہوئے؟

2. جدیدیت کی تحریک سے کیا مراد ہے؟

3. شہریار کی شاعری کے اہم موضوعات کیا ہیں؟

4. شہریار کی شاعری میں خواب اور ریت کی علامتوں کی اہمیت بیان کیجیے۔

5. جدید اردو شاعری میں شہریار کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالیے۔

20.7 مشقی سوالات

1. شہریار کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. شہریار کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔
3. شہریار کی شاعری میں جدید حسیت اور علامت نگاری پر بحث کیجیے۔
4. شہریار کی غزل گوئی اور نظم نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
5. جدید اردو شاعری میں شہریار کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

1- شہریار کی زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

شہریار کا اصل نام کنور محمد اخلاق خان تھا۔ وہ 16 جون 1936ء کو آنولہ، ضلع بریلی (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہردوئی میں حاصل کی اور بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ وہ اسی جامعہ کے شعبہ اردو میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اور صدر شعبہ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شہریار نے خلیل الرحمن اعظمی کی رہنمائی میں شاعری کا آغاز کیا۔ انہوں نے جدید اردو شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوا۔ فلم Umrao Jaan اور Gaman کے لیے لکھے گئے ان کے نغمات نے انہیں عوامی سطح پر بھی بے حد مقبول بنایا۔

ان کی اہم تصانیف میں اسم اعظم، ساتواں در، جبر کے موسم اور نیند کی کرچیں شامل ہیں۔ انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور گیان پیٹھ ایوارڈ سمیت متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ 13 فروری 2012ء کو ان کا انتقال ہوا۔

2- شہریار کی شاعری کے فکری اور فنی محاسن کا جائزہ لیجیے۔

شہریار کی شاعری جدید اردو ادب کا اہم سرمایہ ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی تنہائی، خوف، عدم تحفظ، محرومی، خواب اور عصری مسائل نمایاں موضوعات ہیں۔ انہوں نے جدید انسان کی نفسیاتی الجھنوں اور داخلی کرب کو بڑی فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ فنی اعتبار سے ان کی شاعری میں علامت نگاری، تہہ داری، سادگی زبان، حسن بیان اور معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔ خواب، رات، اندھیرا، ریت اور صحرا جیسی علامتیں ان کے شعری نظام کا اہم حصہ ہیں۔ ان کا اسلوب نہایت شستہ، مؤثر اور دل نشین ہے۔

3- شہریار کی شاعری میں جدید حسیت اور علامت نگاری پر بحث کیجیے۔

شہریار جدید حسیت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں موجودہ دور کے انسان کے مسائل، تنہائی، خوف، عدم تحفظ اور زندگی کی بے معنویت کا احساس نمایاں ہے۔ انہوں نے ان موضوعات کو براہ راست بیان کرنے کے بجائے علامتی انداز اختیار کیا۔ ان کی شاعری میں خواب امید اور آرزو کی علامت ہے جبکہ ریت زندگی کی بے ثباتی، ویرانی اور کرب کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی طرح اندھیرا، صحرا اور سایہ بھی ان کے اہم شعری استعارے ہیں۔ علامتوں کے اس مؤثر استعمال نے ان کی شاعری کو فکری گہرائی عطا کی ہے۔

4- شہریار کی غزل گوئی اور نظم نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

شہریار کو غزل اور نظم دونوں اصناف پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی روایت اور جدید حسیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں محبت، تنہائی، خواب اور زندگی کے تلخ تجربات کا اظہار بڑی خوبصورتی سے ہوا ہے۔

ان کی نظموں میں عصری زندگی، شہری تہذیب، انسانی بے بسی اور داخلی کشمکش کے موضوعات نمایاں ہیں۔ انہوں نے جدید نظم کو فکری گہرائی اور فنی پختگی عطا کی۔ ان کی نظموں میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال نہایت مؤثر اور فطری ہے۔

5۔ جدید اردو شاعری میں شہریار کے مقام و مرتبے پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

شہریار جدید اردو شاعری کے صفِ اول کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے جدیدیت کے اثرات قبول کرتے ہوئے بھی روایت سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں جدید فکر، فنی پختگی اور جمالیاتی حسن کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔

انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں نئے امکانات پیدا کیے اور جدید انسان کے مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری فکری گہرائی، علامتی اظہار اور معنوی وسعت کی حامل ہے۔ اردو ادب میں ان کا مقام نہایت بلند اور مستحکم ہے اور ان کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔

20.8 جوابات سرگرمی

1. کنور محمد اخلاق خان
2. آنولہ، ضلع بریلی
3. 1961ء
4. جدیدیت
5. امراؤ جان

20.9 امدادی کتب

1. اسم اعظم
2. ساتواں در
3. ہجر کے موسم
4. خواب کا در بند ہے
5. نیند کی کرچی
6. سورج کو نکلتا دیکھوں (کلیات شہریار)
7. شہریار: حیات و خدمات

ڈاکٹر ساجد حسین انصاری